مہاجرین کا مسئلہ

مہاجرین کا مسئلہ

مرتبہ

آغا محمد اشرف

برائے

پاکستان پبلیکیشنز پوسٹ بکس نمبر ۱۰۷ کراچی

تعداد ۲ ہزار — سنہ ۱۹۴۹ — قیمت عہ

اس کتاب کے متعلق

۲۳ ستمبر ۴۸ء کو ریڈیو پاکستان کراچی سے مہاجرین کے متعلق تقریروں کا ایک سلسلہ میں نے شروع کیا تھا۔ پہلے خیال تھا کہ یہ تقریریں ۳-۴ ہفتے بعد ختم ہو جائیں گی لیکن مسئلے کی اہمیت اور حالات کو دیکھتے ہوئے اس سلسلے کو بڑھانا پڑا۔ اور چالیس ہفتے تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ دسمبر ۴۸ء تک ہر ہفتے میں خود تقریر کرتا تھا۔ بعد میں دوسرے لوگوں کو بھی اس پروگرام میں شریک ہونے کی دعوت دی۔ اس طرح کم و بیش ۸۰-۹۰ بولنے والے اس سلسلے میں شامل ہو گئے۔ اس سلسلے کا آخری پروگرام ۲۰ جون ۴۹ء کو براڈکاسٹ ہوا تھا۔

چونکہ ان تقریروں میں مہاجرین کی آبادکاری کے مختلف پہلوؤں کو نمایاں کیا گیا ہے اور سرکاری اطلاعات بھی اس میں شامل ہیں۔ اس لئے فیصلہ یہ ہوا۔ کہ ان تمام تقریروں کو کتاب کی شکل میں شائع کر دیا جائے۔ غالباً مہاجرین کے متعلق اس قدر معلومات ایک جگہ اب تک کہیں جمع نہیں ہوئیں اس لحاظ سے شاید یہ مجموعہ پسند کیا جائے گا۔
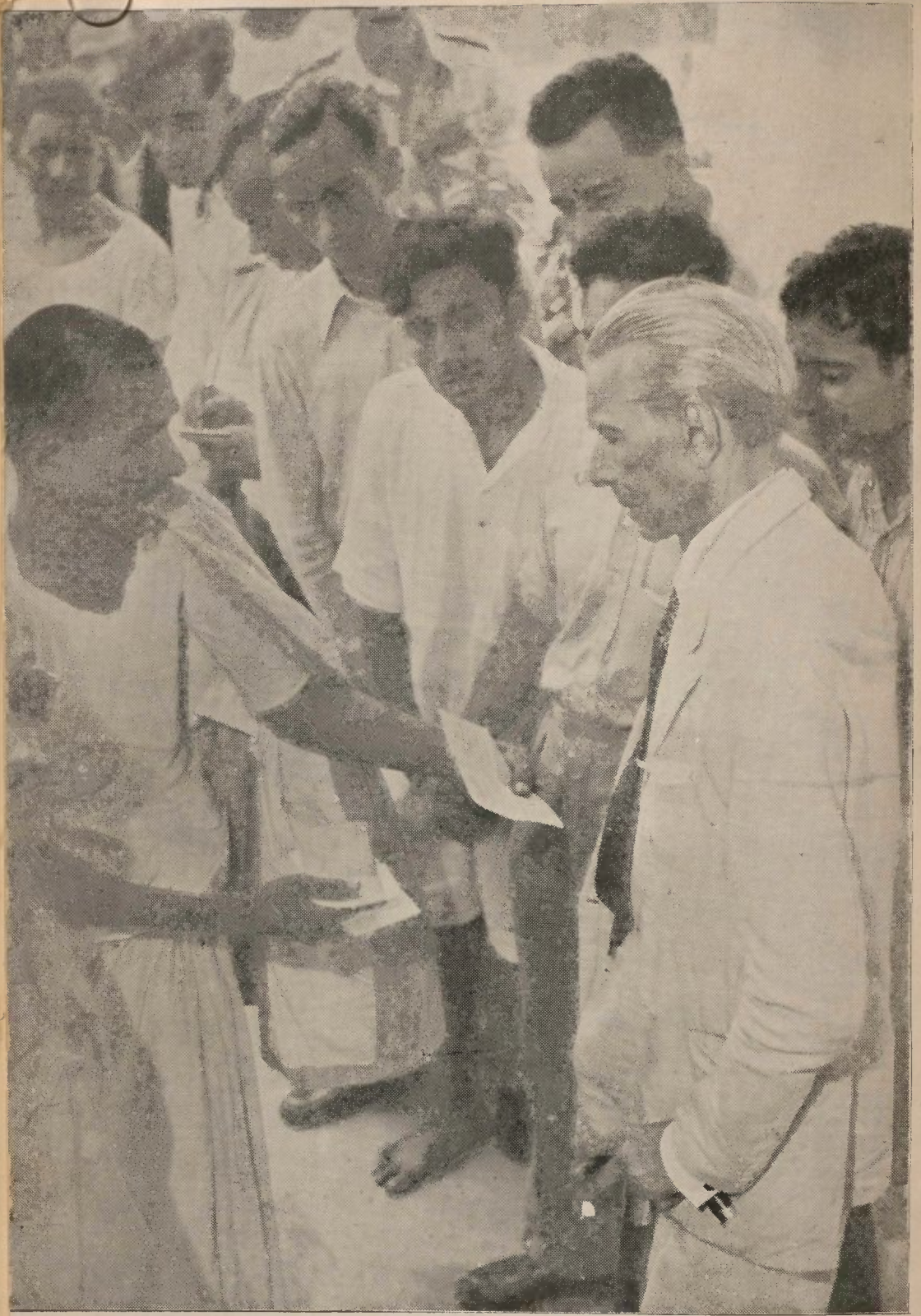
"جب تک ہم تمام مہاجرین کو آباد نہیں کر لیتے ہم پر عیش و آرام حرام ہے"

قائداعظمؒ
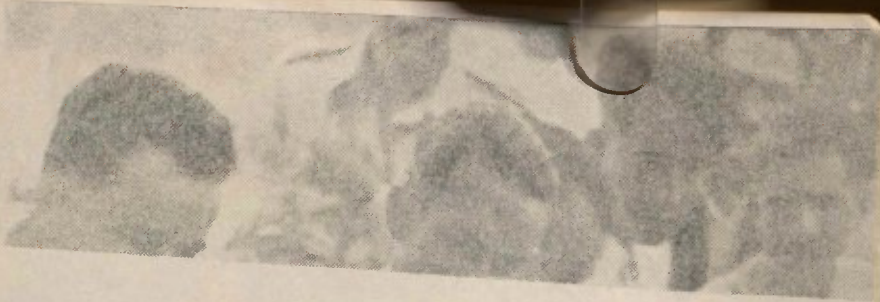
تاریخِ عالم کی سب سے بڑی ہجرت

اگست سنہ ۴۷ء کا انقلاب اِنسانی تہذیب اور تمدن کی تاریخ میں اس لئے یادگار رہے گا کہ آج تک دنیا میں بیک وقت اتنے زیادہ انسانوں نے ترکِ وطن کبھی نہیں کیا تھا۔ پاکستان بننے کے بعد ۷۰ لاکھ مسلمان عورتیں اور مرد بوڑھے جوان اور بچے مہاجر بن کر پاکستان میں داخل ہوئے۔ اور اس کے مقابلے میں تقریباً ۵۵ لاکھ غیر مسلموں نے پاکستانی علاقوں کو چھوڑ کر ہندوستان کو اپنا وطن بنایا۔ اِنسانی سیلاب قافلوں کی صورت میں جس طرح ایک علاقے سے دُوسرے علاقے کی طرف بڑھا اس کی مختصر سی تفصیل یہ ہے:۔

پاکستانی صوبہ یا ریاست	مسلم مہاجرین کی تعداد	غیر مسلم تارکانِ وطن	آبادی میں زیادتی + کمی -
صوبہ مغربی پنجاب (مارچ سنہ ۴۸ء تک)	۵۴ لاکھ ۸۷ ہزار	۳۸ لاکھ ۶۳ ہزار	+ ۱۶ لاکھ ۲۴ ہزار
صوبہ سندھ (مئی سنہ ۴۸ء تک)	۷ لاکھ ۷ ہزار	۱۰ لاکھ ۷۲ ہزار	- ۲ لاکھ ۳۵ ہزار
ریاست بہاولپور (جولائی سنہ ۴۸ء تک)	۲ لاکھ ۶۵ ہزار	۲ لاکھ ۳۸ ہزار	+ ۲۷ ہزار
ریاست خیرپور (مئی سنہ ۴۸ء تک)	-	۵۵ ہزار	- ۵۵ ہزار
صوبہ سرحد	۳۱ ہزار	۲ لاکھ ۶۹ ہزار	- ۲ لاکھ ۳۸ ہزار
بلوچستان (مارچ سنہ ۴۸ء تک)	۹ ہزار	۶۶ ہزار	- ۵۵ ہزار
میزان	۶۴ لاکھ ۹۹ ہزار	۵۵ لاکھ ۶۳ ہزار	+ ۹ لاکھ ۳۶ ہزار

مغربی پنجاب میں مہاجرین کی مردم شماری مارچ ۱۹۴۸ء میں کی گئی تھی۔ اندازہ لگایا گیا ہے۔ کہ اس کے بعد سے اب تک تقریباً ایک لاکھ اور مہاجر ہندوستان سے مغربی پنجاب میں داخل ہو چکے ہیں۔ اس لحاظ سے پاکستان میں آنے والے مہاجرین کی تعداد ۶۵ لاکھ ۹۹ ہزار کے قریب ہے۔ اس کے علاوہ مہاجرین کی مردم شماری مختلف علاقوں میں مختلف اوقات میں ہوئی تھی۔ اور یہ بھی سب کو علم ہے کہ ان کی مردم شماری کسی حالت میں بھی مکمل نہیں ہو سکی۔ اس لئے یہ اندازہ صرف ایک حد تک درست کہا جا سکتا ہے۔ ورنہ فی الحقیقت پاکستان میں آنے والے مہاجرین کی تعداد اس سے زیادہ ہے۔

یہ تصور کیا جاتا ہے۔ کہ مغربی پاکستان میں سوائے سندھ کے اب کسی اور جگہ ہندو اور سکھ نہیں رہتے۔ سندھ میں تقسیم سے پہلے ہندوؤں اور سکھوں کی آبادی ۱۳ لاکھ ۲۷ ہزار تھی۔ مگر اب یہاں صرف ۴ لاکھ کے قریب ہندو باقی رہ گئے ہیں۔

خیال کیا جاتا ہے کہ مغربی پاکستان کے مختلف حصوں میں مہاجرین کی مردم شماری کے بعد سے اب تک تقریباً ۴ لاکھ مسلمان اور مغربی پاکستان آ چکے ہیں۔ چنانچہ مہاجرین اور غیر مسلم تارکانِ وطن کے اعداد و شمار کو آخری طور سے یوں سمجھنا چاہیئے :-

پاکستان میں آنے والے مسلم مہاجر	پاکستان سے جانے والے غیر مسلم تارکانِ وطن
۷۰ لاکھ	۵۵ لاکھ ۶۲ ہزار

اس کے معنی یہ ہوئے کہ مغربی پاکستان میں غیر مسلم تارکانِ وطن کے جانے کے بعد بھی مقابلۃً تقریباً ۱۴ لاکھ مہاجر زیادہ آئے ہیں۔ ان اعداد و شمار میں جموں اور کشمیر کے مہاجرین کو شامل نہیں کیا گیا جن کی تعداد کسی حالت میں بھی ۴ لاکھ سے کم نہیں۔ چونکہ کشمیری مہاجرین انشاء اللہ بہت جلد اپنے وطن واپس چلے جائیں گے۔ اس لئے موجودہ بحث میں ہم ان کا ذکر نہیں کریں گے۔

مسلمانوں کا جانی نقصان

ہجرت کے دوران میں مسلمانوں کی کتنی جانوں کا نقصان ہوا۔ اس کا اندازہ لگانا بہت مشکل ہے۔ کیونکہ اس قیامتِ صغریٰ کے وقت ایک کو دوسرے کا ہوش نہیں تھا۔ اور بے گور و کفن لاشوں کو گننا انسان کی قدرت سے باہر تھا۔ البتہ صرف اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ۱۹۴۱ء کی مردم شماری کے مطابق مشرقی پنجاب اور مشرقی پنجاب کی ریاستوں میں ۵۹ لاکھ ۳۵ ہزار مسلمان بستے تھے۔ مہاجرین کی مردم شماری سے پتہ چلا ہے کہ ان میں سے صرف ۵۱ لاکھ ۹۲ ہزار مسلمان مغربی پاکستان زندہ بچ کر آئے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ۴ لاکھ ۷۰ ہزار مسلمان اب تک مشرقی پنجاب میں زندہ موجود ہیں۔ اگر اسے مان بھی لیا جائے تب بھی تقریباً ۴ لاکھ ۲۷ ہزار مسلمان لاپتہ ہیں۔ دوسرے لفظوں میں مشرقی پنجاب کی مسلم

آبادی میں سے تقریباً ۴ لاکھ ۲۷ ہزار مسلمان قتل و غارت، سفر کی صعوبتوں اور بھوک پیاس کا شکار ہو گئے۔ اور یہ اعداد و شمار مشرقی پنجاب اور مشرقی پنجاب کی ریاستوں سے متعلق ہیں۔ [1]

حکومتِ پاکستان کی ذمّے داریاں

پاکستان بنتے ہی مہاجرین کے قافلے ہندوستان سے پاکستان داخل ہونے لگے۔ اور اس بے سروسامانی کی حالت میں کہ اکثر و بیشتر مہاجرین کے جسم پر مشکل سے تن ڈھانپنے کے کپڑے تھے۔ تمام عمر کی کمائی اور سرمایہ ہندوستان چھوڑ آئے تھے۔ اور اب ان کے سامنے صرف ایک منزل تھی اور وہ پاکستان۔ حکومتِ پاکستان کو بجو دمیں آئے مشکل سے چند روز ہوئے تھے۔ اگر ایسی ایکا ایکی مصیبت کسی مستقل حکومت کے سر پر آن پڑے تو اس کے حواس بگڑ جائیں۔ کجا کہ ایک نئی حکومت کے سامنے یہ زبردست سوال پیدا ہو گیا۔ مگر حکومتِ پاکستان نے ایک منٹ بھی تامل نہیں کیا اور فوراً اپنی تمام توجہات کو مہاجرین کی بحالی پر مرکوز کر دیا۔ شروع میں مہاجرین کا سب سے بڑا بوجھ مغربی پنجاب کے سر پر پڑا۔ حکومت نے جا بجا مہاجرین کو پناہ دینے کے لئے کیمپ کھول دیئے ایک وقت تو مغربی پنجاب کے کیمپوں میں تقریباً دس لاکھ تک مہاجرین پناہ لے رہے تھے۔ مہاجرین کے کیمپوں پر حکومت نے کس فراخ دلی سے خرچ کیا۔ اس کا حساب یوں لگا لیجیے۔ کہ ایک لاکھ مہاجروں کو ایک سال تک کیمپ میں رکھنے اور خوراک دینے پر حکومت کو ایک کروڑ روپے خرچ کرنے پڑتے تھے۔ مہاجرین کو پناہ دینے کے معنی یہ بھی تھے کہ مغربی پنجاب جہاں ہمیشہ فالتو غلّہ اور اناج جمع رہتا تھا اب وہاں غلّے کی کمی محسوس ہونے لگی

ستمبر ۱۹۴۸ء میں مغربی پنجاب کے کیمپوں میں سوا چار لاکھ سے زیادہ مہاجر سر چھپائے بیٹھے تھے۔ باقی مہاجرین کو مغربی پنجاب کے شہروں اور دیہات میں بانٹا جا چکا تھا۔ کیمپوں کی آبادی کو ختم کرنا ایک ناگوار مگر بہت ضروری فرض تھا۔ چنانچہ حکومتِ پاکستان نے فیصلہ کیا کہ مغربی پنجاب کے کیمپوں سے مہاجرین

---

[1] ان اعداد و شمار کے ساتھ اتحادی فوجوں کے ان سپاہیوں کی تعداد پر غور کیا جائے جو دوسری جنگِ عظیم میں کام آئے تو ہماری معلومات میں حیرت انگیز اضافہ ہوتا ہے۔ مسٹر چرچل نے اپنی نئی کتاب "دیر فائنسٹ آور" میں برطانوی فوجوں کا نقصان حسب ذیل درج کیا ہے:-

برطانوی باشندے جو مرے یا لاپتہ ہو گئے اور جنہیں مردہ تصور کر لیا گیا	۳,۰۳,۲۴۰
ہندوستان اور دوسری نوآبادیات کے باشندے جو کام آ گئے	۴,۱۲,۲۴۰

جنرل آئزن ہوور نے اپنی یادداشت "جنگ یورپ" میں امریکی فوجوں کے جانی نقصان کو ۳,۲۲,۱۸۸ بتایا ہے دوسری جنگِ عظیم میں اتحادی فوجوں کا یہ جانی نقصان چھ سال کی طویل مدت میں ہوا۔ جب کہ مشرقی پنجاب اور مشرقی پنجاب کی ریاستوں میں جو مسلمان شہید ہوئے۔ ان کی تعداد ۴,۲۰,۰۰۰ ہے اور مسلمانوں پر یہ سب کچھ صرف چار ماہ کی قلیل مدت میں بیتی +

کو دُوسرے علاقوں میں بھیجا جائے کہ جہاں ابھی تک ان کی آبادکاری کے لیے جگہ موجود تھی۔ حکومتِ سندھ نے مرکزی حکومت کی درخواست پر ۲ لاکھ کے قریب مہاجرین کو آباد کرنے کی حامی بھری۔ اور چند ہفتے کے اندر لاہور، منٹگمری ملتان اور دوسرے شہروں کے کیمپ خالی ہو کر تمام مہاجرین سندھ بھیج دیئے گئے۔ اس وقت تک کیمپوں پر روزانہ گورنمنٹ ۸۷ ہزار ۵۷۰ روپے روزانہ خرچ کر رہی تھی۔ اب کیمپ خالی ہوتے ہی یہ خرچ یک قلم موقوف ہو گیا۔ اور اس کی جگہ مہاجرین کو آباد ہونے سے پہلے تقاوی کی شکل میں حکومت سے مالی امداد ملنے لگی۔

۱۹۴۷ء کو مہاجرین کی آمد کا سال کہا جا سکتا ہے۔ کیونکہ اُس سال لاکھوں کی تعداد میں مہاجرین کے قافلے پاکستان پناہ کے لیے آئے۔ مگر ۱۹۴۸ء تک انہیں آباد کرنے کا حکومت پروگرام بنا چکی تھی۔ اور اس پر فخر کیا جا سکتا ہے کہ پاکستان کی نوزائیدہ حکومت نے بے شمار ذمے داریوں اور مشکلات کے باوجود ۷۰ لاکھ مہاجرین کو آباد کرنے سے پہلو تہی نہیں کی۔ بلکہ حتی الامکان اپنے تمام وسائل اور ذرائع اس کام پر لگا دیئے۔ پارلیمنٹ میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے آنریبل خواجہ شہاب الدین نے فرمایا تھا کہ ۲۸ فروری ۱۹۴۹ء تک حکومت پاکستان مہاجرین کی آبادکاری پر ۷ کروڑ ۸۳ لاکھ ۶۴ ہزار ۹۹۵ روپیہ خرچ کر چکی ہے۔

بین المملکتی کانفرنسیں

ہمارے مہاجرین نے جس بے سروسامانی کی حالت میں ہجرت کی تھی اس کی طرف ابھی اشارہ کیا جا چکا ہے۔ کاشتکاروں کی زمینیں، شہری مہاجرین کے مکانات، جائدادیں اور دکانیں وغیرہ سبھی چیزیں ہندوستان میں رہ گئی تھیں۔ اسی طرح غیر مسلم تارکانِ وطن کی متروکہ غیر منقولہ جائدادیں پاکستان میں تھیں۔

پاکستان اور ہندوستان کے درمیان مشاورتی کانفرنسیں تو ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کے فوراً بعد ہی شروع ہو گئی تھیں۔ اکتوبر ۱۹۴۸ء سے ان کانفرنسوں میں متروکہ جائدادوں کے متعلق بھی تجاویز پر غور شروع ہوا چنانچہ اکتوبر ۱۹۴۸ء سے لے کر اب تک پاکستان اور ہندوستان کی حکومتوں کے وزیر، سکرٹری اور افسر کراچی، لاہور، دہلی اور کلکتے میں متعدد بار مشورے کر چکے ہیں۔ ان کانفرنسوں میں مندرجہ ذیل بنیادی اصولوں پر بحث ہوئی ہے:۔

(۱) دسمبر ۱۹۴۸ء اور جنوری ۱۹۴۹ء کی کانفرنس کے فیصلوں کے مطابق زرعی زمینوں کی جمع بندیوں کو ایک ملک سے دُوسرے ملک میں بھیجا گیا۔ اور دونوں حکومتوں نے ان کاغذات پر غور کرنے کے لیے افسر مقرر کیے۔

(۲) جنوری ۱۹۴۹ء کی کراچی کانفرنس میں متروکہ جائدادوں کے انتظام اور نظم و نسق کے متعلق فیصلہ ہوا۔ اور یہ بھی طے پا گیا کہ متروکہ جائدادیں پاکستان اور ہندوستان کے کس کس علاقے میں ایک دُوسرے سے تبدیل ہو سکیں گی۔

(۳) شہری غیر منقولہ جائدادوں کی فروخت کے متعلق فیصلہ ہوا۔

(۴) منقولہ جائداد کے متعلق ضروری باتیں طے پائیں کہ انہیں کس طرح ایک ملک سے دوسرے ملک منتقل کیا جا سکتا ہے۔

(۵) طے پایا کہ دونو حکومتیں اپنا اپنا ایک خاص افسر دوسرے ملک میں بھیجیں تاکہ یہ غیر منقولہ جائدادوں کی فروخت میں مدد کر سکے۔

(۶) قرار پایا کہ ان فیصلوں پر عمل درآمد کرانے کے لئے دونو ملکوں کی طرف سے ایک کمیشن مقرر کیا جائے۔ جو وقتاً فوقتاً باہمی فیصلوں کے بارے میں غور کرتا رہے۔

(۷) قیدیوں کا تبادلہ

مندرجہ ذیل باتوں کے متعلق کوئی فیصلہ نہیں ہو سکتا۔

(۱) اوقاف (۲) زراعتی زمین (۳) معافیاں اور جاگیریں

اس سلسلے میں آخری کانفرنس ۲۵ اور ۲۶ جون سنہ ۴۹ء کو کراچی میں ہوئی تھی چونکہ کانفرنس کے انعقاد سے چند روز پہلے صوبہ بمبئی اور صوبجات دہلی و اجمیر مارواڑ میں حکومت بمبئی اور حکومت ہندوستان نے نئے آرڈی ننس متروکہ جائدادوں کے متعلق نافذ کر دیئے تھے اس لئے حکومت پاکستان نے کانفرنس میں حکومت ہندوستان کے اس اقدام کو پرانے معاہدوں کی خلاف ورزی تصور کیا اور حکومت ہندوستان کے نمائندوں سے کہا کہ جب تک یہ نئے آرڈی ننس منسوخ نہیں ہو جاتے حکومت پاکستان متروکہ جائدادوں کے متعلق مزید گفت و شنید جاری رکھنے کے لئے تیار نہیں ہے۔

متروکہ جائدادیں اور کسٹوڈین

ملک کی تقسیم اور ہجرت کے فوراً بعد ہی دونو حکومتوں کے سامنے متروکہ جائدادوں کی نگرانی اور انہیں آباد کاری کے لئے استعمال کرنے کا سوال درپیش تھا چنانچہ ۵ اکتوبر سنہ ۴۷ء کو پاکستان اور ہندوستان کے وزیروں کے ایک جلسے میں اس سوال پر مشورہ کیا گیا۔ اور سرکاری اعلان کے ذریعے دونو حکومتوں نے تسلیم کر لیا کہ متروکہ جائدادوں کے متعلق آئندہ غور کیا جائے گا۔

قیدیوں کا تبادلہ

پاکستان اور ہندوستان کی حکومتوں کے درمیان قیدیوں کے تبادلے کے متعلق کافی عرصے تک گفت و شنید ہوتی رہی آخر کار سنہ ۴۸ء کے آخر میں یہ تبادلہ مکمل ہو گیا۔ اس تبادلے میں ہندوستان سے ۸۹۰ مسلمان قیدی پاکستان آئے۔ اور پاکستان نے ایک ہزار ۱۵ غیر مسلم قیدیوں کو ہندوستان کے حوالے کیا۔ دسمبر سنہ ۴۸ء کی دہلی کانفرنس نے اُن پاگلوں کے متعلق بھی فیصلہ کیا تھا۔ جو اس وقت پاکستان اور ہندوستان کے پاگل خانوں میں موجود ہیں۔ لیکن ان کا تبادلہ ابھی تک نہیں ہو سکا۔

منقولہ اور غیر منقولہ جائدادوں کے علاوہ بنک کی معرفت جمع شدہ رقوم سیف میں رکھے ہوئے زیورات اور نقدی وغیرہ کے متعلق بھی دونوں حکومتوں نے بار بار مشورے اور فیصلے کئے مغربی پنجاب کی حکومت نے متروکہ غیر منقولہ جائدادوں کے سلسلے میں سب سے پہلا قدم اٹھایا۔ اور گورنر نے اپنے اختیارات خصوصی استعمال کر کے یکم دسمبر ۱۹۴۷ء کو مغربی پنجاب میں ایک آرڈیننس جاری کیا جس کی رو سے کسٹوڈین اور ڈپٹی کسٹوڈین وغیرہ متروکہ جائدادوں کی نگرانی کے لئے مقرر کئے گئے اور غیر مسلموں کی متروکہ جائدادیں کسٹوڈین کے قبضے میں آگئیں۔ مشرقی پنجاب میں اسی قسم کا قانون بعد میں نافذ ہوا۔

بلوچستان اور صوبہ سرحد کی حکومتوں نے بھی اپنے اپنے علاقے میں متروکہ جائدادوں کے لئے کچھ قانون بنائے۔ مگر اس بارے میں سب سے اہم اور مکمل آرڈیننس مرکزی حکومت نے ۱۸ اکتوبر ۱۹۴۸ء کو جاری کیا جس کی رو سے غیر مسلموں کی تمام متروکہ جائدادیں مغربی پاکستان میں مرکز کے ماتحت آگئیں۔ چنانچہ سندھ اور کراچی میں بھی حکومت پاکستان نے کسٹوڈین مقرر کر دیا۔

متروکہ جائدادوں کے متعلق دونوں حکومتوں میں جو گفت وشنید جاری ہے اس کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے شہری جائدادوں کے تبادلے اور خرید و فروخت کا بنیادی اصول طے پا چکا ہے۔ مگر زرعی زمینوں کے متعلق دونوں حکومتیں ابھی کسی فیصلے پر نہیں پہنچ سکیں۔ کارخانوں اور ملوں کی خرید و فروخت کی اجازت بھی مل چکی ہے۔ اگرچہ دونوں حکومتوں نے تسلیم کر لیا ہے کہ اگر غیر منقولہ جائدادوں کو مہاجرین کی آبادکاری کے لیے استعمال کیا جا چکا ہے تو شہری مکانوں اور دکانوں پر تین سال تک اور کارخانوں اور ملوں پر پانچ سال تک ان مہاجرین کا قبضہ قائم رہے گا کہ جنہیں جائز طور پر ان جائدادوں اور کارخانوں کو الاٹ کیا گیا ہے۔

حکومت پاکستان کا جوابی آرڈیننس

چونکہ حکومت ہند نے نیا آرڈیننس جاری کر کے کراچی کانفرنس کے معاہدوں کی صریحاً خلاف ورزی کی تھی۔ اس لئے ۲۶ جولائی ۱۹۴۹ء کو حکومت پاکستان نے ایک اور آرڈیننس کے ذریعے مغربی پاکستان اور ملحقہ ریاستوں میں متروکہ جائدادوں کی فروخت اور تبادلہ بند کر دیا۔

آبادکاری کا کام

اوپر کہا جا چکا ہے کہ مہاجرین کی آبادکاری کا سب سے زیادہ بوجھ مغربی پنجاب کے صوبے پر پڑا تھا اور یہی وجہ تھی کہ اکتوبر ۱۹۴۷ء میں پاکستان کے وزیر اعظم نے اپنا مستقل ہیڈ کوارٹر لاہور کو بنا لیا تھا۔ ۲۰ فروری ۱۹۴۸ء کو آنریبل مسٹر لیاقت علی خاں نے مسلم لیگ کونسل کے سالانہ اجلاس منعقدہ کراچی میں تقریر کرتے ہوئے کہا:-

قائد اعظم نے فرمایا تھا کہ پاکستان کی حفاظت لاہور سے کی جا سکتی ہے میں وہاں گیا میں بورڈر پر جایا کرتا

تھا۔ مہاجرین بھوکے ننگے کمزور بڈھے سڑکوں پر پیدل چل کر یہ پوچھنے آتے تھے کہ کیا پاکستان آگیا۔ اور سرزمین پاکستان پر پہنچ کر اطمینان کا سانس لیتے اور خدا کا شکر ادا کرتے۔"

وزیر اعظم کے ساتھ لاہور میں پاکستان کی وزارتِ مہاجرین کے دفاتر بھی پہنچ گئے اور جون ۱۹۴۹ء تک یہ وزارت اور اس کا عملہ لاہور ہی میں رہا۔ کیمپوں کی حالت کو سدھارنے کے ساتھ وزارتِ مہاجرین نے مشترکہ مہاجرین کونسل کے ذریعے آباد کاری کا کام بھی شروع کر دیا۔ اور غیر مسلموں کے چھوڑے ہوئے کارخانے، دکانیں اور مکانات مہاجرین میں تقسیم ہونے لگے۔ تقسیم ہند کے بعد ایک وقت یہ خطرہ ضرور تھا کہ کہیں پاکستان کی اقتصادی زندگی بالکل شل نہ ہو جائے کیونکہ بنکوں، کاروبار اور نقل و حرکت کے تمام وسیلوں پر مغربی پاکستان میں غیر مسلموں کا قبضہ تھا۔ اور اُن کے چلے جانے کے بعد فوراً ہی ان تمام کاموں کو چلانا آسان کام نہیں تھا۔ مگر پاکستان کی خوش قسمتی تھی کہ ملک کی اقتصادی حالت پر کوئی کاری ضرب لگنے نہیں پائی۔ اور رفتہ رفتہ تمام کاروبار اور بنج بیوپار حسب دستور چلنے لگے۔ چنانچہ ۴ اپریل ۱۹۴۹ء کو پاکستان سندھ کی مشترکہ مہاجرین کونسل کے جلسے کی صدارت کرتے ہوئے وزیر اعظم نے فرمایا۔

"اگر ہم آج مغربی پاکستان میں تجارت صنعت و حرفت اور کاروبار پر مسلمانوں کا قبضہ دیکھ رہے ہیں تو یہ ہمارے مہاجرین کی بدولت ہے۔"

مغربی پنجاب نے مہاجرین کی آباد کاری میں کتنا نمایاں حصہ لیا۔ اس کا اندازہ یوں لگالیجئے کہ فروری ۱۹۴۹ء تک اس صوبے میں ۵۲ لاکھ ۶۳ ہزار چار سو مہاجرین آباد کئے جا چکے ہیں۔ ان میں سے ۳۹ لاکھ ۳ ہزار مہاجرین دیہات میں بسائے گئے ہیں۔ اور ۱۳ لاکھ ۶۰ ہزار ایک سو مہاجرین کو شہری زندگی میں جگہ ملی ہے۔

مہاجرین اس بے ترتیبی اور بے قاعدگی سے پاکستان میں داخل ہوئے تھے کہ انہیں کسی خاص نظام کے ماتحت آباد کرنا اس وقت مشکل تھا۔ لاہور کے کیمپوں سے بہت سے مہاجرین لائل پور اور منٹگمری کے زرخیز علاقوں میں چلے گئے۔ اس لئے شروع سے انہیں ضلع وار یا خاندان کے لحاظ سے ایک جگہ بسانا مشکل ہو گیا۔ شہری زندگی میں اس قسم کی آباد کاری سے چنداں فرق نہیں پڑتا کیونکہ شہری زندگی کا ضابطہ ایسی پابندیوں کی پروا نہیں کرتا۔ البتہ دیہات میں اس کی وجہ سے خاصی مشکل پیدا ہونے کا امکان ہے۔ یہ شکایت سننے میں آتی ہے کہ ایک ہی خاندان کے افراد کو مختلف ضلعوں میں جگہ ملی ہے۔ لیکن حکومتِ مغربی پنجاب نے حال میں نیم مستقل آباد کاری کا جو پروگرام مرتب کیا ہے اس کے ماتحت یہ رخنہ بھی دُور ہو جائے گا۔ چنانچہ مہاجرین نے سرکاری احکام کے مطابق اپنی زمینوں کی تفصیل حکومت کے سامنے پیش کر دی ہے۔ اور حکومت کے کارندے نیم مستقل الاٹمنٹ کی پڑتال شروع کر چکے ہیں۔

غالباً مغربی پنجاب کے متعلق اس اندازے کو مبالغہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہاں ۷۵ فیصدی سے لے کر ۸۰ فیصدی تک مہاجرین کی آباد کاری مکمل ہو چکی ہے۔ اور مہاجرین نے اپنے نئے صوبے کی اقتصادی زندگی میں کم و بیش ایسی ہی جگہ بنا لی ہے جو تقسیم سے پہلے انہیں ہندوستان میں حاصل تھی۔

غیر مسلموں کی متروکہ جائدادوں کی الاٹمنٹ ایک اور مشکل مسئلہ تھا کہ جسے سلجھانے میں حکومت کو بہت کافی وقت اور محنت صرف کرنی پڑی۔ خاص طور سے کارخانے اور فیکٹریاں کہ ان کی الاٹمنٹ نے بحالی کی جگہ اکثر کو بدحالی کے درجے تک پہنچا دیا۔ اس بارے میں

مرکزی حکومت نے اب اپنا یہ بالکل واضح کر دیا ہے کہ ملک کی صنعتیں اور کارخانے اس کا سرمایہ ہیں! اور انہیں حکومت صرف مہاجرین کی بحالی کے لئے نہیں بلکہ ملک کی صنعتوں کی بحالی کے لیے الاٹ کرے گی۔ نیز اس کے منافع میں بھی حکومت کا وافر حصہ ہوگا ہوں کہ آبادکاری پر حکومت کروڑوں روپیہ خرچ کر چکی ہے۔ اور اس رقم کو کارخانوں کے منافع سے پورا کیا جائے گا۔ چنانچہ مرکزی حکومت نے تمام کارخانوں کے الاٹمنٹ پر نظر ثانی کرنے کے لئے ایک بورڈ مقرر کیا ہے جس کے فیصلے آخری سمجھے جائیں گے۔ اور ان کے خلاف کوئی اپیل نہیں ہو سکے گی۔ اس قسم کے بورڈ سب صوبوں میں بن چکے ہیں۔

مرکزی اختیارات کے آرڈیننس

ایک سال تک آبادکاری کا کام صوبائی حکومتیں خود کرتی رہیں۔ اگرچہ مرکز کی طرف سے انہیں ہدایات برابر ملتی رہی تھیں لیکن مہاجرین کو آباد کرنا ہر صوبے کی اپنی ذمہ داری تھی مرکزی حکومت بار بار اس بات کو محسوس کر رہی تھی کہ جب تک آبادکاری کا تمام پروگرام مرکز کے ماتحت نہیں آتا اس وقت تک مختلف صوبوں کے پروگراموں اور منصوبوں میں یکجہتی یا باہم آہنگی پیدا نہیں ہو سکتی اس کے ساتھ یہ بھی خطرہ تھا کہ اگر کسی صوبے کی حکومت نے اگر مہاجرین کی آبادکاری کے کام میں ذرا بھی بے اعتنائی برتی یا سہل انگاری سے کام لیا تو تمام پاکستان کی اقتصادی زندگی خطرے میں پڑ جائے گی۔

مرکزی حکومت کے سامنے یہ تجویز پیش ہوئی کہ انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کی دفعہ ۱۰۲ میں اس قسم کی ترمیم کی جائے کہ اگر گورنر جنرل پاکستان مہاجرین کے آنے کی وجہ سے ملک کی اقتصادی زندگی کو خطرے میں محسوس کریں تو خاص صورتِ حال کا اعلان کریں ایک ترمیم یہ پیش ہوئی کہ مرکزی حکومت صوبائی حکومتوں کو مہاجرین کی آبادکاری کے متعلق ضروری ہدایات بھی دے سکتی ہے۔ پاکستان کی پارلیمنٹ نے ۵ مئی ۱۹۴۸ء کو انڈیا ایکٹ کی دفعہ ۱۰۲ اور ۱۲۶ الف میں ترمیمات منظور کر لیں اور ترمیم شدہ دفعہ ۱۰۲ کے مطابق گورنر جنرل نے ۳۰ اگست ۱۹۴۸ء کو تمام پاکستان میں خاص صورتِ حال کا اعلان کر دیا غالباً قائداعظم کی خدمت میں آخری دستخطوں کے لئے یہی سرکاری دستاویز پیش ہوئی تھی۔ اسی آرڈیننس کے ماتحت مرکزی حکومت نے صوبہ سندھ کی حکومت کو ہدایت کی کہ مغربی پنجاب سے لاکر مہاجرین کو سندھ میں بسایا جائے کیونکہ مغربی پنجاب میں ۲۵ لاکھ سے زیادہ مہاجرین کو بسانے کی گنجائش نہیں ہے۔

چنانچہ اگست ۱۹۴۸ء میں ۶ لاکھ سے زائد مہاجرین کیمپوں میں پڑے تھے اور خطرہ تھا کہ اگر یہ مہاجر مغربی پنجاب کے کیمپوں میں اور زیادہ عرصے تک رہے تو اس سے صوبے کی اقتصادی زندگی کا توازن بگڑ جائے گا۔ چنانچہ وزیرِ اعظم پاکستان کی صدارت میں مغربی پنجاب اور سندھ کی مشترکہ مہاجرین کونسل کا ایک ضروری اجلاس کراچی میں منعقد ہوا جس میں دونوں صوبوں کے گورنر بھی شریک تھے اور فیصلہ کیا گیا کہ پنجاب سے زائد مہاجرین کو سندھ لاکر بسایا جائے۔

۱۰ اکتوبر ۱۹۴۸ء کو گورنر جنرل پاکستان نے ایک اور آرڈیننس کے ذریعے سرکاری افسران کو مہاجرین کی آبادکاری کے لئے مزید اختیارات دیئے۔ جن کی رُو سے مہاجرین کو آباد کرنے کے لئے مکانات اور زمینوں کو گورنمنٹ اختیاراتِ خصوصی استعمال کر کے اپنے قبضے میں لے سکتی ہے۔

کراچی اور سندھ میں مہاجرین

تقسیم سے پہلے کراچی کی آبادی مشکل سے ۳ لاکھ کے قریب تھی مگر اب کراچی میں ۱۲ لاکھ کے لگ بھگ لوگ بستے ہیں پاکستان کا پایۂ تخت ہونے کی وجہ سے مرکزی حکومت کے دفاتر غیر ملکی سفارت خانے بڑے بڑے تجارتی ادارے اور کوٹھیاں اور کاروبار کے مرکز بھی کراچی میں قائم ہو رہے ہیں۔ اور جب تک کراچی میں نئے مکانات بننے کا منصوبہ مکمل نہیں ہوتا یہاں رہائش کی دقتوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس وقت تمام کراچی شہر کو ایک بہت بڑا مہاجرین کا کیمپ سمجھنا چاہیئے۔ جہاں لاکھوں بندگانِ خدا معقول جائے رہائش نہ ملنے کی وجہ سے عارضی جھونپڑیوں اور پناہ خانوں میں سر چھپائے بیٹھے ہیں۔ حکومت نے اعلان کیا ہے کہ وہ مہاجرین کا کراچی میں رہنا ضروری نہیں انہیں چاہیئے کہ یہاں سے سندھ کے دوسرے شہروں میں چلے جائیں۔ کیوں کہ شکارپور اور چند دوسرے مقامات پر مکانات خالی پڑے ہیں۔ اور اگر وہاں جا کر مہاجرین چھوٹی چھوٹی صنعتیں قائم کریں گے تو ان کی بحالی میں آسانی ہو سکے گی۔

مئی ۱۹۴۸ء میں کراچی اور سندھ میں آنے والے مہاجرین کی مردم شماری کی گئی تھی۔ اس وقت یہ دلچسپ حقیقت معلوم ہوئی تھی کہ تمام سندھ میں ۷ لاکھ ۶ ہزار ۳۰۷ مہاجر آئے ہیں۔ اور کراچی میں پناہ لینے والوں کی تعداد ۴ لاکھ ۲ ہزار ۴۸۱ ہے۔ اگرچہ پاکستان میں آنے والوں پر پرمٹ کی پابندی لگا دی گئی ہے لیکن اس کے باوجود اندازہ لگایا گیا ہے کہ ہر مہینے ۵ ہزار مہاجرین کی اوسط یہاں آبادی کا اضافہ کر رہی ہے سندھ میں مہاجرین کی ایک بڑی تعداد تو ان دو لاکھ مہاجرین پر مشتمل ہے جو مغربی پنجاب کے کیمپوں سے سندھ میں لائے گئے تھے۔ ان کے علاوہ تقسیم کے فوراً بعد ہی کچھ مہاجر یہاں آ گئے تھے۔ اور باقی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو ستمبر ۱۹۴۸ء کے بعد سندھ میں آئے ہیں سندھ سے تقریباً ۱۱ لاکھ ۲۷ ہزار غیر مسلم ہندوستان گئے تھے۔ ان کے مقابلے میں یہاں آنے والے مہاجرین کی تعداد نسبتاً ابھی کم ہے۔

ستمبر ۱۹۴۸ء میں اسپیشل ٹرینوں کے ذریعے جن مہاجرین کو سندھ میں لایا گیا تھا ان کی آبادکاری کی ذمے داری مرکز کے ایما پر حکومت سندھ نے لی تھی۔ اور ہر ضلع کے مقامی حکام کو تاکید کی گئی تھی کہ مہاجرین کو آتے ہی تقاوی دی جائیں۔ اور رہنے کو مکان ملیں۔ چنانچہ ۱۹۴۸ء اور ۱۹۴۹ء کی سردیوں میں ہر مہاجر کو سر چھپانے کے لئے گھر مل گیا۔ اور مرکزی حکومت کے ڈائرکٹر جنرل (نقل و حرکت) کے عملے کی نگرانی میں مہاجرین کو زمینوں پر آباد کرنے کا کام شروع کر دیا گیا۔

مغربی پنجاب کے کیمپوں سے آنے والے مہاجرین کے لئے سندھ میں سب سے زیادہ مشکل نئی زبان اور نئے رسم و رواج کی تھی۔ اب تک یہ گندم کی کاشت کرنے کے عادی تھے۔ سندھ میں اس کے برعکس انہیں چاول کی کاشت کرنی پڑی دوسرے کیمپوں کی تکلیف اٹھاتے اٹھاتے اب ان میں قوتِ برداشت بالکل ختم ہو چکی تھی لیکن ان سب مشکلات کے باوجود مہاجرین کی کافی تعداد زمینوں پر آباد ہونے میں کامیاب ہو گئی۔ سندھ کی زرخیز زمینوں پر جہاں جہاں ان کے قدم جمے وہاں ان کی مستقل آبادکاری میں کسی کو شبہ نہیں لیکن اس کے ساتھ یہ بھی شکایت سننے میں آئی کہ مقامی وڈیروں، سرکاری اہلکاروں اور چند خود غرض لوگوں نے مہاجر دشمنی کی اور اس سے بہت سے مہاجر بددل ہو کر چلے گئے۔[1] مرکزی حکومت مہاجرین کی آبادکاری کی کوشش میں برابر مصروف ہے اور صوبہ سندھ کی حکومت کی مدد سے اس مشکل مسئلے کو طے کیا جا رہا ہے۔[1]

---

[1] وزیرِ مہاجرین آنریبل خواجہ شہاب الدین نے سندھ مسلم لیگ کانفرنس منعقدہ لاڑکانہ میں ۱۹ اپریل ۱۹۴۹ء کو تقریر کرتے ہوئے کہا تھا:- "مجھے یہ سن کر رنج ہوتا ہے کہ بعض مقامات پر کچھ سرکاری افسروں اور مقامی باشندوں نے جان بوجھ کر مہاجرین کی آبادکاری

صوبہ سرحد میں آباد کاری

مغربی پنجاب اور سندھ میں مہاجرین کی زیادہ تر تعداد زمینوں پر آباد ہوئی ہے۔ صوبہ سرحد میں چونکہ غیر مسلم کاشتکاری کے قابل نسبتاً کم زمین چھوڑ کر گئے تھے۔ اس لئے اس صوبے میں مہاجرین کی اکثریت بڑے بڑے شہروں میں آباد کی گئی ہے۔ صوبہ سرحد میں مہاجر دستکاروں، صناعوں اور ہنرمندوں کے لئے خوب میدان ہے اور کاروبار کرنے والے مہاجرین کی بھی گنجائش ہے۔ ابھی تک یہاں صرف ۵۰ ہزار کے قریب آباد ہوئے ہیں۔ اور وہ بھی پشاور، ہزارہ اور ڈیرہ اسمٰعیل خاں کے ضلعوں میں۔ باقی علاقوں میں مہاجرین کی تعداد بہت کم ہے۔

بقیہ صفحہ گزشتہ میں رکاوٹیں ڈالی ہیں۔ اور مدد کرنے کے بجائے مہاجرین کی ہمتیں پست کی ہیں..... اکثر ضلعوں اور تعلقوں میں مقامی افسروں نے زمینیں الاٹ کرنے میں مہاجرین کے معاملے میں غفلت، اور لاپرواہی برتی ہے۔ اور ان کے اس رویّے سے مہاجرین میں سخت بے چینی پیدا ہو گئی ہے۔ مہاجرین اپنے پاؤں پر خود کھڑا ہونا چاہتے ہیں اور یہ اسی طرح ممکن ہے کہ مہاجرین کو ان کا حق دیا جائے۔"

نائب وزیر مہاجرین ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے ۱۴ جون ۱۹۴۸ء کو ایک بیان میں کہا:۔

"بہت سے ہندو افسروں کے ہندوستان چلے جانے کے بعد ایکا ایکی سندھ کی حکومت میں تجربے کار افسروں کی کمی ہو گئی۔ اور یہ مشکل ابھی تک حل نہیں ہو سکی۔ چنانچہ ایسے موقع پر جب کہ زیادہ سے زیادہ ہوشیاری کی ضرورت تھی۔ سندھ کی حکومت کے بندوبست میں تجربے کار افسر نہ ہونے کی وجہ سے کمزوریاں پیدا ہو گئیں۔

"مہاجرین عام طور سے ایسے علاقوں سے آئے ہیں کہ جہاں گیہوں کی کاشت ہوتی تھی۔ اور انہیں چاول کی کاشت کے طریقے نہیں آتے۔ اُردو زبان بولتے ہیں ان کی عادتیں اور رسم و رواج الگ ہیں۔ سندھ کے نہری علاقوں میں ملیریا کا اثر ہے۔ اور یہ لوگ مشرقی پنجاب کی خشک آب و ہوا والے علاقوں سے آئے ہیں:"

ڈاکٹر قریشی صاحب نے اسی بیان میں آگے کہا:۔

"اخبارات میں چھپا ہے کہ ان مشکلات کی وجہ سے ۳۰-۴۰ ہزار مہاجرین سندھ سے چلے گئے۔ اس بارے میں صحیح تعداد معلوم کرنا بہت مشکل ہے لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مہاجر واپس ضرور گئے ہیں۔ اب ہم نے ایسا بندوبست کیا ہے کہ بہت سی ایسی مشکلات کہ جن کی وجہ سے مہاجر سندھ چھوڑنے پر مجبور ہوئے انہیں دفع کر دیا جائے گا۔"

آنریبل مسٹر یوسف ہارون وزیر اعظم سندھ نے ۱۶ جون ۱۹۴۸ء کو پریس کانفرنس میں کہا:۔

"مرکزی اور صوبائی حکومت کے افسروں کی مشترکہ کمیٹی اس لئے بنائی گئی ہے کہ غلط اور ناجائز الاٹمنٹ پر نظرِ ثانی کرے۔ کیوں کہ سندھ میں آنے والے مہاجرین کو سب سے بڑی شکایت اسی بات کی ہے۔"

سندھ کے وزیر اعظم نے مہاجرین کو مشورہ دیا کہ:۔

"آپ لوگوں کو مقامی سندھیوں سے دوستانہ تعلقات قائم کرنے چاہئیں۔ ان سے مل کر نئے دوست پیدا کیجئے جب کبھی آپ کو مدد کی ضرورت ہو بغیر کسی جھجک کے سندھیوں سے مدد مانگیئے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ مدد آپ کو فراخ دلی سے ملے گی۔"

شروع میں صوبائی حکومت نے مہاجرین کی دیکھ بھال کے لئے ڈپٹی کمشنروں اور مقامی حاکموں کو ہدایات دے دی تھیں چنانچہ مستحق مہاجرین کو سرکاری امداد کے طور پر ایک سو روپیہ فی کس دیا گیا۔ اس تحت میں مہاجرین کو تقریباً ۲۰ ہزار روپیہ تقسیم ہوا۔ بعد میں مرکزی حکومت نے چار لاکھ روپے کی رقم مستحق مہاجرین کی امداد کے لئے اور صوبائی حکومت کے سپرد کر دی۔ اس رقم سے مہاجر خاندانوں کو پانسو روپیہ فی خاندان کے حساب سے بانٹا جائے گا۔

مہاجر عورتوں کی امداد کے لئے گورنر کی بیوی لیڈی ڈنڈاس کی نگرانی میں پشاور میں ۲ مرکز کھولے گئے ہیں۔ جہاں عورتیں چرخہ کاتتی ہیں۔ نوار اور ازار بند بننے کا بھی بندوبست ہے۔ اور اس طرح انہیں روزی کمانے کا موقعہ مل جاتا ہے۔ ایک کپڑا بننے کا کارخانہ بھی حکومت نے کھولا ہے جہاں ایک سو کھڈیوں پر ایک ہزار گز کپڑا روزانہ اترتا ہے۔ اس کارخانے میں کام کرنے والے مزدور اور کاریگر تمام تر مہاجر ہیں۔

گزشتہ سال سردی کے موسم میں قائد اعظم ریلیف فنڈ نے صوبہ سرحد کے مہاجرین کے لئے ۵ ہزار کمبل بھیجے تھے۔ اور رضائیوں اور لحافوں کے لئے ایک لاکھ روپیہ منظور کیا تھا۔ ابھی چند ہفتے ہوئے کہ اس فنڈ سے عورتوں کے امدادی مرکزوں کے لئے دس ہزار روپیہ اور منظور ہوا ہے۔

پاکستان صوبہ سرحد کی مہاجرین کونسل نے فیصلہ کیا تھا کہ بارہ ہزار مہاجر صوبہ سرحد میں لا کر اور آباد کئے جائیں۔ تاکہ مغربی پنجاب کے شہروں میں مہاجرین کی کثرت کم ہو سکے۔ اس کے علاوہ کونسل نے مہاجرین کے لئے مکانات تقاوی اور بیل وغیرہ خریدنے کے واسطے بھی رقمیں منظور کی تھیں۔

بلوچستان اور بہاول پور

بلوچستان سے تقریباً ۶ ہزار غیر مسلم ہندوستان گئے ہیں۔ اور ان کی جگہ دس بارہ ہزار مہاجرین بلوچستان میں آباد ہوئے ہیں۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ بلوچستان میں غیر مسلموں نے ۳ ہزار ۴۰۰ ایکڑ زمین چھوڑی تھی۔ زیادہ غیر مسلم کوئٹے اور پشین کے علاقوں میں مکانات اور دکانیں چھوڑ کر گئے تھے چنانچہ ۹ ہزار مہاجرین کو کوئٹے میں بسایا گیا ہے اور تقریباً ۲ ہزار اور مہاجر بلوچستان کے دوسرے علاقوں میں آباد ہوئے ہیں۔

اگست ۱۹۴۷ء کے فوراً بعد سے مہاجرین کے قافلے بہاول پور میں داخل ہونے شروع ہوئے۔ یہ قافلے عموماً فیروز پور، بیکانیر اور ضلع حصار سے آتے تھے اندازہ لگایا گیا ہے کہ تقریباً ۱۲ لاکھ مہاجرین ان قافلوں کی شکل میں ریاست بہاول پور میں داخل ہوئے اور مغربی پنجاب کے اضلاع کی طرف نکل گئے۔ ریاست بہاول پور کی سرحد میں داخل ہوتے ہی ان قافلوں کی خوب خاطر مدارات کی جاتی تھی۔ اور جہاں تک ممکن ہوتا تھا انصار اور حکومت کی طرف سے انہیں آرام پہنچایا جاتا تھا۔

اندازاً ۲ لاکھ ۹۹ ہزار مہاجرین کو ریاست میں آباد کیا جا چکا ہے اور ابھی ۴۲ ہزار مہاجروں کی آباد کاری کا کام باقی ہے۔ آباد ہونے والے مہاجرین زیادہ تر زرعی زمینوں، دکانوں، کارخانوں اور ملوں کے ذریعے اپنی روزی کماتے ہیں۔ ریاست نے زمینوں کی الاٹمنٹ کی پڑتال کا کام پھر شروع کیا ہے کیونکہ بہت سی زمینوں پر لوگوں نے ناجائز قبضہ کر رکھا ہے۔

ابھی بہاول پور میں اس کے علاوہ اور بھی مہاجرین کو آباد کیا جا سکتا ہے۔ مرکزی حکومت غور کر رہی ہے۔ کہ مغربی پنجاب سے مہاجرین کو بہاول پور لا کر آباد کیا جائے۔ تاکہ وہاں جو لوگ ابھی تک آباد نہیں ہو سکے انہیں کاشت کے لئے زمینیں مل جائیں۔ اگر یہ اسکیم مکمل ہو گئی تو ۵۰ ہزار مہاجرین بہاول پور میں اور آباد ہو جائیں گے۔

اغواشدہ عورتوں اور بچوں کی بازیابی

تقسیم کے وقت جو انسانیت سوز مظالم عورتوں اور بچوں پر ہوئے تھے اس کے خیال سے ہی رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں دونو حکومتوں نے ۴۷ء کے آخر میں اغواشدہ عورتوں اور بچوں کی بازیابی کے لئے کام کرنے کی حامی بھری تھی اور یہ نیک کام پاکستان اور ہندوستان میں سرکاری اور غیر سرکاری ذریعوں سے برابر ہو رہا ہے۔ اگرچہ اس مہم کو سر کرنے میں کام کرنے والوں کو بار بار مشکلات اور دقتوں کا سامنا کرنا پڑا ہے لیکن دونو حکومتوں نے مستقل مزاجی سے انہیں حل کرنے کے ذرائع اختیار کئے ہیں۔

ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے پاکستان کی پارلیمنٹ میں وزیرِ مہاجرین نے کہا تھا کہ اغواشدہ افراد کی صحیح تعداد بتانا ناممکن ہے لیکن جہاں تک معلوم ہوا ہے ان کی تعداد پچاس ہزار سے کم نہیں۔ ۶ دسمبر ۴۷ء سے لے کر دسمبر ۴۸ء تک ۱۰ ہزار ۱۸۱ مسلمان عورتیں اور بچے مغربی پنجاب پہنچ چکے ہیں۔ ایک اور سوال کے جواب میں وزیرِ مہاجرین نے بتایا کہ مختلف لوگوں نے ساڑھے تین لاکھ اشخاص کے بارے میں وقتاً فوقتاً حکومتِ پاکستان سے دریافت کیا! اور ان میں سے ایک لاکھ ۶۵ ہزار کے متعلق معلومات حاصل کی گئیں۔

مغربی پنجاب اور پاکستان کے دوسرے علاقوں سے تقریباً ۲ ہزار غیر مسلم عورتیں اور بچے ہندوستان واپس بھیجے جا چکے ہیں۔ مگر یہ کام ابھی ختم نہیں ہوا اور دونو ملکوں میں بازیابی کی مہم جاری ہے۔ اس سلسلے میں پاکستانی خواتین نے جو خدمات انجام دی ہیں ان کا ذکر خاص طور سے کرنا ضروری ہے۔ پولیس اور سرکاری افسروں کے ساتھ گاؤں گاؤں اور شہر شہر پھر کر پاکستان اور مشرقی پنجاب میں ہماری خواتین نے اغواشدہ عورتوں کو برآمد کرایا اور سچ تو یہ ہے کہ اگر یہ اس کام میں حکومت کا ہاتھ نہ بٹاتیں۔ تو بازیابی کا کام ایک انچ آگے نہیں بڑھ سکتا تھا چنانچہ جنوری ۴۹ء میں حکومتِ پاکستان کی طرف سے آنریبل خواجہ شہاب الدین نے اور حکومتِ ہند کی طرف سے آنریبل مسٹر گوپال سوامی آئنگر نے ایک مشترکہ اپیل میں کہا تھا:۔

"ہم انسانیت کے نام پر دونو ملکوں کے باشندوں سے اپیل کرتے ہیں کہ اغواشدہ عورتوں کو نکالنے میں حکومت کے افسروں اور سوشل کام کرنے والوں کی مدد کریں۔ یہ ہندوستان اور پاکستان کے نام پر بٹہ ہے جسے ہمیں بہت جلد مٹا دینا چاہیئے۔"

حال ہی میں حکومتِ پاکستان نے اغواشدہ عورتوں کو برآمد کرنے کے لئے ایک آرڈی نینس بھی جاری کیا ہے جس کی رُو سے پولیس کو کافی اختیار دیئے گئے ہیں۔ اسی قسم کا ایک آرڈی نینس حکومتِ ہند نے بھی پاس کیا ہے۔

آخر میں اتنا کہنا ضروری ہے کہ یہ چند سطریں اس اہم مسئلے کا صرف سرسری جائزہ ہیں ورنہ ہر عنوان کے ماتحت بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔ حکومتِ پاکستان مہاجرین کے مسئلے کو کس قدر اہمیت دیتی ہے۔ اس کا اندازہ قائدِ اعظم، وزیرِ اعظم اور وزیرِ مہاجرین کے ارشادات اور اعلانات سے کیا جا سکتا ہے مختلف ذمے داریوں اور کم مائیگی کے باوجود حکومتِ پاکستان نے کبھی اس مسئلے کو حل کرنے سے پہلو تہی نہیں کی بلکہ وزیرِ مہاجرین آنریبل خواجہ شہاب الدین نے تو یہاں تک فرمایا ہے:۔

"پاکستان کی حفاظت کے بعد مہاجرین کی آبادکاری سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔"

فہرست مضامین

مہاجرین کا مسئلہ

مغربی پاکستان میں ہر شخص کا تعلق مہاجرین کے مسئلہ سے ہے۔ کیونکہ ہر شخص یا تو خود مہاجر ہے یا اس کے ہاں مہاجرین نے آکر پناہ لی ہے۔ امیر غریب ہر طبقے کے لوگ مہاجرین کے مسئلہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور یہ سوال صرف کسی ایک شہر یا ضلع تک محدود نہیں ہے۔ بلکہ مغربی پاکستان کی ہر بستی اور ہر شہر میں مہاجرین موجود ہیں۔ اِس لئے اس سوال پر کسی مقامی حیثیت سے بحث نہیں کی جاسکتی۔ ہمارے وزیرِ اعظم مسٹر لیاقت علی خاں نے پاکستان سندھ مہاجرین کونسل کے جلسے کی صدارت کرتے ہوئے درست فرمایا تھا کہ اب مہاجرین کا سوال صرف مغربی پنجاب کا سوال نہیں رہا۔ بلکہ یہ مسئلہ تمام پاکستان کے لئے ایک ضروری مسئلہ بن گیا ہے۔

مغربی پنجاب میں گزشتہ سال مہاجرین کے قافلے جس حالت میں آتے تھے وُہ واقعات ہم آسانی سے بھُول نہیں سکتے۔ مگر ان واقعات کی تہ میں کچھ ایسی ضروری باتیں ہیں کہ جنہیں شاید ہم واقعات پر غور کرتے ہوئے نظر انداز کر جاتے ہیں۔ ہمیں ہر وقت یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ مغربی پنجاب میں چند مہینے کے اندر پچاس لاکھ سے زائد مہاجرین داخل ہوئے۔ اور یہ اتنی بڑی تعداد ہے کہ اس کی مثال تاریخ میں کہیں نہیں ملتی۔ پچھلی لڑائی میں پولینڈ۔ فرانس۔ ہالینڈ اور بلجیم میں نازیوں کے ظلم وستم سے بھاگ کر صرف چند ہزار پناہ گزینوں نے انگلستان میں پناہ لی تھی۔ مگر اتنی سی تعداد آنے پر بھی انگلستان میں ایک ہلچل پڑ گئی تھی حالانکہ انگلستان کی حکومت کے سامنے وُہ مشکلات نہیں تھیں کہ جن کا پاکستان کی حکومت سامنا کر رہی تھی۔ ابھی پاکستان کو بنے مشکل سے چند ہفتے بھی نہیں ہوتے تھے کہ مہاجرین کے قافلے اس کی سرحد پر پہنچنے لگے۔ اور وہ بھی ایسی حالت میں کہ اگر ان میں سے کسی کے تن پر کپڑے تھے تو پاؤں میں جوتی نہیں تھی۔ اپنی تمام عمر کی کمائی پیچھے چھوڑ آئے تھے۔ وہ عورتیں جنہوں نے کبھی گھر سے باہر قدم نہیں رکھا تھا پیدل قافلوں کے ساتھ چل کر آ رہی تھیں۔ بارش اور سردی سے بچنے کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ ہر مہاجر گویا موت کے منہ سے نکل کر آیا تھا۔ اور بہت سے خاندان

ایسے تھے کہ جن کے مردوں کو عورتوں کی خبر نہیں تھی اور اگر عورتیں بچ کر آئی تھیں تو انہیں اپنے وارثوں کے متعلق کوئی اطلاع نہیں تھی کہ آیا یہ زندہ ہیں یا مارے گئے۔ پچاس لاکھ مہاجرین کو پناہ دینا کوئی ہنسی کھیل نہیں۔ اب جب کہ یہ مشکل وقت ہم پر سے گذر چکا ہے۔ ہم مڑ کر اس خطرناک راستے کو دیکھ سکتے ہیں، جسے پاکستان نے پچھلے سال طے کیا تھا۔ اور اب ہمیں پتہ چلتا ہے کہ یہ راستہ کس قدر دشوار اور خطرناک تھا۔ یہ صرف خداوند کریم کا فضل و کرم اور اُس کی تائید تھی کہ ہم اس مرحلہ سے زندہ وسلامت بچ نکلے۔ ورنہ ہمارے بدخواہ اور دشمن تو اپنی جگہ یہ سمجھ چکے تھے کہ پاکستان اس زبردست بوجھ کے نیچے دب کر ختم ہو جائے گا۔ اس مصیبت کی گھڑی میں مہاجرین نے جس صبر و استقلال کا ثبوت دیا ہے اس کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ صرف ایک جذبہ تھا کہ جس نے انہیں زندہ رکھا اور وُہ جذبہ یہ تھا کہ اب ہم پاکستان پہنچ گئے ہیں۔ اور پاکستان ہمیشہ سلامت رہے گا۔ اسے کوئی طاقت فنا نہیں کر سکتی۔

اسی جذبہ کے ماتحت مہاجرین نے مشکلوں اور تکلیفوں کو ہنس بول کر برداشت کیا۔ اور اسی جذبے نے سال بھر تک انہیں کیمپوں کی تکلیف دہ زندگی برداشت کرنے کی تقویت دی پچھلے سال کے واقعات اتنے ہولناک ہیں کہ شائد آپ ان کا دوبارہ سننا پسند نہ کریں۔ مگر مہاجرین کے مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے ہم انہیں کسی صورت میں بھلا بھی نہیں سکتے۔ پاکستان پہنچنے کے بعد مہاجرین کو پہلے پناہ دی گئی۔ اور اس کے ساتھ ہی ان کے کھانے پینے کا بندوبست ضروری تھا۔ یہ تو یقینی ہے کہ گھر سے ایک دفعہ باہر نکلنے کے بعد گھر جیسا آرام میسر نہیں ہو سکتا۔ اور وُہ بھی ایسی حالت میں جب کہ ایک دو کا نہیں بلکہ ۷۰ لاکھ مہاجرین کا سوال ہو مگر حکومتِ پاکستان کی تعریف کرنی پڑے گی کہ اگرچہ یہ نئی حکومت تھی۔ اس کے سامنے موت اور زندگی کا سوال درپیش تھا۔ اس کے خزانے سونے اور چاندی سے بھرے ہوئے نہیں تھے۔ پاکستان کے دشمن اس پر ایک کاری اور آخری ضرب لگانا چاہتے تھے۔ پاکستان کی حفاظت کا سوال سب باتوں پر مقدم تھا۔ ہماری فوجیں دُنیا کے مختلف حصّوں میں بکھری ہوئی تھیں۔ ہماری خوراک کے ذخیرے مشکل سے صرف اُن لوگوں کے لئے کافی ہو سکتے تھے جو پاکستان میں پہلے سے آباد تھے۔ مگر حکومتِ پاکستان نے ان تمام باتوں کو الگ چھوڑا۔ اور اپنے تمام وسائل مہاجرین کو پناہ دینے کے کام پر لگا دیئے ستمبر ۱۹۴۷ء میں حکومتِ پاکستان نے وزارتِ مہاجرین قائم کی۔ جس کے سپرد یہ فرض تھا کہ مہاجرین کو پناہ دینے کے علاوہ فوراً آبادکاری کا کام بھی شروع کر دیا جائے۔ مگر بہت جلد معلوم ہو گیا کہ موجودہ حالات کو دیکھتے ہوئے کراچی میں بیٹھ کر مہاجرین کا سوال طے نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ وزارتِ مہاجرین کا دفتر اکتوبر کے مہینے میں کراچی سے لاہور آ گیا۔ لاہور میں مغربی پنجاب کی حکومت پہلے سے کیمپوں کا بندوبست کر رہی تھی۔ اب کیمپوں کے علاوہ دوسرے ضروری

مسئلوں پر غور کرنے کے لئے مرکزی حکومت نے سارا بندوبست اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ مہاجرین کے آتے ہی حکومت کے سامنے صرف کیمپوں میں انہیں ٹھہرانے اور خوراک بہم پہنچانے کا ہی سوال نہیں تھا۔ بلکہ اور بھی بہت سی ایسی ضروری باتیں تھیں کہ جن کا مہاجرین کی ذات سے گہرا تعلق تھا۔ مثلاً لاکھوں مسلمان اس وقت تک مشرقی پنجاب اور مشرقی پنجاب کی ریاستوں میں گھرے ہوئے تھے۔ اور اُن کا اُن خطرناک علاقوں سے جلد نکالنا بے حد ضروری تھا۔ ایسے مسلمانوں کو خطرے سے نکالنے کے لئے ہوائی جہاز۔ ریل گاڑیاں موٹریں اور دوسری قسم کی سواریاں مہیا کرنے کی ضرورت تھی۔ چنانچہ پاکستان گورنمنٹ نے ۲۱۱ ٹرینیں اپنی نگرانی میں ہندوستان سے ۱۱ لاکھ مہاجرین کو پاکستان لانے کے لئے چلائیں۔ ۲ لاکھ سے زیادہ مہاجرین فوجی لاریوں میں مشرقی پنجاب سے آئے۔ اور ۲۳ لاکھ کے قریب مہاجرین پیدل قافلے بنا کر پاکستان کی سرحد میں داخل ہوئے۔ اس کے علاوہ ہمارے بہت سے مسلمان قیدی ہندوستان کی جیلوں میں بند تھے۔ انہیں پاکستان لانا تھا۔ ہزاروں مسلمان عورتیں اپنے وارثوں سے بچھڑ گئی تھیں۔ ان میں سے بہت سی عورتوں کو اغوا کر لیا گیا تھا۔ انہیں ان کے وارثوں تک پہنچانے کا کام تھا۔ بہت سے مسلمانوں کا زبردستی مذہب تبدیل کرا لیا گیا تھا۔ انہیں واپس لانا تھا مسلمانوں کا جو روپیہ مشرقی پنجاب کے بنکوں میں رہ گیا تھا اُسے نکلوانا تھا۔ پراویڈنٹ فنڈ۔ بیمے کا روپیہ۔ بنکوں کی تحویل میں زیورات۔ سیونگ بنک اور ڈاک خانے کے کیش سرٹیفکیٹ۔ خانقاہوں اور مسجدوں کی وقف شدہ جائدادیں مسلمانوں کے ہتھیار اور مسلمان ٹھیکے داروں کا وہ روپیہ جو ابھی تک ادا نہیں ہوا تھا۔ غرض وزارتِ مہاجرین کے ذمے ہزاروں اس قسم کے کام تھے کہ جن کا تعلق ایک عام شہری کی زندگی سے ہوتا ہے۔ مسلمان اپنی جائدادیں ہندوستان میں چھوڑ آئے تھے۔ ان جائدادوں کی قیمت اور معاوضے کا تصفیہ بھی وزارتِ مہاجرین کے سپرد تھا۔ ایک سال کے عرصے میں وزارتِ مہاجرین نے کیا کیا کام کئے۔ ان کی پوری فہرست تیار کی جائے تو ایک اچھا خاصہ دفتر بن جائے۔ میں آج صرف انہی مسئلوں کی طرف اشارہ کروں گا کہ جن کے سلجھانے کا کام اس وزارت نے اپنے سر لیا تھا۔ تاکہ آپ کو معلوم ہو جائے کہ اب تک حکومت مہاجرین کی امداد کے سلسلے میں کیا کر چکی ہے اور آئندہ اس کا کیا ارادہ ہے۔

آپ کو یاد ہوگا کہ وزارتِ مہاجرین کے لاہور پہنچنے کے چند روز بعد ہی پاکستان مغربی پنجاب مہاجرین کونسل بنائی گئی تھی۔ اس کونسل کے صدر پاکستان کے وزیرِ اعظم مسٹر لیاقت علی خاں ہیں۔ اور پاکستان کے وزیرِ مہاجرین، مغربی پنجاب کے وزیرِ اعظم اور وزیرِ مہاجرین اس کے ممبر ہیں۔ ابتدائی زمانے میں مہاجرین کے متعلق کام کی اس قدر شدّت تھی کہ اس کونسل کا جلسہ ہفتے میں کئی بار کیا جاتا تھا۔ اور حکومتِ پاکستان نے اس کام کو جس قدر اہمیت دی تھی اس کا اندازہ اس طرح کیا جاسکتا ہے کہ وزیرِ اعظم پاکستان کراچی سے مستقل

طور پر کئی مہینے تک آکر لاہور میں رہے تھے تاکہ مشرقی پنجاب سے مہاجرین کو پاکستان لانے کا کام اپنی نگرانی میں کرا سکیں۔

اس کونسل نے سب سے پہلے لاہور میں مہاجرین کے لئے کیمپ بنوائے۔ کیونکہ کیمپوں کے بغیر لاہور میں لاکھوں مہاجرین کیسے رہ سکتے تھے۔ مگر بہت جلد لاہور کے کیمپ مہاجرین سے بھر گئے۔ اور اب ضرورت محسوس ہوئی کہ دوسرے ضلعوں اور شہروں میں بھی اسی قسم کے کیمپ کھولے جائیں۔ چنانچہ تھوڑے ہی عرصے میں مغربی پنجاب کے ہر ضلع میں مہاجرین کے لئے کیمپ کھل گئے۔ میں کہہ چکا ہوں کہ ان کیمپوں کی زندگی بے حد تکلیف دہ اور دشوار تھی۔ مگر حکومت سے جہاں تک ممکن ہو سکتا تھا ان کے لئے آسائشوں کا انتظام کرتی رہی۔ چنانچہ انہیں اناج کی اتنی ہی مقدار ملتی رہی جتنی کہ عام شہریوں کو راشن میں دی جاتی ہے۔ اور لاہور کے والٹن کیمپ میں ہر وقت دس ہزار مہاجرین کا راشن جمع رہتا تھا۔ اور مہاجرین کے گائے بیلوں کے لئے بھی کافی مقدار میں بھوسہ اور دانہ موجود تھا تاکہ ان کے ساتھ جو جانور آئے ہیں ان کی نگہداشت ہو سکے۔ مہاجرین کی ایک کثیر تعداد ایسے لوگوں کی تھی جو یا تو مشرقی پنجاب میں زخمی ہوئے تھے یا راستے کی صعوبتوں اور سختیوں کی وجہ سے نڈھال ہو چکے تھے۔ ایسے مریضوں اور مجروحوں کے لئے ہسپتال کھولے گئے۔ اس سلسلے میں ریڈ کراس خاص طور سے شکریے کی مستحق ہے کہ اس کی مدد سے بہت سے مہاجرین کی جان بچ گئی۔ اس کے علاوہ سمندر پار کے ملکوں سے کچھ ڈاکٹر بھی پاکستان آئے۔ سمندر پار کے ملکوں نے بہت سی دوائیں مہاجرین کے لئے بھیجیں۔ اور سردی سے بچنے کے لئے کافی مقدار میں گرم کپڑے اور کمبل وغیرہ بھی غیر ملکوں سے پاکستان کے ہمدردوں نے ہمارے مہاجرین کے لئے بھیجے۔ ان سب دوستوں کی ہمدردی کا پاکستان اور پاکستان کے مہاجر شکریہ ادا کرتے ہیں۔

مغربی پنجاب کی زندگی میں ایک انقلاب اور بھی آیا اور وہ یہ کہ بہت سے غیر مسلم باشندے پاکستان بنتے ہی ہندوستان چلے گئے۔ ان کے چلے جانے کے بعد پاکستان کے بہت سے کارخانے اور تجارت کی کوٹھیاں بند ہو گئیں۔ اور اس سے مغربی پنجاب کی تجارتی زندگی شل ہو جانے کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ ہمارے دشمن تو یہی چاہتے تھے کہ پاکستان میں ریلیں چلنی بند ہو جائیں۔ بنک اور تجارت کی کوٹھیاں اپنا کاروبار بند کر دیں۔ بندیوں کے کاروبار ختم ہو جائیں اور ہمارا معاشی نظام اس طرح بگڑے کہ پھر پاکستان کو سر اٹھانے کا موقعہ نہ ملے۔ مگر حکومت کی دوراندیشی سے دشمنوں کے یہ سب منصوبے خاک میں مل گئے۔ اور جہاں تک ہو سکا ہمارے کاروبار اور تجارت میں کوئی خاص رخنہ نہیں پڑا۔

وزارت مہاجرین کے سامنے ایک اور سوال اُن جائدادوں زمینوں اور کارخانوں کا تھا کہ جنہیں غیر مسلم پاکستان میں چھوڑ کر ہندوستان چلے گئے تھے۔ اس موقعہ پر ہمیں ایک بات کا خاص طور سے خیال رکھنا چاہیئے کہ مغربی پنجاب

سے جتنے غیر مسلم ہندوستان گئے تھے اُن سے تقریباً ۱ء ۱ لاکھ زیادہ مہاجرین کو بسانے کے سوال پر ایک سال سے حکومت اور اس کے ارکان غور کر رہے ہیں۔ اور ابھی تک اس سوال کا پورا حل نہیں سوچا جا سکا۔ غیر مسلم بہت سی زمینیں چھوڑ کر ہندوستان گئے تھے۔ مگر یہ سب زمینیں اس قدر کافی نہیں کہ انہیں سب مہاجرین کو بانٹا جا سکے۔ زمینیں تقسیم کرتے وقت بعض لوگ یہ بالکل بھول جاتے ہیں کہ پاکستان کی نظر میں صرف وہی لوگ مہاجر نہیں ہیں جو مشرقی پنجاب سے پاکستان آئے ہیں۔ بلکہ مہاجرین کی فہرست میں مشرقی پنجاب کی ریاستوں کے مسلمان دہلی۔ الور۔ بھرت پور اور یوپی کے چند اضلاع کے مسلمان بھی شامل ہیں۔ کیونکہ ان مسلمانوں پر بھی پاکستان بننے کے بعد وہی مصیبتیں آئی تھیں کہ جن کا مقابلہ مشرقی پنجاب کے باشندوں کو کرنا پڑا۔ اس لئے حکومتِ پاکستان غیر مسلموں کی چھوڑی ہوئی زمینیں تقسیم کرتے وقت مشرقی پنجاب کے مہاجرین اور دوسرے مہاجرین میں ہرگز کسی قسم کی تفریق نہیں کر سکتی۔ اور ہمیں اس بحث کے وقت ہمیشہ یاد رکھنا چاہئیے کہ پاکستان میں ان سب علاقوں کے مہاجرین کے ساتھ ایک جیسا سلوک کیا جائے گا۔ پچھلے سال کیمپوں سے مختلف علاقوں میں مہاجرین کے آباد کرنے کا کام شروع کر دیا گیا تھا۔ اور کئی لاکھ مہاجرین کو زمینوں پر آباد کرنے میں حکومت ایک حد تک کامیاب بھی ہو گئی تھی۔ مگر اس کے علاوہ بہت سے مہاجرین کو شہروں میں کاروبار کرنے کے لئے گھر دیئے گئے۔ مگر اس تقسیم کے متعلق بہت سے لوگوں کو شکایت ہے۔ اور ان کی شکایت بھی سننے کے قابل ہے۔ مہاجرین کو شکایت ہے کہ جو مکانات اور جائدادیں غیر مسلم پاکستان چھوڑ کر گئے تھے۔ ان پر انصار نے قبضہ کر لیا۔ حالانکہ پاکستان بننے سے انصار کا کوئی خاص نقصان نہیں ہوا۔ مقامی باشندوں نے اپنے اثر و رسوخ کو استعمال کیا۔ اور موقعہ پا کر ان جائدادوں پر قابض ہو گئے۔ اگر یہ شکایت درست ہے تو اس کا انسداد بے حد ضروری ہے۔ کیونکہ یہ واقعی مہاجرین کی حق تلفی ہے۔ وزیر مہاجرین خواجہ شہاب الدین نے لاہور میں اعلان کیا تھا۔ کہ حکومت ایک ایسی کمیٹی بنانے کی تجویز پر غور کر رہی ہے۔ جو ناجائز قبضہ کی ہوئی زمینوں کی تحقیق کرے گی۔ اور اس کمیٹی کی تجویزوں کے مطابق ناجائز قبضہ ہٹانے کا کام حکومت جلد شروع کرائے گی۔ اب یہ کمیٹی بن چکی ہے۔ اور امید ہے۔ کہ مہاجرین کی اس جائز شکایت کو یہ کمیٹی بہت جلد رفع کرائے گی۔

زمینوں کی تقسیم کے وقت دوسری مشکل یہ تھی کہ ہر شخص لائل پور، منٹگمری، ملتان، گجرانوالہ، لاہور اور گجرات کے علاقوں میں بسنا چاہتا ہے۔ حالانکہ یہ ظاہر ہے کہ تمام مہاجرین ان چند ضلعوں میں آباد نہیں کئے جا سکتے۔ اگر تمام مہاجرین کو زمینوں پر آباد کرنا ہے۔ تو پھر چناب کے اُس پار کے ضلعوں میں بھی آباد ہونا پڑے گا۔ یہ ایک ایسی بات ہے کہ اس بارے میں جب تک مہاجرین حکومت کا ہاتھ نہ بٹائیں۔ اس مسئلے کو حل نہیں کیا جا سکتا اِسی سوال کا دوسرا پہلو ضلع وار آبادی کا مسئلہ ہے۔ اس سوال پر کئی مہینے سے گرما گرم بحث ہو رہی ہے اور

دونو طرف سے دل کھول کر دلیلیں دی جا چکی ہیں۔

حکومتِ پاکستان کا جواب اس بارے میں بہت صاف ہے۔ کئی لاکھ مہاجرین جو اب عارضی طور سے زمینوں پر آباد ہو گئے ہیں۔ انہیں وہاں سے اُٹھا کر دوبارہ الگ الگ علاقوں میں بٹھانا کوئی آسان کام نہیں۔ اس کے لئے جس ساز و سامان کی ضرورت ہے یہ حکومت کے قبضے میں نہیں۔ اور پھر اس کا فیصلہ کون کرے گا کہ کس علاقے میں مشرقی پنجاب کے کون سے ضلع کے لوگ آباد ہوں۔ اگر علاقوں کی تقسیم پر بحث شروع ہو گئی تو یہ ایک ایسا جھگڑا کھڑا ہو گا کہ اس کا حل کسی کے پاس نہیں نکل سکے گا۔ اِس لئے حکومت نے فیصلہ کیا ہے کہ وُہ مہاجر جو اس وقت آباد ہو گئے ہیں عارضی طور پر وہیں بیٹھے رہیں۔ البتہ وہ مہاجر جو اس وقت کیمپوں میں رہتے ہیں انہیں بساتے وقت ضلع وار آبادکاری کا خیال رکھا جائے گا۔ چنانچہ لاہور کے کیمپوں سے جن مہاجرین کو سندھ بھیجا گیا ہے انہیں ضلع وار علاقوں میں آباد کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ضلع وار آبادی کے سوال نے افسوس ہے کہ بہت تلخ شکل اختیار کر لی ہے۔ مگر دیکھا جائے تو دونو طرف کے خیالات میں کوئی ایسا زیادہ فرق نہیں ہے حکومت مانتی ہے کہ ضلع وار آبادکاری اگر ممکن ہو سکے۔ تو بہت اچھی ہے۔ مگر موجودہ حالات میں اس کا امکان نہیں۔

زمینوں پر مہاجرین کو بسانے کے علاوہ شہروں اور قصبوں میں بھی آباد کیا گیا ہے۔ مگر شہروں میں بھی بستے وقت مہاجرین زیادہ تر لاہور، لائل پور، ملتان، منٹگمری جیسے بڑے شہروں میں رہنا پسند کرتے ہیں۔ چنانچہ لاہور شہر میں اس وقت ۷ لاکھ کے قریب مہاجر موجود ہیں۔ اور اسی وجہ سے لاہور شہر میں مکانوں کی قلّت ہو گئی ہے۔ مگر اس کے برخلاف پنجاب کے کچھ ایسے شہر بھی ہیں کہ وہاں مہاجرین کے لئے مکان موجود ہیں۔ اور اگر یہ جانا چاہیں تو وہاں جا کر بس سکتے ہیں۔ مثلاً ڈیرہ غازی خاں اور میانوالی میں مہاجرین کے لئے مکان خالی پڑے ہیں۔ اور اب بھی ان کے وہاں جا کر بسنے کی گنجائش ہے۔ اس معاملے میں پھر حکومت اور مہاجرین کے تعاون کی ضرورت ہے۔

بڑے شہروں میں کیمپوں کی آبادی بھی خطرناک حد تک بڑھ گئی تھی۔ آخر حکومت نے فیصلہ کیا کہ کیمپوں سے مہاجرین کو دوسرے علاقوں میں بھیجا جائے۔ اس موقع پر ایک اور بات کا بھی خیال رکھا گیا۔ اور وہ یہ کہ ایک سال سے مہاجرین کی کفالت کا سارا بوجھ مغربی پنجاب کے سر پر تھا مغربی پنجاب سے جتنے غیر مسلم باشندے ہندوستان گئے تھے۔ اُن سے ۱۷، ۱۸ لاکھ زائد مہاجر یہاں آ گئے تھے۔ اس کے مقابلہ میں سندھ میں صرف سات لاکھ کے قریب مہاجر آئے تھے۔ حالانکہ یہاں سے تقریباً ساڑھے نو لاکھ غیر مسلم ہندوستان گئے تھے۔ اسی طرح صوبہ سرحد میں مہاجروں کی تعداد مشکل سے ۳۱ ہزار کے قریب بتائی جاتی ہے۔ حکومتِ پاکستان نے مغربی پنجاب کی مہاجرین کونسل کی طرح سندھ میں بھی مہاجرین کی کونسل قائم کی۔ تاکہ مغربی پنجاب کی طرح سندھ میں بھی مہاجرین کی آبادکاری کا کام شروع ہو جائے۔ اس کے کچھ دن بعد صوبہ سرحد میں بھی مہاجرین کونسل قائم ہو گئی۔

حکومتِ پاکستان نے فیصلہ کیا کہ مغربی پنجاب میں زمینوں اور شہروں میں آباد کرنے کے بعد بھی تقریباً ۴ لاکھ مہاجر باقی ہیں۔ انہیں صوبہ سرحد، بلوچستان، سندھ اور پاکستانی ریاستوں میں بسانا پڑے گا۔ چنانچہ سندھ نے ۲ لاکھ مہاجر بسانے کی حامی بھری۔ ایک لاکھ مہاجر صوبہ سرحد بھیجنے کا فیصلہ ہوا۔ اور باقی ایک لاکھ مہاجرین کو بلوچستان اور پاکستان کی ریاستوں میں تقسیم کیا گیا۔ سب سے مشکل کام لاہور کے کیمپ خالی کرانے کا تھا۔ کہ جہاں پر نے دو لاکھ کے قریب مہاجر نہایت تکلیف کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ سندھ میں ایک بہت بڑا زراعتی علاقہ ان مہاجرین کے لئے موجود تھا۔ اور یہ ایسا علاقہ تھا کہ جس کی زرخیزی میں کسی کو شبہ نہیں۔ اس کے علاوہ سندھ کے بہت سے شہروں اور قصبوں میں بھی غیر مسلم باشندوں کے مکان خالی پڑے تھے۔ چنانچہ ۲ لاکھ مہاجروں کو سندھ میں بسانے کا کام ۱۰ ستمبر سے شروع ہو گیا جس روز لاہور سے مہاجرین کی پہلی ٹرین سندھ کے لئے روانہ ہوئی ہے۔ والٹن کے اسٹیشن پر میں خود موجود تھا۔ پاکستان کے وزیرِ مہاجرین خواجہ شہاب الدین، پنجاب کے وزیرِ اعظم خان افتخار حسین خاں ممدوٹ اور پنجاب کے دوسرے وزیر اپنے مہمانوں سے رخصت ہونے اسٹیشن پر آئے تھے۔ سندھ جانے والے مہاجرین کی اسپیشل ٹرینوں کے ساتھ راستے میں کھانے کا انتظام تھا۔ سندھ میں مستقل بندوبست ہونے تک کے لئے ۲۰ دن کی خوراک ان کے ساتھ تھی۔ حفاظت کے لئے پولیس تھی۔ بیمار مریضوں کے لئے ڈاکٹر ہمراہ تھے۔ راستے میں کھانا پکانے کے لئے خیمے ساتھ جا رہے تھے۔ تاکہ جہاں مناسب ہو خیمے لگا کر کھانا پکا لیا جائے۔ لاہور کے اس قافلے کا مقابلہ پچھلے سال کے مشرقی پنجاب کے قافلوں سے کیجئے۔ جب کسی کو کسی کا ہوش نہ تھا۔ اور ہر شخص اپنی جان بچانے کے لئے پاکستان آ رہا تھا۔ سندھ جانے والے مہاجرین کے چہروں سے معلوم ہوتا تھا۔ کہ واقعی یہ حکومتِ پاکستان کے شکرگزار ہیں۔ جب والٹن سے ٹرین روانہ ہوئی تو میں نے دیکھا وزیرِ اعظم پنجاب کی آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبا رہی تھیں۔ غالباً انہیں گزشتہ سال کے واقعات یاد آ رہے تھے۔ اور مہاجرین کی ان تکلیفوں کا احساس تھا کہ جو ان بیچاروں نے ایک سال تک کیمپوں میں برداشت کیں۔ مگر مہاجرین کی آنکھوں میں اس نئی دنیا کا تصور تھا۔ کہ جہاں اب یہ جا کر بسنے والے تھے۔ مہاجرین کی ٹرین کا بندوبست کرنے والے عملے کی جدوجہد دیکھ کر معاً میرے ذہن میں قائدِ اعظم کے وہ الفاظ آ گئے جو انہوں نے پاکستان کی سالگرہ کے موقع پر اپنے پیغام میں کہے تھے۔ آپ کو یاد ہو گا، قائدِ اعظم نے فرمایا تھا "جب تک ہم سب مہاجرین کو آباد نہیں کر لیں گے اس وقت تک ہم چین سے نہیں بیٹھ سکتے" یہ قائدِ اعظم کا آخری پیغام تھا۔ اور مجھے یقین ہے کہ قائدِ اعظم کی یہ وصیّت پاکستان کی حکومت اور پاکستان کے سب باشندوں کے سامنے ہے۔ کیونکہ مہاجرین کا مسئلہ ہم سب کا مسئلہ ہے ؏

۲۳ ستمبر ۴۸ء

سندھ میں مہاجرین کی آمد

۲۴ ستمبر ۱۹۴۸ء کو صبح نو بجے خواجہ شہاب الدین صاحب سندھ کے وزیرِ مہاجرین سید میراں محمد شاہ کے ہمراہ دورہ پر روانہ ہوئے۔ کراچی سے ۶۰ میل کے فاصلہ پر ٹھٹے کا مشہور شہر ہے جو مغلوں کے زمانہ میں سندھ کا پایۂ تخت تھا۔ اب یہ صرف ایک قصبہ رہ گیا ہے مگر ٹھٹے کے آس پاس پہاڑوں پر بوسیدہ عمارتیں اور مسجدوں کے گنبد۔ اب بھی اُس کی پرانی عظمت کا پتہ دیتے ہیں۔

ٹھٹے کے اسکول کی عمارت میں کئی سو مہاجر اور انصار وزیرِ مہاجرین کے انتظار میں بیٹھے تھے۔ مہمانوں کے پہنچتے ہی جلسہ شروع ہوا۔ مہاجرین کی طرف سے ایک صاحب نے وزیرِ مہاجرین کا خیر مقدم کیا۔ اس کے جواب میں خواجہ صاحب نے تقریر کی۔

ٹھٹے میں کچھ ایسے مہاجرین تھے کہ جن کے قبیلے کے لوگ غلطی سے کسی اور شہر میں بھیج دیئے گئے تھے۔ خواجہ صاحب نے حکم دیا کہ فوراً ایسے مہاجرین کو اُن کے قبیلے والوں کے پاس بھیجنے کا بندوبست کیا جاوے۔
ٹھٹے سے روانہ ہو کر دن کے بارہ بجے کے قریب ہم بلاڑی کیمپ پہنچے۔ یہ جگہ حیدرآباد سے کوئی آٹھ دس میل ادھر ہے۔ ریل کی پٹڑی کے پاس ایک بڑا کیمپ ہے جہاں اس وقت ۱۱، ۱۲ ہزار کے قریب مہاجر رہتے ہیں۔ ان میں سے کافی تعداد ایسے مہاجروں کی ہے جو اپنی مرضی سے ملتان کیمپ سے سندھ آئے تھے بلاڑی کیمپ میں الور کے تربیت یافتہ سپاہیوں کی بھی کافی تعداد موجود ہے۔ ان سابق سپاہیوں نے نیشنل گارڈ کی تحریک بلاڑی میں شروع کی ہے۔ اور سب سے پہلے خواجہ صاحب کی خدمت میں انہی سپاہیوں نے پاکستان کی حفاظت کے لئے اپنی خدمات پیش کیں۔ یہ سب مہاجر گورنمنٹ کے پروگرام کے مطابق سندھ میں کسی جگہ بھی بسنے کے لئے طیار ہیں۔ اور اب بہت جلد انہیں زمینیں ملنے والی ہیں۔

بلاڑی کیمپ دیکھنے کے بعد ہم حیدرآباد روانہ ہوئے۔ راستہ میں دریائے سندھ کے پُل پر سے گزرے۔ اب دریائے سندھ کا پانی بہت کم ہو گیا ہے لیکن جب سندھ میں سیلاب آیا تھا تو دریائے سندھ کا پانی پُل کے

قریب پہنچ گیا تھا۔ پُل سے اُترتے ہی حیدرآباد شہر نظر آنے لگا۔ حیدرآباد۔ کراچی کے بعد سندھ میں سب سے بڑا شہر ہے۔ اس شہر کی خوبصورت عمارتیں اور مکانات بہت مشہور ہیں۔ ہر گھر کی چھت پر ایک چھوٹا سا لوزات نما مینار یہاں کی خصوصیت ہے۔ اس مینار کو یہاں بادکش کہا جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ ان بادکشوں کے ذریعہ ہوا مکانات کے اندرونی حصہ میں پھیل جاتی ہے اور اس طرح گرمی میں پنکھا چلانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ خدا جانے یہ کہاں تک درست ہے۔ مگر دُور سے حیدرآباد شہر کے مکانوں پر یہ بادکش بہت خوبصورت نظر آتے ہیں بس ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر مکان پر سے ایک ہاتھ نکلا ہوا ہے جو حیدرآباد آنے والوں کو دعوت دے رہا ہے حیدرآباد کے مکانات۔ بازار۔ گلی۔ کوچہ اور بازاروں کی رونق ایسی چیزیں ہیں کہ جن کا تعلق صرف دیکھنے سے ہے۔ اس وقت شہر کی آبادی دو لاکھ کے قریب بتائی جاتی ہے۔ اور اس آبادی میں زیادہ حصہ مہاجرین کا ہے۔ اس لئے شہر میں دہلی۔ اجمیر شریف اور آگرہ کی فضا بس گئی ہے بعض بازاروں میں لوگوں کو چلتے پھرتے دیکھ کر اور ان کی بات چیت سُن کر معاً ایسا خیال آتا ہے کہ یہ بازار سندھ کے نہیں ہیں۔ بلکہ کسی نے دہلی کا کوئی کوچہ اٹھا کر جادو کے زور سے یہاں پہنچا دیا ہے۔

مہاجرین کا عزم و استقلال

شام کو حیدرآباد میں عُمر اسکول کیمپ دیکھنے کے لئے خواجہ صاحب تشریف لے گئے۔ یہاں بھی مہاجرین سے خواجہ صاحب کی ملاقات ہوئی۔ اس کے بعد ریلوے اسٹیشن پر ایک اسپیشل ٹرین آئی جو سندھ کے اندرونی علاقوں کے مہاجرین کو لے جا رہی تھی۔ مہاجرین کے قافلے جنوبی پنجاب سے یہاں آتے ہیں اور یہاں سے انہیں چھوٹی لائن کی گاڑی میں بٹھا کر اندرونی علاقوں میں بھیجا جاتا ہے۔ گاڑی چلنے میں دیر تھی۔ اس لئے مہاجرین پہلے سے اپنی اپنی جگہ پر قابض ہو گئے تھے۔ البتہ چند نوجوان مہاجر پلیٹ فارم پر ٹہل رہے تھے۔ انہوں نے کہا کہ ہم کو حکومت جہاں بھیجے گی ہم وہاں جانے کے لئے تیار ہیں کیونکہ ہم لوگ زیادہ دیر تک حکومت کے کندھوں پر بار بن کر زندگی بسر کرنا نہیں چاہتے۔ ہمیں ہل چلانے کے لئے کھیت دے دیجئے۔ تو ہم اپنی روزی ان سے خود پیدا کریں گے۔ مہاجرین کے اس جذبہ کو خواجہ صاحب نے بے حد پسند کیا۔ اور یہ جذبہ صرف چند نوجوانوں کا نہیں تھا بلکہ ہر شخص کے چہرہ سے اس عزم و استقلال کا پتہ چلتا تھا جو ان کے دلوں میں موجود تھا۔ یہ سب مہاجر سندھ میں اپنا نیا وطن بنانے کے لئے آئے تھے۔ اور اب منتظر تھے کہ جلدی سے جا کر اس گھر کی بنیادیں رکھ دیں۔ رات کے نو بجے حیدرآباد کے انصار اور مہاجرین کی طرف سے ایک بہت بڑا جلسہ کیا گیا اس میں تقریباً ۴۵،۴۰ ہزار کے قریب مجمع تھا۔ اور ہر شخص نہایت شوق سے پاکستان کی حکومت کے ایک ممتاز رکن کی زبان سے حکومت کا پیغام سننے کے لئے آیا تھا۔ اس جلسے کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ عورتوں اور بچیوں کی طرف سے ایک چھوٹی سی لڑکی نے وزیرِ مہاجرین کا خیر مقدم کیا۔ اور حکومتِ پاکستان کو یقین دلایا کہ پاکستان کی عورتیں اور بچے بھی اس کی حفاظت اور استحکام کے لئے اپنا فرض ادا

کرنے کو طیار ہیں۔ جلسے میں جن لوگوں نے تقریریں کیں۔ ان سے ایک بات کا صاف پتہ چلتا تھا۔ اور وہ یہ کہ قائدِ اعظم کی وفات سے پاکستان میں بسنے والوں کو ایک زبردست صدمہ ضرور ہوا ہے مگر اس صدمے نے انہیں مضمحل یا معطل نہیں کیا۔ بلکہ ہر شخص اپنی جگہ یہ بات خوب سمجھتا ہے کہ اب ہم سب کو اپنا فرض پہلے سے کہیں زیادہ تندہی اور ہمت سے ادا کرنا ہو گا۔ تقریریں بار بار اس بات کی طرف اشارہ تھا کہ ہر پاکستانی کو پاکستان کے استحکام اور اس کی حفاظت کے لیئے طیار ہو جانا چاہیئے۔ کیونکہ اس نازک وقت میں ہم اپنی حفاظت کی طرف سے کسی قسم کی لاپروائی اور غفلت نہیں برت سکتے۔ مقرروں نے حکومتِ پاکستان کے اس اقدام کی بھی تعریف کی کہ تمام ملک میں بہت جلد شہری بچاؤ کا کام شروع ہونے والا ہے۔ اور جگہ جگہ رائفل کلب کھولے جا رہے ہیں۔ اس چیز سے نوجوان بہت زیادہ خوش تھے۔ کیونکہ ہر پاکستانی نوجوان کی خواہش یہ ہے کہ اپنی خدمات پاکستان کی حفاظت کے لیئے پیش کر دے۔ اس جلسہ میں حکومتِ سندھ کی طرف سے آنریبل میراں محمد شاہ صاحب نے اعلان کیا کہ سندھ کی حکومت نے مہاجرین کو آباد کرنے کے لیئے تمام سرکاری افسروں کے نام حکم جاری کر دیئے ہیں۔ اور اگر مہاجرین کے بسانے کے لیئے سندھی مسلمانوں کی زمینوں کو بھی لینے کی ضرورت پڑی تو حکومتِ سندھ اس سے دریغ نہیں کرے گی۔ اس پر جلسہ میں بہت زور سے تالیاں بجائی گئیں۔

حکومت کے افسر اور عوام

آنریبل خواجہ شہاب الدین نے اپنی تقریر میں خاص طور سے پاکستان بننے کے بعد حکومت کے افسروں اور پبلک کے تعلقات کا بہت وضاحت سے ذکر کیا۔ اُنہوں نے فرمایا کہ کئی سو سال سے ہم پر ایک غیر ملکی حکومت کا راج تھا۔ اس لیئے حکومت کے افسروں کو ہم اسی نظر سے دیکھنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ مگر اب حکومت ہماری اپنی ہے۔ اس لیئے افسروں اور رعایا میں کوئی فرق نہیں۔ حاکم اور محکوم کی اب پرانی تفریق ختم ہو گئی۔ افسروں کا فرض ہے کہ وُہ اپنے آپ کو پبلک کا خادم سمجھیں۔ اور پبلک بھی اُنہیں اپنا ہی تصوّر کرے۔ وزیرِ مہاجرین نے فرمایا کہ دوسری شکایت عام طور سے یہ کی جاتی ہے کہ اگر کسی کا کوئی کام نہیں ہوتا تو یہ بے سوچے سمجھے اس کا الزام حاکم کے سر تھوپ دیتا ہے اور خود غرضی اسے ایسا اندھا کرتی ہے کہ یہ اپنے مفاد کے مقابلے میں کسی اور کے حقوق کی پروا نہیں کرتا۔ چنانچہ افسروں کے خلاف الزام تراشے جاتے ہیں اور پرانی ذہنیت کے مطابق انہیں عوام آسانی سے قبول کر لیتے ہیں۔

خواجہ صاحب نے بلیک مارکیٹ میں کام کرنے والوں کو بھی تنبیہ کی اور کہا کہ عوام کو بھی ایسے خود غرض لوگوں کا بائیکاٹ کر دینا چاہیئے۔ کیونکہ جب تک ہم سوسائٹی میں ایسے خود غرض لوگوں کے خلاف ایک باقاعدہ محاذ قائم نہیں کریں گے۔ اُس وقت تک اس مصیبت سے ہمیں نجات نہیں مل سکتی۔

دُوسرے روز ۲۵ ستمبر کی صبح کو آٹھ بجے سے ڈیپوٹیشن آنے شروع ہو گئے۔ پہلا ڈیپوٹیشن سندھ کی اقلیتوں کی طرف سے مکھی گوبندرام لے کر آئے تھے۔ ان سے جو کچھ خواجہ صاحب نے فرمایا وہ اب اخباروں میں چھپ کر سب کے پاس پہنچ چکا ہے۔ اس لئے اسے دُہرانے کی ضرورت نہیں۔ البتہ خواجہ صاحب کے جواب کا ایک حصّہ بہت ضروری ہے۔ اس پر سب کو بار بار غور کرنا چاہیئے۔ خواجہ صاحب نے کہا حکومتِ پاکستان کی نظر میں تمام رعایا بالحاظ مذہب وملّت یکساں ہے۔ دوسری جگہ وہاں کی اقلیتوں کے بارہ میں چاہے کوئی پالیسی ہو پاکستان کی پالیسی اس بارہ میں صاف ہے۔ اور حکومتِ پاکستان اسی پالیسی پر عمل کرے گی۔ البتہ اقلیتوں کے جو لوگ ایسے ہیں کہ جنہوں نے اپنے خاندان والوں کو باہر بھیج دیا ہے۔ بلکہ بعض خاندانوں کے تمام مرد پاکستان سے باہر چلے گئے ہیں۔ اور اب صرف ایک آدمی رہ گیا ہے۔ ایسے حالات میں حکومتِ پاکستان کیسے مان سکتی ہے کہ اقلیتوں کے افراد پاکستان کے وفادار شہری ہیں۔ خواجہ صاحب نے فرمایا اگر اقلیتیں اپنی وفاداری ثابت کرنا چاہتی ہیں تو پھر یہ دوعملی نہیں چل سکتی۔ اُنہیں اچھے اور بُرے دن پاکستان کے ساتھ ہی بسر کرنے ہوں گے۔ چاہے ہم ڈوبیں یا سنبھلیں ہر حالت میں اقلیتوں کو اپنی وفاداری ثابت کرنے کے لئے ہمارا ساتھ دینا ہوگا۔

اس کے بعد انجمن مجاہدین کا ایک وفد پیر غلام مجدّد صاحب سرہندی کی قیادت میں ملنے کے لئے آیا۔ انجمن مجاہدین کے ممبران کی طرف سے پاکستان کی حفاظت اور استحکام کے لئے ان کی خدمات پیر صاحب نے پیش کیں۔ اور حکومتِ پاکستان کو یقین دلایا کہ اس انجمن کے ممبر ہر وقت پاکستان کی خدمت کے لئے حاضر ہیں۔ اس وفد نے بھی پاکستان کے دفاع پر بہت زور دیا۔ اور حکومت کے اس اعلان کا خیر مقدم کیا کہ پاکستان میں رائفل کلب قائم کئے جا رہے ہیں۔

دوسرے دن آنریبل وزیر مہاجرین میراں محمد شاہ صاحب کلکٹر سندھ اور دوسرے مقامی افسروں کے ہمراہ حیدرآباد شہر کے کچھ علاقہ کا دورہ کرنے گئے۔ اور آبادی کے مختلف حصوں کو دیکھتے ہوئے شہر کی سرحد پر اس جگہ پہنچ گئے کہ جہاں سے ہالہ کو راستہ چلا گیا ہے۔ ہالہ حیدرآباد سے ۲۶ میل پر ہے۔ ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔ جہاں مہاجرین کا کیمپ قائم کیا گیا ہے۔ یہ قصبہ اس سڑک پر واقع ہے جو کراچی کو کوئٹہ سے ملاتی ہے۔ سڑک بہت پختہ اور ہموار ہے اس لئے آمدورفت میں کوئی دقّت نہیں ہوتی۔ عام طور سے لوگوں کا خیال ہے کہ سندھ میں ریگستان اور بے آب وگیاہ علاقے کے سوا اور کچھ نہیں۔ مگر تمام سندھ کے متعلق یہ خیال بالکل غلط ہے۔ اور اس کی تصدیق حیدرآباد سندھ سے ہالہ تک موٹر کے ذریعہ سفر کرنے سے ہوتی ہے۔ یہ سڑک دریائے سندھ کے ساتھ ساتھ جاتی ہے اور جا بجا سندھ بیراج سے نکلی ہوئی نہریں بھی سڑک کو کاٹتی ہوئی کھیتوں کو سیراب کرتی نکل جاتی ہیں۔ سڑک کے دونوں طرف جہاں تک نگاہ جاتی ہے سبزہ ہی سبزہ نظر آتا ہے۔ کھیتوں کی شادابی اور فصلوں کی ہریاول آنکھوں میں کھبی جاتی ہے۔ اور یقین نہیں آتا کہ یہ وُہ ہی سندھ ہے جہاں، عام لوگوں کے خیال کے مطابق سوائے ریت اور ببول کے درختوں کے گھاس کا نِشان نظر

نہیں آتا۔ خریف کی فصل پکی کھڑی ہے اور زمین کی زرخیزی اور شادابی کا یہ عالم ہے کہ اناج کی بالیں جھکی پڑتی ہیں۔ یہی زرخیز علاقہ اب مہاجرین کے لئے منتظر کھڑا ہے کہ کب مہاجرین آئیں اور فصل ربیع کی کاشت شروع کریں۔

حکومتِ پاکستان نے سندھ گورنمنٹ کے مشورہ کے بعد فیصلہ کیا ہے کہ ان علاقوں میں مہاجر کاشتکاروں کو فی خاندان ۱۲۔ایکڑ کے حساب سے زمین دی جائے گی۔ اور اس کا کرایہ صرف ۵ روپیہ فی ایکڑ لیا جائے گا۔ جن علاقوں میں چاول کی کاشت ہوتی ہے وہاں چونکہ زمین کی زرخیزی نسبتاً زیادہ ہے اس لئے ہر مہاجر کو صرف ۸۔ایکڑ زمین ملے گی اور جو علاقے ان دونوں قسموں سے ذرا کم زرخیز ہیں۔ وہاں ہر کنبے کے لحاظ سے کلکٹر مہاجرین کو جتنی چاہے زمین دے سکتا ہے۔ سندھ میں زمینوں کی کمی نہیں۔ اس لئے مہاجر کاشتکاروں کے لئے بہت عمدہ موقعہ ہے۔ سندھ میں آئیں اور کاشتکاری کے لئے زمینیں حاصل کرلیں۔ اس کے علاوہ سندھ کی گورنمنٹ مہاجر کاشتکاروں کو بیج اور ہل چلانے کے لئے بیل خریدنے کو تقاوی بھی دے رہی ہے۔ گویا مہاجرین کے لئے آنے سے پہلے ان کی آبادکاری کا سب نقشہ طیار ہو چکا ہے۔ اور پاکستان کی گورنمنٹ نے حکومتِ سندھ کے نام احکام جاری کیئے ہیں کہ جہاں تک ممکن ہو سکے بغیر کسی روک ٹوک کے مہاجرین کو فوراً زمین پر آباد کر دیا جائے۔ چنانچہ اسی حکم کے مطابق اگر غیر مسلموں کی زمینوں پر کسی مقامی زمیندار نے ناجائز قبضہ رکھا ہے یا غیر مسلم مالک چلتے وقت ان زمینوں کو کسی مقامی زمیندار کی نگرانی میں چھوڑ گئے ہیں تو ایسے قبضے اور نگرانی کو پاکستان کی حکومت ہرگز جائز تسلیم نہیں کرے گی۔ بلکہ یہ تمام زمینیں مہاجرین کو آباد کرنے کے لئے واقف سمجھی جائینگی۔

حکومتِ سندھ اور مہاجرین

یہ بات قابلِ اطمینان ہے کہ حکومتِ سندھ کے احکام کے مطابق سندھ کے حکّام نہایت تیزی سے مہاجرین کو آباد کرنے پر کمر باندھ چکے ہیں۔ اور انشاءاللہ فصل ربیع کی کاشت کا وقت ختم ہونے سے پہلے پہلے دو لاکھ مہاجرین سندھ کی زمینوں پر آباد ہو جائیں گے۔ اس سال آپ کو یاد ہو گا کہ دریائے سندھ میں بہت زبردست طغیانی آگئی تھی۔ اور دریا کا پانی سینکڑوں ایکڑ رقبہ پر چھا گیا تھا۔ دریا کے طوفان سے بند ٹوٹ گئے تھے۔ اور اس سلسلہ میں حکومت سندھ کو کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ مگر دریائے سندھ کی طغیانی ایک طرح سے مہاجرین کے لئے نعمت بن گئی۔ اور وہ یوں کہ سینکڑوں ایکڑ رقبہ کہ جہاں عام طور سے آبپاشی کے لئے پانی نہیں ملتا دریا کے طوفان و طغیانی سے سیراب ہو گیا اور پیاسی زمین نے خوب جی بھر کر پانی پیا۔ چنانچہ اب جب کہ دریائے سندھ کے طوفان کا زور ٹوٹ چکا ہے۔ اس علاقہ کی زمین بھی پانی کی زد سے باہر نکل آئی ہے۔ مگر قدرت نے ان پیاسی زمینوں کو ایسا جی کھول کر سیراب کیا ہے کہ یہ سارا علاقہ فصل ربیع کی کاشت کے لئے دامن پھیلائے کھڑا ہے۔ دوسرے لفظوں میں سندھ کی یہ زمینیں مہاجرین کو کاشت کی دعوت دے رہی ہیں۔ اور اب ہمارے مہاجر بھائی اسی سیلاب سے سیراب شدہ علاقہ پر کاشت کرنے کے لئے بھیجے جا رہے ہیں۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ اگر اس علاقہ کی وقت پر کاشت ہو گئی تو یہ

زمینیں اس سال سونا اُگلیں گی۔ اور کاشت کاروں کو ان کی کاشت سے بہت فائدہ ہوگا۔

لیکن میں ذکر کر رہا تھا ہالہ کے کیمپ کا۔ یہ کیمپ سڑک کے کنارہ چھوٹی چھوٹی سرکیوں کی جھونپڑیوں سے بنایا گیا ہے۔ جس میں اس وقت ۲ ہزار کے قریب مہاجر اُترے ہوئے ہیں۔ مگر چار ہزار تک کے رہنے کی گنجائش ہے جب ہم کیمپ میں پہنچے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پنجاب کا کوئی پورے کا پورا گاؤں الہ دین کے چراغ اور جن کے زور سے سندھ میں اُٹھ آیا ہے۔ وہی جھونپڑیوں کے چاروں طرف پنجاب کے دیہات کی رونق۔ اور گاؤں میں بسنے والوں کی مصروفیت۔ کچھ مہاجر جلدی جلدی رسیاں بٹ رہے تھے۔ کچھ نئی جھونپڑیوں کی چھتیں بنا رہے تھے۔ ایک جگہ بہت سے مہاجر بیٹھے تھے اور حقہ کا دور چل رہا تھا۔ ایک جھونپڑی کے سامنے ایک منشی جی لوگوں کے خط لکھ رہے تھے۔ اور حد یہ ہے کہ پنجاب کے گاؤں کا فقیر بھی ان کے ساتھ سندھ پہنچ گیا تھا۔ چنانچہ موقعہ دیکھتے ہی اس نے اپنی قدیم صدا لگانی شروع کر دی۔

مہاجرین کو جب وزیرِ مہاجرین کے آنے کی خبر ہوئی تو ہسپتال والی جھونپڑی کے سامنے جمع ہو گئے۔ یہاں خواجہ شہاب الدین صاحب نے ان سے چند منٹ تک بات چیت کی۔ اور انہیں یقین دلایا کہ ان کی آبادکاری کا کام حکومت کی طرف سے بہت جلد سر انجام پائے گا۔ ہالہ کے ایک زمیندار مخدوم صاحب ایم۔ ایل۔ اے مہاجرین کی خدمت کے لئے موقعہ پر موجود تھے۔ ان کی مدد سے یہاں چھوٹے سے قصبہ میں ایک ہائی اسکول قائم ہے۔ اور کالج کی عمارت بن رہی ہے۔ مخدوم صاحب نے مہاجرین کی امداد میں بھی نمایاں حصہ لیا ہے۔ اور ان کی کوششوں سے مہاجرین کی آبادکاری کی کٹھن منزلیں طے ہوتی جا رہی ہیں۔

ہالہ سے ہم سب پھر حیدرآباد واپس آئے۔ یہاں واپسی پر عورتوں کے ایک ہسپتال کا خواجہ صاحب نے معائنہ کیا۔ جو مقامی مسلم لیگ کی خواتین کی طرف سے چلایا جا رہا ہے۔ اور اس کی اُوپر کی منزل میں بیواؤں کے رہنے کا بندوبست ہے۔ یہاں انہیں چرخہ کاتنے اور دوسری دستکاریاں سکھانے کا بھی انتظام کیا ہے۔ اس قسم کے مدرسوں کی اس وقت پاکستان کو بہت سخت ضرورت ہے۔ اور خواجہ صاحب نے خواتین کے جذبہ اور ہمت کی خصوصیت سے بہت تعریف کی کہ ان کی ہمّت سے بہت سی بیواؤں اور لاچار مریضوں کی مدد کا سہارا بن گیا۔

اب دوپہر ڈھلنے کے قریب تھی مگر حیدرآباد کے مہاجرین کا ایک وفد پہلے سے وزیر مہاجرین سے ملاقات کا منتظر تھا۔ اس وفد نے بھی حکومت کو اپنی وفاداری کا یقین دلایا اور وزیر مہاجرین کے سامنے اپنی ضروریات پیش کیں ان میں سب سے بڑی شکایت مہاجرین کو بلیک مارکیٹ کرنے والے سوداگروں سے تھی جو گھی اور شکر بلیک مارکیٹ میں فروخت کرتے ہیں۔ وزیر مہاجرین نے ان سوداگران کے نام لکھ لئے۔ اور وعدہ کیا کہ بہت جلد پاکستان کی اسپیشل پولس اس معاملہ کی تحقیق کرنے کے بعد ان کے خلاف مناسب کارروائی کرے گی۔

غرض اس ۳۰ گھنٹہ کے مختصر دورہ میں وزیر مہاجرین خواجہ شہاب الدین صاحب نے ۲ عام جلسوں میں مہاجرین کے سامنے تقریریں کیں۔ چار جگہ مہاجرین کے کیمپ دیکھے۔ ۲ وفدوں کو باریاب کیا۔ اور بہت سے لوگوں سے مل کر ان کا نقطۂ نظر سُنا۔ اور سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ حکومت کے ایک رکن نے اپنی آنکھوں سے مہاجرین کے سندھ پہنچنے سے لے کر انہیں آباد کرنے تک جو منزلیں طے کی جاتی ہیں انہیں دیکھ لیا۔ ان کی مشکلوں کا جائزہ لیا۔ جو خامیاں تھیں ان کی تحقیق کا حکم دیا۔ پبلک کو حکومت کی پالیسی سے آگاہ کیا۔ اور اب اس دورہ کے بعد اُن مہاجرین کو جو ابھی تک مغربی پنجاب کے کیمپوں سے سندھ نہیں پہنچے معلوم ہو گیا کہ سندھ میں ان کی آبادکاری کے لئے حکومت کے افسر کس تندہی سے کام کر رہے ہیں۔ اور سندھ کی زرخیز زمین انہیں کیمپوں کی تکلیف زدہ زندگی سے نکلنے کے لئے کس شوق سے دعوت دے رہی ہے۔

صنّاعوں اور دستکاروں کی آبادکاری

جو مہاجر دستکار و صنّاع ہیں۔ ان کی آبادکاری کے لئے ایک پروگرام الگ بن رہا ہے۔ چھوٹی چھوٹی صنعتیں اور گھریلو دستکاریاں جگہ جگہ قائم کی جائیں گی۔ گورنمنٹ کی نگرانی میں ایسے دستکاروں اور صنّاعوں کو موقعہ دیا جائے گا کہ اپنے ہُنر سے پاکستان والوں کی خدمت کریں۔

حکومتِ سندھ اس وقت ایک بہت بڑی آبپاشی کی اسکیم کھولنے والی ہے۔ اس اسکیم میں نہریں کھودنے کے لئے ہزاروں مزدوروں کی ضرورت ہوگی اور اندازہ لگایا گیا ہے کہ کام شروع ہونے کے بعد ۸۰ ہزار مزدور اس اسکیم کے لئے کام کریں گے۔

آپ جانتے ہیں کہ سندھ میں مزدوروں کی بہت کمی ہے۔ اس لئے جو مہاجرین کاشتکاری کرنی نہیں چاہتے۔ انہیں محنت کے کام پر بھی لگایا جا سکتا ہے۔ اور سندھ کی گورنمنٹ نے وعدہ کیا ہے کہ بیراج کی اسکیم پوری ہونے کے بعد ان علاقوں میں زمینیں دیتے وقت ایسے مزدوروں کے حقوق کا خاص طور سے خیال رکھا جائے گا۔

سندھ میں مہاجرین کی آبادکاری

(۷ اکتوبر ۱۹۴۸ء)

شیخ غلام حسین ہدایت اللہ کا انتقال

اِس ہفتہ سندھ میں آنے والے مہاجرین کا ایک سچا دوست اور پاکستان کا ایک تجربہ کار سپاہی ہم سے جدا ہو گیا میرا اشارہ سندھ کے گورنر شیخ غلام حسین ہدایت اللہ کی موت کی طرف ہے۔ شیخ غلام حسین ہدایت اللہ گورنر کی حیثیت سے پاکستان سندھ مہاجرین کونسل کی اکثر صدارت کرتے تھے۔ اور سندھ میں مہاجرین کو بسانے کے سوال پر ہمیشہ اُنہوں نے ہمدردی سے کونسل کی رہنمائی کی۔ اگست کے مہینہ میں اس کونسل کا ایک غیر معمولی اجلاس کراچی میں طلب کیا گیا تھا جس کی صدارت ہمارے وزیرِ اعظم مسٹر لیاقت علی خاں نے کی تھی۔ اس اجلاس میں شیخ غلام حسین ہدایت اللہ بھی تشریف لائے تھے۔ اور اُنہی کے مشورہ سے حکومتِ سندھ نے دو لاکھ مہاجرین کو مغربی پنجاب سے سندھ لانے کی تجویز منظور کی تھی۔ سندھ میں دو لاکھ مہاجرین میں سے آدھے مہاجر پہنچ چکے ہیں۔ اور ہمیں امید ہے کہ سندھ کے رہنے والے اپنے مرحوم گورنر کی رائے کے مطابق مہاجرین کے مسئلے کو اُسی ہمدردی اور خلوص سے حل کرتے رہیں گے۔ آج تیسرے پہر سندھ کے نئے گورنر ہز ایکسیلنسی مسٹر دین محمد نے اپنے عہدہ کا چارج لے لیا۔ اور مہاجرین کی خوش قسمتی ہے کہ اس نازک وقت میں سندھ کا نیا گورنر ایک ایسے مخلص پاکستانی کو بنایا گیا ہے جو ایک بہت مشہور قانون دان بھی ہیں اور مہاجرین کے حقیقی معنوں میں بہی خواہ بھی۔ امید ہے کہ سندھ کی حکومت ان کی رہنمائی میں مہاجرین کے مسئلہ کو بہت جلد مرکزی حکومت کے تعاون سے حل کر سکے گی۔

کلکٹروں کی کانفرنس

یکم اکتوبر کی صبح کو سندھ کے وزیرِ اعظم آنریبل پیر الٰہی بخش نے سندھ کے کلکٹروں کی ایک کانفرنس طلب کی تھی۔ جس کا منشا یہ تھا کہ سندھ کے مختلف ضلعوں میں جو مہاجر مغربی پنجاب سے آ رہے ہیں انہیں بسانے کا کام

جس قدر ہو چکا ہے اس کی تفصیل سب کو معلوم ہو جائے۔ اور آئندہ کا پروگرام تجربے کی روشنی میں مکمل کر لیا جائے حکومتِ سندھ کی دعوت پر پاکستان کے وزیرِ مہاجرین آنریبل خواجہ شہاب الدین نے بھی کلکٹروں کی کانفرنس میں تقریر کی۔ اس تقریر کا ایک فقرہ پاکستان کے تمام اخباروں کی سُرخی بن چکا ہے۔ اور اس کی اہمیت کا تقاضا ہے کہ اسے پھر دُہرایا جاوے۔ خواجہ صاحب نے کہا کہ پاکستان کے سامنے اس وقت جتنے مسائل ہیں ان میں پاکستان کی حفاظت کے سوال کے بعد حکومت کی نظروں میں اہم اور ضروری مسئلہ مہاجرین کا ہے۔

وزیرِ مہاجرین کے اس ارشاد کے بعد ہر شخص کو اندازہ ہو جائے گا کہ حکومتِ پاکستان مہاجرین کے سوال پر کس تندہی اور سنجیدگی سے غور کر رہی ہے۔

سندھ کے کلکٹروں اور ضلع کے حاکموں کو خطاب کرتے ہوئے خواجہ صاحب نے کہا میں چاہتا ہوں کہ حکومت کے افسر مہاجرین کو بسانے کے کام کو ایک مذہبی فریضہ سمجھ کر انجام دیں۔ کیونکہ مہاجرین کی مدد صرف ایک سرکاری کام نہیں ہے۔ بلکہ یہ اس سے بھی بڑھ کر ہماری ذمہ داری ہے۔ خواجہ صاحب نے فرمایا اگر ہمارے افسروں نے اپنا فرضِ منصبی مذہبی جذبہ کے ماتحت ادا کیا تو پھر ہم تمام برائیوں کو دُور کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

اسی کانفرنس میں آنریبل خواجہ شہاب الدین نے یہ بھی اعلان کیا کہ کوئی مہاجر کیمپ میں ضرورت سے زیادہ ایک منٹ بھی ٹھہرنے نہیں پائے گا۔ بلکہ ضلع کے افسروں کا یہ فرض ہو گا کہ ہر ایک مہاجر کو کیمپ میں اُترتے ہی زمین پر آباد کرنے کا کام شروع کر دیں۔ افسروں کو ہدایت دیتے ہوئے پاکستان کے وزیرِ مہاجرین نے کہا۔ مہاجرین سے آپ کا سلوک ہمدردانہ ہونا چاہیئے لیکن اس کے ساتھ انہیں بسانے کے کام میں اپنے احکام میں سختی سے پابندی کرائیے اور مہاجرین کو اس بات کا احساس نہ ہونے دیجئے کہ یہ کسی غیر ملک میں آتے ہیں۔ اگر سندھ میں کسی مقامی شخص نے اُس زمین پر جو مہاجرین کو ملنی چاہیئے ناجائز قبضہ کر لیا ہے تو کلکٹروں کو ضابطہ کے اندر رہ کر اس ناجائز قبضہ کو توڑ دینا چاہیئے۔ اور اس بات میں پاکستان کی گورنمنٹ سندھ کے افسروں کی مدد کے لئے طیار ہے۔

خواجہ صاحب نے اخیر میں فرمایا۔ سندھ میں ۲ لاکھ سے بھی زیادہ مہاجر بسائے جا سکتے ہیں۔ اور ہر شخص کو جاننا چاہیئے کہ مہاجرین کا سندھ میں آنا سندھ کی بہتری اور بھلائی کا موجب ہو گا۔ اس وقت کوشش اس بات کی کرنی چاہیئے کہ اب تک جس زمین پر کاشتکاری نہیں ہو سکی اسے بھی زراعت کے کام میں لایا جائے۔

خواجہ شہاب الدین صاحب کی تقریر کے بعد سندھ کے وزیرِ اعظم آنریبل پیر الٰہی بخش صاحب نے خواجہ صاحب کا شکریہ ادا کیا اور حکومتِ سندھ کی طرف سے دوبارہ ہدایت کی کہ مہاجرین کی آبادکاری کا کام جس قدر ممکن ہو سکے جلد عمل میں لایا جائے۔ پیر صاحب نے کہا مہاجرین فصلی پرندوں کی طرح ہمارے علاقہ میں نہیں آتے ہیں بلکہ یہ ہمارے مستقل شہری ہیں۔ اس لئے مہاجر اور انصار میں کوئی فرق نہیں ہونا چاہیئے۔

سندھ کے وزیرِ مہاجرین آنریبل سید میراں محمد شاہ صاحب نے بھی کلکٹروں کو ہدایت کی کہ انہیں دل و جان سے مہاجرین کی آبادکاری کا کام کرنا ہوگا۔ اور اس بارہ میں کوئی صوبائی تعصب ان کے پاس نہیں پھٹکنا چاہیئے۔

پچھلے ہفتہ سندھ کے کلکٹر حکومتِ سندھ اور حکومتِ پاکستان کے وزیروں کی یہ ہدایات لے کر اپنے اپنے علاقہ کو واپس چلے گئے۔ اور اُمید ہے کہ مہاجرین کی آبادکاری کا کام اب یہ سب اور بھی تندہی سے انجام دیں گے۔

وزیرِ مہاجرین کی ڈاک

پاکستان کی وزارتِ مہاجرین میں ہر ہفتہ کئی سو خط آتے ہیں۔ ان خطوں کو بہت غور سے پڑھا جاتا ہے۔ اور کوشش یہ کی جاتی ہے کہ ہر خط میں جو ضروری باتیں ہوں گورنمنٹ اپنے عمل سے ان کا جواب دے سکے۔ وزارت پاکستان میں عملہ اس قدر کم ہے کہ ہر خط کا فوراً اور علیحدہ علیحدہ جواب دینا ناممکن ہے۔ اس لیئے جن لوگوں کو ان کے خطوط کا جواب نہ ملے۔ وُہ یہ نہ سمجھیں کہ اُن کا خط حکومتِ پاکستان کے پاس نہیں پہنچا۔ اور اگر پہنچا تو حکومت نے اسے پڑھا نہیں۔ آپ یقین کیجیئے کہ ہر خط کی ضروری باتوں کو دفتر میں فوراً نوٹ کیا جاتا ہے۔ اور محکمہ کی طرف سے اس کے متعلق ضروری احکام جاری ہو جاتے ہیں۔ البتہ ان خطوں میں کچھ ایسے خط بھی ہوتے ہیں کہ حکومت ان پر عمل کرنے سے معذور ہے۔ مثلاً ایک مہاجر بھائی نے خط لکھا کہ ہندوستان کے فلاں شہر میں ایک خانقاہ میرے قبضے میں تھی میں اس کا مجاور تھا۔ اور ہر جمعرات کو اس خانقاہ کی آمدنی اتنی ہو جاتی تھی۔ اب مجھے ہجرت کرنی پڑی۔ اس لیئے درخواست ہے کہ پاکستان میں بھی اسی قسم کی کوئی خانقاہ مجھے الاٹ ہو جائے تاکہ اس کی آمدنی سے اپنا گزارہ کر سکوں۔ ایسے خط کا اور اس میں جو درخواست کی گئی ہے اس کا جواب پاکستان کی گورنمنٹ کے پاس نہیں۔ پاکستان کی حکومت چاہتی ہے کہ مہاجرین اپنے زورِ بازو سے پیسہ کمائیں۔ اس لیئے ہمیں افسوس ہے کہ خط لکھنے والے صاحب کو کسی خانقاہ کی الاٹمنٹ نہیں مل سکے گی اور انہیں بھی دُوسرے مہاجرین کی طرح زمین پر ہل چلا کر یا کوئی اور محنت مزدوری کر کے روزی کمانی ہوگی۔

گورنر جنرل کی اپیل

پچھلے ہفتہ پاکستان کے گورنر جنرل ہز ایکسیلینسی خواجہ ناظم الدین نے مہاجرین کی طرف سے ایک اپیل شائع کی تھی جس کا ایک ایک لفظ مہاجرین سے محبت اور اُن کی خدمت کے جذبے سے پُر تھا۔ پاکستان کے گورنر جنرل کا عہدہ سنبھالنے کے بعد گورنر جنرل کا مہاجرین کے متعلق یہ پہلا ارشاد تھا۔ اور اس فرمان سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ہمارے مخلص گورنر جنرل کو مہاجرین کے آرام و آسائش کا کس قدر خیال ہے۔

ہز ایکسیلینسی خواجہ ناظم الدین نے فرمایا:-

"ستمبر ۱۹۴۷ء میں لاکھوں مسلمان اپنے گھروں کو چھوڑ کر پناہ لینے کے لیئے پاکستان آئے تھے۔ اُس وقت جبکہ

ان مظلوم اور بے کس مہاجروں پر مصیبت کے سیاہ بادل چھائے ہوئے تھے۔ ہمارے محبوب قائدِ اعظمؒ نے ان کی مدد کی اور ان کی ہمت بندھوائی۔ قائدِ اعظمؒ کی گرجدار آواز نے اس نازک موقع پر قوم سے اپیل کی کہ ہر ایک شخص کو مہاجرین کی مدد کرنی چاہیئے۔ آج ہمارے محبوب قائدِ اعظم ہم میں موجود نہیں ہیں لیکن قائدِ اعظم کا حکم آج بھی ہمارے لئے وہی عظمت رکھتا ہے۔ قوم نے قائدِ اعظم کے فرمان کے بموجب بہت کچھ مہاجرین کے لئے کیا تھا لیکن ابھی بہت کچھ ہمیں کرنا باقی ہے۔"

گورنر جنرل نے فرمایا "سردی کا موسم سر پر آن پہنچا ہے۔ اور سردی آتے ہی مہاجرین کے لئے گرم کپڑوں کی بھی ضرورت ہو گی۔ ان مہاجرین میں بہت سی عورتیں اور بچّے بھی شامل ہیں۔ ان بیچاروں کو سردی کی مصیبت سے بچانے کے لئے گرم کپڑوں کی سخت ضرورت ہے۔ ہم سب کو یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ مہاجرین کی امداد کو قائدِ اعظم سب باتوں پر ترجیح دیتے تھے۔ ہمارا یہ مقدس فرض ہے کہ اپنے محبوب قائدِ اعظم کی وفات کے بعد اپنے لاکھوں مصیبت زدہ مہاجرین بھائیوں کی مدد کے لئے جو بھی ممکن ہو کریں۔ اس وقت بھی مہاجرین کے لئے گرم کپڑوں اور کمبلوں کی ضرورت ہے۔ یاد رکھئے کہ ہر ایک گرم کپڑا جو آپ دیں گے اس سے ایک مہاجر کی جان بچے گی۔"

گورنر جنرل نے اپیل کے اخیر میں کہا "ہمیں مہاجروں کے لئے ہر قسم اور ہر سائز کے چھوٹے بڑے گرم کپڑوں کی ضرورت ہے۔ کوٹ۔ پتلون اور سویٹر۔ مفلر۔ بنیان۔ جُرابیں۔ کمبل۔ رضائیاں۔ لحاف اور جُوتے۔ آج اپنے گھروں کی اپنی چیزوں پر نظر ڈالئے۔ ہر ایک وُہ چیز جس کی آپ کو ضرورت نہیں ہے۔ اسے مہاجرین کے لئے دے دیجئے۔

مہاجرین کے لئے سامان بھیجنے کا پتہ یہ ہے: مغربی پنجاب میں ہر ضلع کے ڈپٹی کمشنر کے نام۔ سندھ میں گورنر سندھ کے پرائیویٹ سکرٹری گورنر ہاؤس کراچی کے نام۔ یا سندھ کے ضلعوں کے کلکٹروں کے نام۔ بلوچستان میں پولیٹیکل ایجنٹ یا ڈپٹی کمشنر کے نام اور کوئٹے میں اسسٹنٹ ریونیو کمشنر کوئٹہ کے نام۔ مشرقی بنگال میں گورنر مشرقی بنگال کے پرائیویٹ سکرٹری ڈھاکہ کے نام، اور کراچی میں ایڈمنسٹریٹر کراچی کے نام۔

قائدِ اعظم ریلیف فنڈ

آپ کو یاد ہو گا کہ پچھلے سال مہاجرین کی مدد کے لئے قائدِ اعظم ریلیف فنڈ کھولا گیا تھا۔ اس فنڈ کی پاکستان کے ہر صوبے میں ایک شاخ ہے۔ جو اس صوبے میں آنے والے مہاجرین کی مدد کا بندوبست کرتی ہے۔ مغربی پنجاب کی قائدِ اعظم ریلیف فنڈ کمیٹی نے فیصلہ کیا ہے کہ اس سال ان مہاجرین کی مدد کے لئے جو مغربی پنجاب کے کیمپوں سے سندھ آئے ہیں ۶۰ ہزار کپڑے اور ضرورت کی دوسری چیزیں سندھ بھیجی جائیں گی۔ سندھ آنے والے مہاجرین کی مدد گویا دو کمیٹیاں کریں گی۔ ایک تو سندھ کی ریلیف کمیٹی اور دوسری پنجاب کی۔ اس اعلان کا مطلب یہ بھی ہے کہ مغربی پنجاب نے اپنے اُن بھائیوں کو نہیں بھلایا جو ایک سال تک پنجاب کے کیمپوں میں رہے۔ اور اب ۶۰ ہزار

کپڑے وغیرہ بھیج کر انہیں یقین دلایا ہے کہ اگرچہ یہ سندھ آ گئے ہیں لیکن اُن کی محبت کا اثر اب بھی مغربی پنجاب کے رہنے والوں کے دل میں موجود ہے۔

پاکستان میں کمبلوں کی صنعت

پچھلے سال سردی کے دنوں میں مہاجرین کے لئے پاکستان کی حکومت کو کمبل وغیرہ غیر ملکوں سے منگوانے پڑتے تھے کیونکہ پاکستان میں اتنی جلدی کمبلوں اور گرم کپڑوں کا بندوبست نہیں ہو سکتا تھا۔ اس سال حکومت نے کوشش کی ہے کہ کمبل خود پاکستان میں تیار کئے جائیں۔ تاکہ کمبل بنانے کی مزدوری بھی پاکستان میں ہی رہے۔ چنانچہ پانی پت کے کمبل بنانے والے کاریگر جو مغربی پنجاب ہجرت کر کے آتے تھے۔ اور اب جھنگ کے علاقہ میں بسائے گئے ہیں۔ انہوں نے گورنمنٹ سے کہا ہے کہ ہم ۵۰ ہزار کمبل بنا کر مہاجرین کے لئے حکومت کو دیں گے۔ حکومت نے ان کاریگروں کی یہ پیش کش منظور کر لی ہے۔ اور انہیں کمبل بنانے کے لئے جن جن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے وہ دے دی ہیں۔ امید ہے کہ دسمبر سے پہلے پہلے ۵۰ ہزار کمبل مہاجرین کے لئے مہاجر خود طیار کر دیں گے اور اس طرح وُہ رقم جو دوسرے ملکوں کو جاتی۔ اب محنت مزدوری کے صلے میں ہمارے ہی مہاجرین کو ملے گی

حکومتِ پاکستان کی یہ پالیسی ہے کہ زمینوں پر مہاجرین کو آباد کرنے کے علاوہ جو کاریگر اور صناع مہاجر آئے ہیں۔ اُنہیں بھی موقعہ دیا جائے کہ وُہ اپنے ہنر اور کاریگری سے پاکستان کی شہرت کو چار چاند لگائیں۔ سندھ میں آنے والے مہاجرین کے لئے وزیر مہاجرین نے حکم جاری کیا ہے کہ بہت جلد صنعتوں اور چھوٹے چھوٹے کارخانوں کا انتظام کیا جاوے۔ جو مہاجر اپنے ہاتھ کے ہنر سے روزی پیدا کر سکتے ہیں۔ انہیں چاہیئے کہ سرکاری افسروں کی مدد سے اپنے ہنر کو پاکستان کی خدمت کے لئے وقف کر دیں۔ تاکہ پاکستان کی صنعت و حرفت میں ترقی ہو۔

مغربی پنجاب سے سندھ تک

(۲۸ر اکتوبر ۱۹۴۸ء)

اس ہفتے وزیر مہاجرین آنریبل خواجہ شہاب الدین کے ساتھ مجھے لاہور جانے کا موقعہ ملا۔ اس لئے آج رات آپ کو میں مغربی پنجاب کے دورہ کا حال سناؤں گا۔ وہی مغربی پنجاب کہ جس صوبے نے تنہا ایک سال تک ۵۰ لاکھ سے زائد مہاجرین کا بوجھ برداشت کیا۔ وہی مغربی پنجاب کہ جس کے بسنے والوں نے اپنے گھروں کے دروازے مہاجر بھائیوں کے لئے کھول دیئے۔ اور جس کی حکومت نے اَن تھک کئے بغیر اس مشکل مہم کو حل کرنے کی کوشش کی۔ خواجہ صاحب کا لاہور کا دورہ اس دفعہ بعید مختصر تھا۔ مشکل سے ۴۰ گھنٹہ یہ لاہور ٹھہرے ہوں گے لیکن اس مختصر قیام کے دوران میں بھی مہاجرین کی بہبودی اور بھلائی کے اتنے زیادہ کام سر انجام پا گئے کہ اس فہرست کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ دل کو اطمینان بھی ہوتا ہے کہ ایک جفاکش اور سپاہی کی طرح کمر باندھ کر کام کرنے والا شخص چند گھنٹوں میں کتنا کام کر سکتا ہے۔

۲۴ر اکتوبر کی رات کو ۹ بجے کے بعد پاکستان میل سے لاہور پہنچا۔ اگرچہ ٹرین ۱ گھنٹہ سے زیادہ لیٹ تھی، لیکن مخلص دوستوں اور کام کرنے والوں کا ہجوم محبت کے گجرے اور اخلاص کے گلدستے لئے اسٹیشن پر وزیر مہاجرین کے استقبال کے لئے چشم براہ تھا۔

دُوسرے روز صبح سے مہاجرین و انصار کی ملاقاتیں شروع ہو گئیں۔ ۱۱ بجے گورنمنٹ ہاؤس میں مہاجرین کونسل کا اجلاس تھا۔ اس اجلاس میں چند بہت ضروری باتوں کا فیصلہ ہوا۔ اس لئے اخباروں میں چھپنے کے باوجود میں ان میں سے چند فیصلے دُہرا دینا چاہتا ہوں۔

اس سال گورنمنٹ پاکستان نے ایک کروڑ پچیس لاکھ روپیہ مغربی پنجاب کو دینا منظور کیا تھا۔ اور شرط یہ تھی کہ یہ تمام رقم مہاجرین کو آباد کرنے پر صرف کی جائے۔ کونسل نے مغربی پنجاب کی حکومت سے کہا کہ بہت

جلد اس رقم کو خرچ کرنے کی اسکیم طیار کرے۔ تاکہ صحیح مصرف کے مطابق اس بڑی رقم کو مہاجرین کی بھلائی اور بہتری کے کاموں پر صرف کر دیا جائے۔ نہل کے علاقے میں فوجیوں کے بسانے کے سوال پر بھی کونسل میں بحث ہوئی۔ اور قرار پایا کہ خوشاب کے ضلع میں بسنے والے فوجیوں کو فی خاندان ۱۰ ایکڑ کے حساب سے اور ریتیلے علاقہ میں بسنے والے فوجیوں کو ۱۵ ایکڑ کے حساب سے زمینیں دی جائیں۔ اس کے علاوہ پہلے سال ان سے زمینوں کا مالیانہ لینے میں بھی رعایتیں برتنی چاہئیں۔

آخر میں کونسل نے مغربی پنجاب سے ۲ لاکھ مہاجرین کے سندھ روانہ ہو جانے پر اطمینان کا اظہار کیا۔ اور گورنمنٹ کے ان افسروں کے کام کی تعریف کی۔ جو اس زبردست خدمت کو انجام دے رہے تھے۔ اس سلسلہ میں مغربی پنجاب کے ریفیوجی کمشنر مسٹر لغاری خاص طور سے شکریہ کے مستحق ہیں۔ کہ ان کی کوششیں بار آور ثابت ہوئیں۔ اسی روز تیسرے پہر والٹن اسٹیشن سے سندھ جانے والے مہاجرین کی آخری اسپیشل ٹرین روانہ ہونے والی تھی۔ خواجہ صاحب ۲۵ اکتوبر کو اخیری ٹرین کو الوداع کہنے والٹن اسٹیشن تشریف لے گئے۔ اس ٹرین میں تقریباً ۳ ہزار مہاجرین سندھ جا رہے تھے۔ اور لاہور کے اکثر سربرآوردہ حکّام اور شہری اپنے ان عزیز مہمانوں کو رخصت کرنے اسٹیشن پر موجود تھے۔ گورنر مغربی پنجاب سر فرانسس موڈی جنہوں نے مہاجرین کو آسائش بہم پہنچانے اور آباد کرنے کے لئے اپنے اُوپر آرام و راحت کو حرام کر لیا۔ والٹن اسٹیشن پر کھڑے تھے خان افتخار حسین صاحب آف ممدوٹ وزیرِ اعظم پنجاب جن کی گورنمنٹ نے ایک سال تک مہاجرین کے مشکل مسئلے کو سلجھانے کے لئے دن رات ایک کر دیا۔ آج مہاجرین سے رخصت ہونے تشریف لائے تھے۔ ان کے علاوہ حکومت کے اعلیٰ اراکین اور ضلع کے دوسرے حاکم بھی موجود تھے۔ جب مہاجرین ٹرین میں بیٹھ گئے تو سب سے پہلے گورنر پنجاب نے اُردو میں تقریر کے ذریعہ انہیں الوداع کہی۔ اور اس کے بعد خواجہ شہاب الدین صاحب نے مہاجرین کو مخاطب کیا۔ خواجہ صاحب نے خدا کا شکر ادا کیا کہ جس مشکل کام کا گورنمنٹ نے اعلان کیا تھا آج اس کی پہلی منزل کامیابی سے طے ہوئی۔ انہوں نے حکومتِ پنجاب اور حکومتِ سندھ کا شکریہ ادا کیا۔ کہ ان کے تعاون و امداد سے مہاجرین کو بسانے کا کام بہت تیزی سے ہو رہا ہے۔ اور گورنمنٹ نے افسروں کو حکم دیا ہے کہ کوئی مہاجر سندھ پہنچنے کے بعد ضرورت سے زیادہ دیر تک کیمپ میں نہ رہنے پائے۔ وزیر مہاجرین نے اپنی تقریر میں نہایت صاف گوئی سے کام لیا اور فرمایا کہ آپ کو سندھ پہنچنے کے بعد بھی تکلیفیں برداشت کرنے کے لئے طیار رہنا چاہیئے۔ کیونکہ یہ کہنا کہ آپ کو جاتے ہی آرام ملے گا صحیح نہیں۔ مہاجرین کے بارے میں حکومت کی مشکلات کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے کہا لوگوں کی عام عادت ہو گئی ہے کہ مغربی پنجاب کی حکومت کی جا و بیجا نکتہ چینی کرتے ہیں۔ مگر لوگ یہ بات بھول جاتے ہیں کہ مغربی پنجاب کی حکومت کو کن مشکلات میں سے گزرنا پڑا۔ اور اس کے سر پر

کس قدر ذمے داری ایکا ایکی آ گر پڑی۔ خواجہ صاحب نے مہاجرین کو مشورہ دیا کہ وہ سندھ کو اپنا نیا وطن سمجھیں۔ اور صرف حکومت کے افسروں کی مدد پر ہی بھروسہ نہ کریں بلکہ اپنی مدد آپ بھی کریں۔

اس پیغام کے بعد پولیس کے بینڈ باجہ نے رخصت کا نغمہ چھیڑا۔ انجن نے سیٹی دی۔ گارڈ نے سبز رنگ کی جھنڈی ہوا میں ہلائی اور مہاجرین کی آخری اسپیشل ٹرین ۲ ہزار مہاجرین کو لئے سندھ کی طرف روانہ ہو گئی۔ ریل کی کھڑکیوں سے مہاجرین عورتیں، بچے اور مرد انصار سے ہاتھ ہلا ہلا کر رخصت ہو رہے تھے۔ اور مہاجرین کی زبان پر پاکستان زندہ باد کے نعرے تھے۔ یہی پاکستان زندہ باد کے نعرے لگاتے ہمارے مہاجرین بھائی ایک سال پہلے پاکستان کی سرزمین میں داخل ہوئے تھے۔ اور آج اپنے دلوں میں ایک نئی زندگی کی اُمید لئے سندھ کی زرخیز زمینوں کی طرف جا رہے تھے۔

ایک صاحب نے مجھے بتایا کہ پچھلے سال جب مہاجرین کے قافلے واگہ کے مقام پر پاکستان کی سرحد میں داخل ہو رہے تھے۔ تو حکومت کے لئے یہ معلوم کرنا ناممکن تھا کہ ہر روز کتنے مہاجرین لاہور آئیں گے اور کتنے ہزار مہاجرین کے لئے کھانا درکار ہو گا۔ مگر لاہور کے انصار مہاجر بھائیوں کی ہر خدمت کے لئے تیار تھے۔ اور کم سے کم وقت میں مہاجرین کے لئے کھانا مہیا ہو جاتا تھا۔

ان صاحب نے مجھے بتایا ریڈیو پر اعلان ہوا کہ آج ۲ لاکھ مہاجر لاہور پہنچ رہے ہیں۔ اور ان کے لئے کھانے کی ضرورت ہے۔ ریڈیو پر صرف اتنے سے اعلان کا ہونا کافی تھا۔ ۲ گھنٹے کے اندر لاہور شہر کے ہر گلی کوچے اور بازار میں اپنے اپنے گھروں سے کھانا پکا کر لوگ جمع ہو گئے۔ اور اس روز ۲ لاکھ مہاجرین کی دعوت لاہور کے انصار نے اس فراخدلی سے کی کہ بڑی سے بڑی فوج کے راشن کا بندوبست بھی اس خوبی سے نہیں ہو سکتا پاکستان کو جہاں مہاجرین کی قربانیوں پر فخر ہے وہاں پاکستان کو انصار کی اس تنظیم اور فراخ دلی پر بھی ناز ہے۔ دنیا کی دوسری قومیں ہمارے ان کارناموں کو مدت تک رشک کی نظر سے دیکھیں گی۔

ہماری تنظیم کا ذکر آیا ہے تو آج میں لاہور کے دو ایسے اداروں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں کہ جن پر پاکستان کو بجا طور سے فخر ہو سکتا ہے۔ ان میں سے پہلا ادارہ وُہ ہے جو گنگا رام ریفیوجی ہوم کے نام سے مشہور ہے اسے دیکھنے کے لئے وزیر مہاجرین ۲۵ اکتوبر کی شام کو تشریف لے گئے تھے۔ یہاں ایک سال کے اندر ساڑھے چار ہزار سے زیادہ لاوارث عورتیں اور بچے پناہ پا چکے ہیں۔ وُہ عورتیں اور بچے جن پر مشرقی پنجاب کے مظالم کے بعد عرصۂ حیات تنگ تھا۔ اس ریفیوجی ہوم کی چار دیواری میں مہاجر عورتیں شفیق بہنوں کی نگرانی میں رہتی ہیں۔ اور جب تک کہ ان لاوارث عورتوں اور بچوں کے رشتہ دار یا وارث آ کر انہیں اپنے ساتھ نہیں لے جاتے۔ اس ہوم کی چار دیواری میں یہ مہمان رہ سکتے ہیں۔ اس وقت بھی چار سو سے زائد عورتیں اور

بچے یہاں تربیت پاتے ہیں۔ اور انہیں اس خوبی سے تربیت دی جاتی ہے کہ بے ساختہ اس ہوم میں کام کرنے والی خواتین کی محنت اور صلاحیت کی داد دینی پڑتی ہے۔ گورنر پنجاب کے ملٹری سکرٹری کی بیوی مسز کراسٹر جیسی تجربہ کار اور ہمدرد خاتون اس کی انچارج ہیں۔ انہوں نے وزیرِ مہاجرین اور وزیرِ اعظم مغربی پنجاب کو تمام عمارت اور اس کے کارخانوں کی سیر کرائی۔ کم عمر کے بچے مختلف جماعتوں میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ ہر بچہ نہایت صاف ستھرا نظر آتا تھا۔ ان کا لباس نہایت سادہ اور معمولی تھا۔ مگر انہیں دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ معمولی اور سادہ لباس میں بھی صفائی سے ایک دلفریب زیبائش پیدا ہو جاتی ہے۔ جب ہم وہاں پہنچے تو بچوں اور عورتوں کو شام کا کھانا تقسیم کیا جا رہا تھا۔ غذا بھی سادہ لیکن مقوی تھی۔ اور اس قدر صفائی سے تیار کی گئی تھی کہ بہت سے امیروں کے پُرتکلف دسترخوان اس کے سامنے ہیچ تھے۔ ہوم کے کمروں کی صفائی بھی قابلِ تعریف تھی جس کمرے میں جنس۔ آٹا۔ چاول رکھا جاتا ہے۔ اس کے دروازے پر کسی ظریف نے لکھا "توبہ کا دروازہ ہمیشہ کھلا رہتا ہے اے غافل انسان اب بھی توبہ کر لے"۔

اس ہوم میں عورتوں کو دھاگے کے گولے بنانے کا کام بھی سکھایا جاتا ہے۔ اور اس کام سے ہر عورت چالیس روپیہ مہینہ سے لے کر سو روپے تک کما سکتی ہے۔ وزیرِ مہاجرین اس ادارے کو دیکھ کر اس قدر خوش ہوئے کہ دوسرے روز لاہور میں انہوں نے ان خواتین کا ایک جلسہ بلایا۔ جو ایسے کاموں میں حصہ لیتی ہیں۔ ان خواتین میں بیگم شاہنواز، بیگم فاطمہ بیگم تصدق حسین۔ اور مس کوئین خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ اس جلسے میں وزیرِ اعظم پنجاب بھی تشریف لائے تھے۔ فیصلہ یہ ہوا کہ مغربی پنجاب میں لاوارث عورتوں اور بچوں کے لئے بہت بڑے پیمانے پر ایک ہوم کھولا جائے اور ایک کمیٹی اس اسکیم کو بنا کر پیش کرے۔

۲۶ اکتوبر کو تیسرے پہر وزیرِ مہاجرین لاہور سے کراچی واپس آنے والے تھے۔ دوپہر کو عورتوں سے متعلق دوسرا ادارہ قصرِ استقلال دیکھنے تشریف لے گئے۔ یہاں عورتوں کو صنعت و حرفت اور دستکاریاں بہت اعلیٰ پیمانہ پر سکھائی جاتی ہیں۔ اور اس کا انتظام بھی تمام تر ہماری بہنوں کے ہاتھ میں ہے۔ وزیرِ مہاجرین اور وزیرِ اعظم مغربی پنجاب کو قصرِ استقلال کی طرف سے ایک ننھی بچی نے گوٹے کے ہار پہنائے۔ یہ ہار قصرِ استقلال میں کام سیکھنے والی عورتوں نے خود بنائے تھے۔ قصرِ استقلال واقعی اسم بامسمیٰ ہے۔ یہاں عورتوں کو کپڑا بننا۔ صابن بنانا۔ چہرے پر استعمال کرنے والی کریم اور سنو بنانی، کشیدہ کاری، درزی کا کام اور دوسری دستکاریاں سکھائی جاتی ہیں۔ اور اس طرح لاوارث عورتوں کی زندگی کا ایک سہارا بن گیا ہے۔ پاکستان میں اس قسم کے اداروں کی سخت ضرورت ہے۔ اور ہماری کام کرنے والی بہنوں کے لئے اس قسم کے کام کرنے کا بہترین موقعہ ہے۔

قصرِ استقلال سے رخصت ہو کر وزیرِ مہاجرین کراچی جانے والے جہاز میں بیٹھے اور ٹھیک پانچ بجے ہوائی جہاز

والٹن کے کیمپوں پر سے اُڑتا ہُوا کراچی کی طرف روانہ ہوگیا۔ مگر آج یہ کیمپ مہاجرین سے خالی تھے۔ ہماری نظروں کے نیچے لاہور کا شہر پھیلا ہُوا تھا اور دُور تک کارخانے۔ مکانات۔ نہر کے کنارے عمارتیں۔ باغات اور لاہور کے ہمت والے باشندے۔ وُہ باہمت لوگ کہ جنہوں نے چند گھنٹہ کے نوٹس پر دو لاکھ مہاجرین کے کھانے کا بندوبست کیا۔ وُہ باہمت لوگ جو ایک سال تک مہاجرین کی خدمت کرتے رہے۔ جنہوں نے مہاجرین کی مصیبت پر صرف آنسو ہی نہیں بہائے بلکہ ان کے آرام و آسائش پر اپنا آرام قربان کر دیا۔ یہ بہادرانہ استقلال اُن کی ہمت کا ایک نشان ہے۔ ایسا نشان کہ پاکستان کو اس پر فخر ہے۔

دو لاکھ مہاجرین کے سندھ چلے جانے کے بعد مغربی پنجاب کے کیمپوں کا مسئلہ حل ہو چکا ہے مغربی پنجاب میں اب بھی کئی لاکھ مہاجر موجود ہیں لیکن یہ کیمپوں میں نہیں ہیں۔ بلکہ مختلف ضلعوں اور تحصیلوں میں رہتے ہیں۔ پاکستان گورنمنٹ کے سامنے اب مہاجرین کی آبادکاری کا سوال ہے اور وزیر مہاجرین کے حکم کے مطابق سرکاری افسروں کی تمام تر کوششیں ان کی آبادکاری پر صرف کی جا رہی ہیں۔

دوسرے مغربی پنجاب میں جہاں جہاں زمینیں دی گئی ہیں اگر ان زمینوں کے متعلق مہاجرین کو شکایت ہے تو اسے دُور کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اور افسروں کو ہدایت کی گئی ہے کہ مہاجرین کے لئے اور زیادہ آسانیاں بہم پہنچائیں۔ تیسری بات حکومتِ پاکستان کے سامنے یہ ہے کہ وزارتِ صنعت و تجارت کے تحت پاکستان کے کارخانوں اور ملوں کو چلانے کے لئے ایک کمیٹی بنائی جائے۔ جس میں مہاجرین کی نمائندگی بھی ہو۔ تاکہ ہماری صنعت و حرفت ترقی کر سکے ؎

سرکاری و غیر سرکاری اقدامات

(۲۳ر دسمبر ۱۹۴۸ء)

سندھ میں بسنے والے مہاجرین کا میں نے کئی ہفتے سے ذکر نہیں کیا۔ اس کی وجہ یہ نہیں۔ کہ حکومتِ پاکستان ان مہاجرین کی آبادکاری کی طرف سے غافل تھی۔ بلکہ دوسرے صوبوں میں مہاجرین کی آبادکاری کا حال بھی سنانا میرا فرض تھا۔ اس لئے سندھ کے مہاجرین کا حال آپ نہیں سُن سکے۔ آپ کو یاد ہوگا۔ وزیرِ مہاجرین آنریبل خواجہ شہاب الدین نے سندھ کے مختلف ضلعوں کے کلکٹروں کو حکم دیا تھا کہ اپنے اپنے ضلع میں آبادکاری کی رپورٹیں باقاعدہ مرکزی حکومت کے پاس بھیجتے رہیں۔ چنانچہ ۱۴ر دسمبر تک آنے والی رپورٹوں سے معلوم ہوتا ہے کہ سندھ میں ۲ لاکھ ۳۲ ہزار ۹۱۸ مہاجر آئے۔ اور ان میں سے ایک لاکھ ۵۳ ہزار ۴۸۰ مہاجرین کو زمینیں الاٹ ہو گئیں۔ گویا ۶۶ فی صدی مہاجرین کو زمینیں الاٹ ہو چکی ہیں۔ ۱۴ر دسمبر کے بعد کی چند رپورٹوں سے پتہ ملتا ہے کہ بعد میں اور بھی بہت سے مہاجرین کو زمینیں ملی ہیں۔ اور ان کی تعداد ۷۵ فی صدی تک پہنچ گئی ہے۔ سندھ کے تمام ضلعوں میں صرف تھرپارکر کو چھوڑ کر مہاجرین کے لئے زمین کافی ہے۔ اور جو مہاجرین باقی رہ گئے ہیں۔ انہیں بھی زمینیں الاٹ کی جا رہی ہیں۔ سکھر کے ضلع کے متعلق شکایت سنی جاتی تھی کہ وہاں آبادکاری کا کام بہت ہلکا ہو رہا ہے۔ بلکہ آپ کو یاد ہوگا کہ نومبر کے مہینہ میں جب وزیرِ مہاجرین نے سکھر کا دورہ کیا تھا تو ایک مختارکار کو اس کی غفلت اور بے پرواہی کی وجہ سے برخاست بھی کر دیا گیا۔ مگر اب پتہ چلا ہے کہ سکھر میں بھی آبادکاری کا کام خوب ہو رہا ہے۔ اور وہاں مہاجرین کو آباد کرنے میں حکومت کے افسروں نے اپنی ذمہ داری کا پورا پورا احساس کر لیا ہے۔

مہاجرین کے ہمدرد کا انتقال

میں نے آپ کو وزارتِ مہاجرین کے سابق سکرٹری سر ولیفرڈ گرگسن کے ہوائی جہاز میں مارے جانے

کی خبر سُنائی تھی۔ اس ہفتے وزارتِ مہاجرین کے ایک اعزازی کارکن کے انتقال کی خبر ملی ہے۔ ان کا نام کرنل مارٹن سن تھا۔ اور یہ تقریباً ایک سال سے سندھ کے مختلف ضلعوں میں مہاجرین کو آباد کرنے کا کام بغیر کسی معاوضہ یا تنخواہ کے کر رہے تھے۔ کرنل مارٹن سن کی ہفتہ وار رپورٹوں سے وزارتِ مہاجرین کو بہت مدد ملتی تھی۔ خصوصاً فوج کے سپاہیوں اور ان کے خاندانوں کو آباد کرنے میں کرنل صاحب بہت دلچسپی لیتے تھے کرنل صاحب دورہ پر تھے۔ کہ انہیں ملیریا بخار ہوا۔ ریڈ کراس کے ڈاکٹروں نے انہیں بہت سمجھایا کہ فوراً گاؤں سے شہر کے ہسپتال میں جا کر علاج کرائیں۔ مگر کرنل صاحب نے یہی جواب دیا کہ جہاں اور مہاجر رہتے ہیں میری جگہ اُن کے پاس ہے۔ چنانچہ اسی حالت میں کرنل صاحب اپنا فرض ادا کرتے ہوئے ہم سے جدا ہو گئے۔ مسز مارٹن سن پر بھی ملیریا کا اثر تھا۔ مگر یہ وقت پر ہسپتال پہنچ گئیں اور اب یہ تندرست ہیں۔

کرنل مارٹن سن کی وفات پر وزارتِ مہاجرین کو مسز مارٹن سن سے ہمدردی ہے کہ ان کے خاوند نے اپنا فرض ادا کرتے ہوئے مہاجرین کے لئے جان کی پرواہ تک نہیں کی۔ اور یہ فرض شناسی کا ایسا عمدہ نمونہ ہے کہ پاکستان کے تمام افسر اور کام کرنے والوں کے لئے ہمیشہ شمعِ ہدایت کا کام دے گا۔ خداوند کریم ہم سب کو اپنا فرض ادا کرنے کی توفیق دے تاکہ وہ مشکلیں جن سے ہمیں سابقہ پڑ رہا ہے آسانی سے حل ہو جائیں۔

گورنر سندھ کا دورہ

اس مہینہ سندھ کے گورنر ہز ایکسیلینسی مسٹر دین محمد نے سندھ کے اندرونی اضلاع کا دورہ کیا تھا۔ اس دوران میں سیہونی کی انجمن سادات کی طرف سے مسٹر دین محمد کی خدمت میں ۱۶ بیل پیش کئے گئے۔ یہ بیل انصار نے اُن مہاجرین کے لئے تحفے کے طور پر دیئے تھے۔ جو سندھ میں آباد ہوتے ہیں۔ گورنر صاحب نے ضلع کے کلکٹر کو حکم دیا ہے کہ ان بیلوں کو ایک جگہ رکھا جائے اور ضرورت کے وقت مانگنے کے طور پر مہاجرین کو دیا جائے تاکہ ہل چلانے کے بعد پھر یہ دوسرے مہاجرین کے کام آسکیں۔

سندھ کے انصار نے اسی قسم کے اور تحفے بھی مہاجرین کو دیئے ہیں۔ اور دُوسرے انصار کے لئے ایک عمدہ مثال قائم کی ہے۔

اسی سفر کے دوران میں ایک جگہ ریاست پٹیالہ کے مہاجرین نے گورنر سندھ کو کشمیر ریلیف فنڈ کے لئے دس روپیہ کا پوسٹل سارٹیفکیٹ پیش کیا۔ یہ غریب مہاجر خود حکومت کے محتاج ہیں۔ مگر اس غربت کے باوجود ان کا کشمیر ریلیف فنڈ میں چندہ دینا ایک ایسا کارنامہ ہے کہ جس کی سب نے تعریف کی۔ ان مہاجرین کے جذبہ سے متاثر ہو کر دوسرے مہاجرین نے بھی کشمیر فنڈ میں دل کھول کر روپیہ دیا۔ جس کو گورنر سندھ نے شکریہ کے ساتھ قبول کیا۔ یہ اسلام کی قابلِ فخر روایات کا ایک ادنیٰ نمونہ تھا کہ مسلمان مہاجرین نے مصیبت کے وقت

دوسرے مسلمان بھائیوں کی مدد اس فراخ دلی سے کی۔

سندھ مہاجرین کونسل

اخیر میں یہ خبر اور سن لیجئے کہ آج شام کو پاکستان سندھ رفیوجی کونسل کا اجلاس گورنر سندھ کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اس جلسے میں آنریبل خواجہ شہاب الدین اور سندھ کے وزیر مہاجرین آنریبل میراں محمد شاہ صاحب بھی شامل تھے۔ سندھ رفیوجی کونسل کا یہ پہلا جلسہ تھا۔ کہ جس کی صدارت گورنر سندھ مسٹر دین محمد نے کی۔ چنانچہ اجلاس کے شروع ہوتے ہی خواجہ شہاب الدین نے گورنر سندھ کا خیر مقدم کیا۔ اور کہا کہ گورنر صاحب نے اب تک اپنے دوروں میں مہاجرین سے جس ہمدردی کا ثبوت دیا ہے۔ اس کی وجہ سے ہمیں امید ہے کہ یہ مہاجرین کے مسئلے میں اسی طرح دلچسپی لیتے رہیں گے۔ آج کونسل میں مہاجرین کی آبادکاری کے مسئلے پر بہت دیر تک بحث ہوئی۔ بہت سی دوسری تجاویز کے علاوہ کونسل نے حکومت سے سفارش کی کہ گورنمنٹ کی ملازمتوں میں مہاجرین کو ترجیح دی جائے۔ سندھ گورنمنٹ کے ایک افسر نے بتلایا کہ سندھ میں ہر جگہ ملازمتوں میں مہاجرین کو ترجیح دی جا رہی ہے۔ کونسل کے اجلاس میں مسٹر دین محمد نے اپنے دورے میں جو مہاجرین کی کیفیت دیکھی تھی۔ اس کا بھی حال سنایا۔ اور گورنر سندھ کے بیان کی روشنی میں کونسل نے مہاجرین کی آبادکاری کے متعلق ضروری فیصلے کئے۔ کونسل نے یہ سفارش کی کہ مغربی پنجاب کی طرح سندھ میں بھی مہاجرین کو گزارے کے طور پر الاؤنس ملا کرے۔

سندھ میں مہاجرین کی آبادکاری

وزیر مہاجرین کے حکم کے مطابق اب سندھ میں سب مہاجرین کو پناہ لینے کے لئے مکان یا جھونپڑیاں مل چکی ہیں۔ وزیر مہاجرین کا حکم یہ تھا کہ سندھ میں آنے والے مہاجرین فوراً گھروں یا جھونپڑیوں میں آباد کر دیئے جائیں چنانچہ اس حکم کے مطابق آبادکاری افسروں نے سب مہاجرین کو کسی نہ کسی قسم کا ٹھکانہ ضرور دے دیا ہے۔ بہت سے مہاجرین جنہیں مکان یا گھر نہیں مل سکے انہوں نے خود اپنے ہاتھ سے جھونپڑیاں طیار کر لیں۔ اور یہ کارنامہ قابل فخر ہے کہ چند ہفتے کے اندر سندھ کے دو لاکھ سے زائد مہاجرین اب کھلے آسمان کے نیچے نہیں بلکہ گھروں اور جھونپڑیوں کے اندر رہتے ہیں۔ سردی کے موسم میں مہاجرین کے لئے حکومت نے کمبلوں کا بھی انتظام کیا تھا چنانچہ قائد اعظم ریلیف فنڈ سے ایک لاکھ کمبل سندھ میں پہنچ چکے ہیں۔ یہ کمبل مختلف ضلعوں میں مہاجرین کی آبادی کے لحاظ سے بھیجے گئے تھے۔ اور پاکستان کی مرکزی حکومت کے افسروں کی زیر نگرانی ان کمبلوں کو تقسیم کیا جا چکا ہے۔ مگر ایک لاکھ کمبل تقسیم ہونے کے بعد بھی کمبلوں کی ضرورت باقی رہی۔ چنانچہ تیس ہزار کمبل اور سندھ پہنچ گئے۔ اور یہ کمبل بھی حیدرآباد۔ تھرپارکر۔ نواب شاہ۔ سانگھڑ۔ سکھر۔ دادو۔ لاڑکانہ اور ٹھٹے کے ضلعوں میں تقسیم کئے جا رہے ہیں۔ حکومت نے ۷۰ ہزار اور کمبل منگوائے ہیں۔ جونہی یہ کمبل آئے انہیں بھی مہاجرین میں تقسیم

کر دیا جائے گا۔

فیصلہ ہوا ہے کہ سندھ میں بسنے والے مہاجرین کو جب تک اُن کی فصلیں تیار نہیں ہوتیں حکومت کی طرف سے مُفت راشن ملتا رہے گا۔ اس کا حساب یہ ہے کہ فی کس ۸ روپیہ ماہوار۔ اور ایک خاندان کو ۲۵ روپیہ ماہوار تک گزارہ ملے گا۔ البتہ جہاں حکومت کے پاس جنس موجود ہے۔ وہاں ۶ چھٹانک فی کس روزانہ کے حساب سے آٹا، ½ چھٹانک دال اور سیر بھر ایندھن ملا کرے گا۔ اس کے علاوہ ہر خاندان کو ایک روپیہ روزانہ مسالے۔ تیل گھی وغیرہ کے لئے الگ ملے گا۔ حکومت کی طرف سے جگہ جگہ راشن کی دوکانیں کھُل رہی ہیں۔ تاکہ مہاجرین کو ان دوکانوں سے سرکاری بھاؤ پر راشن مل سکے۔ یہ دوکانیں بہت سے ضلعوں میں کھُل چکی ہیں۔ اور باقی مقامات پر بھی جلد کھُلنے والی ہیں۔

مہاجرین کی تندرستی

اول دن سے مہاجرین کی صحت کا خیال حکومت کو تھا۔ اس لئے سندھ گورنمنٹ نے ۶۲ لاکھ ٹکیاں ملیریا بخار کو روکنے کے لئے سندھ کے مختلف ضلعوں میں بھیج دی تھیں۔ اب جگہ جگہ سرکاری افسر پھر کر دیکھ رہے ہیں کہ آیا یہ ٹکیاں مہاجرین تک پہنچ بھی رہی ہیں یا نہیں۔ اس کے علاوہ پچاس ہزار بخار کی ٹکیاں مرکزی حکومت کے افسروں کو بھی دی گئی ہیں۔ تاکہ یہ خود مہاجرین کو جا کر تقسیم کرائیں۔ حکومتِ سندھ نے ان ٹکیوں کے استعمال کے متعلق اشتہار چھاپ کر تقسیم کئے ہیں۔ اور اب فیصلہ ہوا ہے کہ ڈاکخانوں میں بھی بخار کی ٹکیاں بکا کریں گی۔

سندھ کی حکومت کی طرف سے اس وقت ۹ ڈاکٹر مختلف ضلعوں کا دورہ کر رہے ہیں۔ ان میں پانچ ڈاکٹر حیدرآباد کے ضلع میں ہیں۔ اور ایک ایک ڈاکٹر دادو۔ لاڑکانہ۔ سکھر اور جیکب آباد کے علاقوں میں تعینات ہوا ہے تاکہ ہر وقت دورہ کرتا رہے۔ اور مریضوں کو دیکھتا رہے۔ اس کے علاوہ حکومتِ سندھ نے ۹۰ ڈاکٹر اور ۱۳۵ حکیم مقرر کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ تاکہ دُور دراز علاقوں میں جا کر یہ مریضوں کا علاج کر سکیں۔ ہر ڈاکٹر یا حکیم کا ایک خاص علاقہ مقرر ہے۔ اور اس کا فرض ہے کہ اپنے علاقے میں جا کر مریضوں کی حالت کا ملاحظہ کرے۔

اس موقعہ پر میں برطانوی ریڈ کراس سوسائٹی کا بھی خاص طور سے ذکر کرنا چاہتا ہوں کہ اس سوسائٹی نے حیدرآباد سندھ میں بہت کام کیا ہے۔ حیدرآباد سندھ میں اس سوسائٹی کے ہسپتال میں ۹۰ مریضوں کی رہائش کا انتظام ہے اس کے علاوہ سوسائٹی کی طرف سے دُور دُور کے اضلاع میں بھی کام ہوتا ہے۔ چنانچہ تھرپارکر اور ہالہ میں ریڈ کراس نے بہت عُمدہ خدمت مہاجرین کی انجام دی ہے۔ افسوس ہے کہ اگلے مہینہ سے یہ سوسائٹی حیدرآباد سندھ کا ہسپتال بند کر رہی ہے۔ مگر کوشش کی جا رہی ہے کہ یہ ہسپتال سندھ حکومت کے قبضہ میں چلا جائے۔ تاکہ یہ نیک کام اسی طرح سے جاری رہے۔ ۵ راکتوبر سے لے کر ۳۰ نومبر تک ریڈ کراس کے ہسپتالوں میں ۷ ہزار سے زیادہ مریض علاج کرانے کے لئے آئے۔ صرف اسی سے اس کے کام کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

مہاجرین اور آباد کاری

سندھ میں آباد کاری کے کام کا حال سننے سے آپ نے فیصلہ کر لیا ہوگا کہ اس صوبہ میں یہ کام کس خوش اسلوبی سے ہو رہا ہے۔ مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ سندھ میں آباد کاری کا کام مکمل ہو گیا۔ اور سب افسروں اور مہاجرین کو اطمینان سے بیٹھ جانا چاہیئے۔ فی الحقیقت ابھی آباد کاری کے کام کا صرف تھوڑا سا حصہ پورا ہوا ہے۔ اور بہت سا کام ابھی باقی ہے۔ جہاں ہمیں اُن افسروں اور انصار کی تعریف کرنی چاہیئے کہ جنہوں نے اس نیک کام میں مہاجرین کی مدد کی ہے۔ وہاں بہت سے ایسے لوگ بھی موجود ہیں۔ جو اب تک اس کام میں روڑے اٹکا رہے ہیں۔ اور قدم قدم پر مشکلات پیدا کرنی چاہتے ہیں۔ بہت سی ایسی شکایتیں بھی آئی ہیں۔ کہ مہاجرین کو زمین الاٹ کرنے کا کام جس طرح ہونا چاہیئے تھا ایسا نہیں ہوا۔ مختار کار نے اپنی ذمہ داری کا احساس نہیں کیا۔ یا مقامی لوگوں نے مہاجرین کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔ بعض جگہ سے یہ بھی شکایت آئی ہے کہ مہاجرین نے حکومت کے ساتھ تعاون نہیں کیا۔ بلکہ افسروں کی ہدایت کے باوجود جس علاقہ میں اُنہیں آباد ہونا تھا وہاں سے چلے آئے۔

ایسے مہاجرین سے کسی کو ہمدردی نہیں ہو سکتی۔ اور یقیناً ایسے لوگ دوسرے مہاجرین کے لئے مشکلات پیدا کرتے ہیں۔ میں بار بار اپنی تقریروں میں کہہ چکا ہوں کہ آباد کاری کا سوال کوئی آسان کام نہیں۔ اگر ایک گھر میں دو کی جگہ چھ آدمی آجاتے ہیں تو صاحبِ خانہ کو ان کے کھانے پلانے میں کس قدر مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہاں تو حکومت کے سامنے ۶۰۔ ۷۰ لاکھ مہاجرین کا سوال ہے۔ ایسی صورت میں ہر شخص کا خیال رکھنا ناممکن ہے، اور جب تک مہاجرین حکومت کے ساتھ تعاون نہیں کریں گے یہ مسئلہ حل نہیں ہو سکتا۔

دوسری بات آج میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جب سے مہاجرین نے سُنا ہے کہ وزیر مہاجرین ہر مہاجر کی مدد کے لئے طیّار ہیں۔ کسی کو ذرا شکایت ہوتی ہے۔ تو سیدھا کراچی کا رُخ کر لیتا ہے۔ ایسے مہاجرین کو معلوم ہونا چاہیئے کہ وزیرِ مہاجرین ساٹھ ستّر لاکھ مہاجرین میں سے ہر شخص سے الگ الگ نہیں مل سکتے۔ اس لئے مہاجرین کو شکایت کے لئے کراچی آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ پاکستان گورنمنٹ کے افسر ہر ضلع میں مقرر ہیں۔ اُن سے یہ شکایت کر سکتے ہیں۔ یہ افسر مہاجرین کے حقوق کی حفاظت کے لئے مقرر کئے گئے ہیں۔ کراچی آنے سے مہاجرین کو کوئی خاص فائدہ نہیں ہو سکتا۔

کچھ مہاجرین اپنی زمین چھوڑ کر دوسرے ضلعوں میں صرف اس امید پر چلے جاتے ہیں کہ شاید وہاں اچھی زمینیں مل سکیں گی۔ یہ خیال بھی بالکل غلط ہے۔ مہاجرین کو جس جگہ حکومت نے بھیجا ہے انہیں وہیں رہنا چاہیئے دوسرے علاقے میں جانے سے حکومت کا سارا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے۔ اور مہاجرین کو وہاں زمین بھی نہیں ملتی۔ اسی طرح سندھ سے مغربی پنجاب واپس جانے والے مہاجرین کو بھی کسی قسم کی زمین ملنے کی اُمید نہیں رکھنی چاہیئے۔ مغربی

پنجاب میں جس قدر زمینیں مل سکتی تھیں مہاجرین کو مل چکیں۔ اب وہاں کوئی زمین الاٹ ہونے کے لئے باقی نہیں بچی۔
مہاجرین کو بچوں کی طرف سے بھی غافل نہیں ہونا چاہیئے۔ جو مہاجر بچوں کو پڑھا سکتے ہیں۔ انہیں چاہیئے کہ فوراً چھوٹے چھوٹے مدرسے کھول دیں۔ تاکہ بچوں کی تعلیم کا سلسلہ قائم رہے۔ اس سلسلہ میں حکومتِ پاکستان بھی مہاجرین کی مدد کرنے کو تیار ہے۔ اور حکومت کے افسر اس قسم کے اسکولوں کو کامیابی سے چلانے کے لئے مہاجرین کی مدد کر رہے ہیں۔

کراچی میں بسنے والے مہاجرین

(۱۸ نومبر ۱۹۴۸ء)

دو مہینے سے ہر ہفتے میں آپ کو مہاجرین کا حال سُنا رہا ہوں۔ اور ہر جمعرات کو آپ پاکستان کے ایک نئے علاقہ کی میرے ساتھ سیر کر لیتے ہیں کبھی مہاجرین کو لاہور کے کیمپوں سے سندھ روانہ ہوتے آپ دیکھتے ہیں کبھی صوبہ سرحد میں مہاجرین کے بسانے کا حال سنتے ہیں۔ کسی ہفتہ آپ کو میں مہاجرین کی کونسل کے اجلاس میں لے جاتا ہوں۔ اور کبھی آپ میرے ساتھ سندھ کے اندرونی علاقے میں مہاجرین کے بسانے کا حال دیکھتے ہیں۔

ایک صاحب نے ریڈیو پر میری تقریریں سننے کے بعد لکھا ہے کہ آپ نے ہمیں وزیر مہاجرین آنریبل خواجہ شہاب الدین کے ہمراہ پاکستان کے دیگر علاقوں کی تو سیر کرادی لیکن اب تک کراچی کا کچھ حال نہیں سُنایا۔ حالانکہ آپ کراچی میں رہتے ہیں۔ اور اس وقت تمام پاکستان کی نگاہیں کراچی پر لگی ہوئی ہیں۔

ان صاحب نے میرے دل کی بات کہہ دی میں خود بھی کراچی کا حال آپ کو سُنانا چاہتا تھا۔ مگر اس سے پہلے پاکستان کے دوسرے علاقوں اور خصوصاً مغربی پنجاب میں مہاجرین کے مسئلے سے آپ کو واقف کرانا ضروری سمجھتا تھا۔ لیجئے آج آپ میرے ساتھ کراچی کی سیر کیجئے۔

پاکستان بننے سے پہلے کراچی کی آبادی مشکل سے ساڑھے تین چار لاکھ کے قریب تھی۔ اس وقت کراچی میں دس لاکھ سے زیادہ آدمی بستے ہیں۔ جون ۱۹۴۸ء میں مردم شماری کرنے والوں نے اندازہ لگایا تھا۔ کہ اُس وقت تک پونے پانچ لاکھ مہاجر کراچی آچکے تھے۔ مہاجرین کی تعداد ہر روز کراچی میں بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ اس لئے اب اگر کوئی یہ کہے کہ ۱۰ لاکھ میں سے ۷، ۸ لاکھ صرف مہاجر ہیں تو اسے مبالغہ مت سمجھئے۔ اس کے علاوہ دوسری دلچسپ بات یہ ہے کہ جون کے مہینے تک تمام سندھ میں کل ۷ لاکھ کے قریب مہاجر آئے تھے۔ اور ان

۷ ۱لاکھ میں سے پونے پانچ لاکھ مہاجر کراچی کے حصے کے تھے۔

کراچی پاکستان کا پایۂ تخت ہے۔ کراچی پاکستان کی سب سے بڑی بندرگاہ ہے۔ اور کراچی پاکستان کا سب سے بڑا شہر ہے۔ صرف اسی لحاظ سے اس کی اہمیت کا اندازہ لگا لیجئے۔ تجارت۔ کاروبار۔ لین دین۔ حکومت کے کارخانے۔ غیر ملکی سفارت خانے اور پھر ایشیاء کا سب سے بڑا ہوائی مرکز۔ جہاں چوبیس گھنٹہ میں سوسو ہوائی جہاز اترتے ہیں۔ ان خصوصیات نے کراچی کو دنیا کے بڑے شہروں کے مقابلے میں لاکر کھڑا کر دیا ہے۔

کراچی کے بازاروں میں پاکستان بننے سے پہلے بھی چہل پہل ضرور تھی۔ مگر اب تو یہ عالم ہے کہ دہلی۔ آگرہ۔ لکھنؤ۔ الہ آباد۔ کانپور۔ بمبئی اور ہندوستان کے دوسرے شہروں کی تمام رونق ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کراچی میں کھنچ کر چلی آئی ہے۔ لاہور اور کراچی میں مہاجرین کے نقطۂ نظر سے ایک بڑا فرق یہ ہے۔ کہ لاہور میں مشرقی پنجاب کی خونریزی کے بعد مہاجرین لاکھوں کی تعداد میں بے تحاشہ آ گئے تھے۔ کراچی میں مہاجرین سمجھ بوجھ کر آئے ہیں اور چونکہ یہ حکومت کا مرکز ہے۔ اس لئے یا تو ایسے لوگ آئے ہیں جن کا تعلق براہِ راست یا کسی اور ذریعے سے حکومت سے ہے۔ یا تجارت کی سب سے بڑی منڈی ہونے کی وجہ سے ایسے مہاجر یہاں آئے ہیں جو تجارتی کاروبار کرنا جانتے تھے۔ چنانچہ کراچی کے بازاروں اور منڈیوں پر مہاجرین کا قبضہ ہے۔ اور کاروبار کے اعتبار سے مہاجرین نے اپنے لئے جگہ پیدا کر لی ہے۔

کراچی میں مہاجرین کو سب سے زیادہ تکلیف مکانات کی ہے۔ آپ خود ہی غور کر لیجئے کہ جس شہر میں پہلے مشکل سے چار لاکھ آدمی رہتے تھے۔ اُس میں اب دس لاکھ سے اُوپر کی آبادی ہے۔ کہاں تک رہائشی مکانوں کو کھینچا جا سکتا ہے۔ جب سے کراچی حکومتِ پاکستان کے اختیار میں آئی ہے۔ حکومت کے اراکین کو سب سے بڑی مشکل مکانوں کے متعلق پیش آ رہی ہے۔ لیکن جب تک نئے مکانات نہیں بن جاتے۔ اُس وقت تک یہاں مہاجرین کا مسئلہ حل نہیں ہو سکتا۔ خدا کا شکر ہے کہ کراچی میں مکانات بنانے کے لئے زمینوں کی کمی نہیں۔ جدھر نکل جائیے سمندر کو چھوڑ کر باقی سب جگہ زمین ہی زمین ملے گی۔ چنانچہ حکومت نے اس سوال پر غور کرنا شروع کر دیا ہے۔ اور بہت جلد مکانات بننے کا پروگرام بھی شروع ہو جائے گا۔ وزیر مہاجرین چونکہ وزیر داخلہ بھی ہیں۔ اور کراچی انہی کے ماتحت ہے۔ اس لئے مہاجرین کی اس تکلیف کا انہیں پُورا احساس ہے۔ اور اس بارے میں ان کے احکامات جاری ہو چکے ہیں۔ ایک دفعہ جب مکانات بننے شروع ہو گئے تو مہاجرین کو روزگار اور مکان دونوں مل جائیں گے۔

کراچی میں اس وقت بہت سے مہاجرین کیمپوں اور اسکولوں کی عمارتوں میں رہتے ہیں۔ حاجی کیمپ شروع میں صرف اُن لوگوں کے لئے بنا تھا جو حج کرنے کے ارادے سے کراچی آتے ہیں یا حج سے واپسی پر کراچی ٹھہرتے

ہیں مگر مہاجرین کی مشکلات کو دیکھتے ہوئے حاجی کمپ مہاجرین کو مل گیا۔ اب کراچی شہر سے باہر میدان میں ایک نیا کمپ بنایا گیا ہے۔ جہاں آہستہ آہستہ مہاجرین آباد ہو رہے ہیں۔ اور حاجی کمپ خالی کرایا جا رہا ہے۔ نئے کمپ کو پہلے جب لوگوں نے جا کر دیکھا تو بہت ناک بھوں چڑھائی۔ کہ شہر سے کہاں جنگل میں لا کر ڈال دیا۔ مگر کمپ کے منتظم مسکرائے اور کہا کہ اس نئے شہر کو بستے دیر نہیں لگے گی۔ چنانچہ یہی ہوا۔ وہی جنگل بیابان کہ جہاں پہلے ہُو کا عالم تھا۔ اب ایک نیا شہر بن گیا ہے۔ کمپ کے آس پاس مہاجرین نے دوکانیں لگالیں منڈی۔ بازار سب کچھ یہیں بن گیا۔ اس نئی آبادی میں ایسی رونق رہتی ہے کہ شہر کی رونق کو مات کرتی ہے۔ بہت سے مہاجرین نے قائدِ اعظم کے مزار کے آس پاس جو میدان خالی پڑا تھا۔ اس میں عارضی طور سے چھپر ڈال لئے ہیں۔ فی الحال انہیں سر چھپانے کے لئے ٹھکانہ تو ضرور مل گیا۔ مگر یہاں گورنمنٹ ایک عالیشان جامع مسجد اور مزار کی عمارت بنانے والی ہے۔ اس لئے دیر سویر مہاجرین کو اس میدان سے اپنے چھپر اوٹھانے پڑیں گے۔

کراچی میں کوئی ایسی بڑی جامع مسجد نہیں کہ جہاں مسلمانوں کی اتنی بڑی تعداد نماز ادا کر سکے۔ یہی حال عید کے موقعہ پر ہوتا ہے۔ پچھلے سال جب پاکستان بنا ہے۔ کراچی کی عید گاہ میں نمازِ عید ادا ہوئی۔ مگر نمازیوں کا یہ عالم تھا کہ عید گاہ سے باہر دُور دُور تک سڑک پر لوگ صفیں باندھے نماز پڑھ رہے تھے۔ اس سال عید الفطر کی نماز ایک اور میدان میں ہوئی یہ بھی چھوٹا رہا۔ آخر عید الضحیٰ کی نماز کے لئے قائدِ اعظم کے مزار والا میدان تجویز ہوا۔ یہ نمازیوں کے لئے بہت مناسب رہا۔ اور اس موقعے پر کراچی کے حکّام کا انتظام بھی اتنا عمدہ تھا کہ سب نے انہیں دُعائیں دیں۔

کراچی شہر پر مہاجرین اس طرح چھائے ہیں کہ اب کراچی کی پرانی خصوصیات ذرا ڈھونڈے سے ہی ملتی ہیں۔ اور بعض دفعہ تو صدر سے گذرتے ہوئے بالکل جامع مسجد کی سی فضا کا احساس ہوتا ہے۔ حد یہ ہے کہ جامع مسجد کی سیڑھیوں پر کباب بیچنے والے اور دوسرے دوکاندار بھی ہجرت کر کے کراچی چلے آئے ہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ میاں بہشتی کے کٹورے کی جھنکار اب کراچی میں بھی سننے میں آتی ہے۔ جسے سُن کر بے اختیار دِلّی یاد آجاتی ہے۔ اور دل اکثر یہ سوال کرتا ہے کہ کیا اب بھی جامع مسجد کے سامنے بہشتی اُسی طرح کٹورے چھنکا کر پیاسوں کو پانی پلاتے ہوں گے۔

مہاجرین اپنے ساتھ بہت سی دستکاریاں اور صنعتیں بھی ہندوستان سے لائے ہیں۔ اور ضرورت ہے کہ انہیں بہت جلد کراچی میں بسا دیا جائے۔ آگرہ کبھی زمانہ میں ایشیا میں جفت سازی کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ جہاں تقریباً ایک ہزار بڑے کارخانوں میں جُوتے بنتے تھے۔ اور دس ہزار کے قریب چھوٹے چھوٹے کارخانے تھے جن میں تین لاکھ کے قریب کاریگر کام کرتے تھے۔ اب ان میں سے ایک بہت بڑی تعداد تاجروں اور کاریگروں کی کراچی آگئی ہے اور یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ انہوں نے کراچی میں اپنے لئے جگہ بنالی ہے۔ جوتہ بنانے والوں اور اس کی تجارت کرنے

والوں نے ایک باقاعدہ انجمن قائم کی ہے۔ اور اس کے ذریعے سے مہاجرین کاریگروں کو بسایا جا رہا ہے۔ یہی کوشش دُوسری دستکاریوں کے متعلق بھی کی جا رہی ہے۔ تاکہ کاریگر اپنے ہنر سے پاکستان کی شہرت اور ترقی میں برابر کا حصہ لے سکیں۔

حکومتِ پاکستان نے دو کروڑ روپیہ کے سرمایہ سے ایک فنانس کارپوریشن قائم کی ہے۔ اس کارپوریشن کا مقصد یہ ہے کہ کاریگروں۔ دستکاروں اور صنّاعوں کو مالی امداد دے کر پاکستان میں بسایا جائے۔ اس کے افسر سندھ اور مغربی پنجاب کا بھی دورہ کرتے ہیں۔ اور جہاں تک ممکن ہوتا ہے مہاجر صناعوں کی مدد کرتے ہیں مثلاً جن مہاجر عورتوں کو سینا پرونا آتا ہے۔ اور غُربت کی وجہ سے سینے کی مشین نہیں خرید سکتیں۔ انہیں یہ کارپوریشن اپنے پاس سے قرضہ پر مشین خرید کراتی ہے۔ چرخے بھی مہاجرین کو دیئے جاتے ہیں۔ دوکانداروں کو دوکانیں کرنے کے لئے چھوٹی چھوٹی رقمیں بھی قرض کے طور پر ملتی ہیں۔

جن مہاجرین کو اِس سلسلہ میں کچھ دریافت کرنا ہو۔ انہیں چاہیئے کہ پاکستان ریفیوجی فنانس کارپوریشن کے دفتر واقع کاٹن ایکسچینج بلڈنگ میکلوڈ روڈ کراچی سے معلومات حاصل کریں۔ اس کارپوریشن کے دفتر سے امدادی کاموں میں مہاجرین کی ہر طرح مدد کی جائے گی۔

جس طرح لاہور میں مہاجرین کے امدادی کاموں کی مختلف انجمنیں قائم ہیں۔ کراچی میں بھی قومی کام کرنے والوں نے بہت سے ادارے اس قسم کے قائم کئے ہیں مثلاً مس فاطمہ جناح انڈسٹریل ہوم میں عورتوں کو صنعت و حرفت سکھائی جاتی ہے۔ مگر کراچی جیسے بڑے شہر کے لئے اس قسم کے اور بہت سے اداروں کی ابھی ضرورت ہے۔ ہماری بہنیں جو فرصت نکال سکتی ہیں۔ انہیں چاہیئے کہ لاہور کے قصرِ استقلال اور گنگارام ہوم کی طرح کراچی میں بھی عورتوں کو صنعت اور دستکاری سکھانے کے کئی مرکز قائم کر دیں۔ کراچی میں مجاہدینِ کشمیر کے امدادی فنڈ کا کام بیگم لیاقت علی خاں کی سرپرستی میں خاص طور سے بہت زور شور سے ہو رہا ہے۔ کشمیر میں مجاہدین کے لئے کراچی کی خواتین نے سردی کے کپڑے، موزے اور سویٹر وغیرہ ہزاروں کی تعداد میں طیّار کئے تھے۔ اور انہیں تقسیم کرنے کے لئے کراچی کی خواتین کی طرف سے بیگم خواجہ شہاب الدین اور دوسری خواتین کراچی سے راولپنڈی تشریف لے گئیں تھیں۔

کراچی میں مہاجرین کو مکانوں کی قلّت کے بعد دوسری تکلیف اسکولوں کی کمی کی وجہ سے تھی۔ پچھلے سال پاکستان گورنمنٹ نے چند اسکول کراچی میں کھولے تھے۔ مگر یہ صرف سرکاری ملازمین کے بچوں کے لئے تھے۔ اس لئے مہاجرین کی تکالیف کا فوراً کوئی ازالہ نہیں ہو سکا۔ کیونکہ اسکول کی عمارتوں پر مہاجرین کا قبضہ تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ کراچی کے اسکولوں کی عمارتیں خالی کرائی گئی ہیں۔ اور ان عمارتوں میں نئے اسکول کھلنے کا بندوبست کیا جا رہا ہے۔

لاہور کے بعد کراچی اُردو اخبارات کا پاکستان میں سب سے بڑا مرکز ہے۔ اور یہ سب اخبار مہاجرین ہی کے

ہیں۔ پاکستان بننے سے پہلے کراچی میں مشکل سے ہی کوئی عمدہ اُردو کا اخبار یا رسالہ نکلتا ہوگا۔ اب یہاں سے متعدد اخبار اور اعلیٰ پیمانے کے اُردو کے رسالے شائع ہوتے ہیں۔ شہر میں اُردو ادب کی ترقی اور ترویج کے لئے بہت سی ادبی انجمنیں اور مجلسیں قائم ہیں۔ جہاں ہر ہفتے ادبی مباحث پر دلچسپ تقریریں ہوتی ہیں۔ غرض ہر اعتبار سے کراچی کی زندگی دلچسپ بن رہی ہے۔ لوگوں کو مشکلات کا سامنا ضرور کرنا پڑتا ہے۔ لیکن وُہ لوگ جو دوسرے شہروں میں مہاجرین کی کیفیتوں کا اندازہ لگا چکے ہیں۔ وُہ جانتے ہیں کہ پاکستان کا پایۂ تخت کراچی کتنا پُرسکون شہر ہے ۭ

مہاجرین کی دُوسری عید

(۱۴ اکتوبر ۱۹۴۸ء)

آج تمام دنیا کے مسلمانوں کے ساتھ پاکستان کے مسلمانوں نے بھی عید منائی لیکن پاکستان کے مسلمانوں کے لئے یہ کہنا کہ اُنہوں نے عید منائی درست نہیں۔ یہ عید کی نمازمیں ضرور شریک ہوئے۔ انہوں نے قربانی کا فریضہ بھی ادا کیا مگر پاکستان کے کسی شہر یا قصبہ میں وُہ رونق اور چہل پہل نظر نہیں آئی جو عید کے موقعہ سے وابستہ ہے کراچی میں عید کی نماز آج اس میدان میں پڑھائی گئی۔ کہ جہاں قائدِ اعظم کا مزار ہے۔ نماز عید پڑھنے کے لئے ہمارے گورنر جنرل خواجہ ناظم الدین بھی شریک تھے۔ نماز کے بعد ہزاروں زائرین قائدِ اعظم کے مزار پر فاتحہ پڑھنے کے لئے گئے۔

قائدِ اعظم کی وفات کا زخم ابھی سب کے دل پر ہرا ہے۔ اور ہماری آنکھیں ان آنسوؤں سے ابھی تک تر ہیں۔ جو قوم نے اس سانحے پر بہائے تھے۔ اس لئے عید الضحےٰ کے موقعہ پر ہمارے گھروں میں اس سال وُہ خوشیاں نہیں منائی جائیں گی۔ جو عید کی تقریبِ سعید پر مسلمان گھروں میں عموماً نظر آتی ہیں۔ لیکن عید الضحےٰ حضرت ابراہیمؑ خلیل اللہ کی جس قربانی کی یاد میں منائی جاتی ہے وُہ پیغام ہمارے لئے آج بھی اتنی ہی اہمیت رکھتا ہے۔ خداوند کریم کے حکم کے سامنے اُس کے ایک برگزیدہ اور پاک بندے کا سرِ تسلیم خم کرنا مسلمانوں کے لئے ایک اسوۂ حسنہ ہے اور تاریخ کے ہر دور میں مسلمانوں نے اپنی قربانیوں سے ثابت کر دیا ہے کہ مسلمان ہر وقت خدا کی راہ میں بڑی سے بڑی قربانی دینے کے لئے طیار ہیں۔

آج حجاز مقدس کی سرزمین پر وادیٔ عرفات میں دنیا کے ہر گوشہ سے لاکھوں مسلمان اس صدائے حق کو دُہرانے کے لئے جمع ہوئے جو اب سے ہزاروں سال پہلے حضرت ابراہیمؑ کے لبوں پر تھی۔ قربانی کا یہ پیغام پاکستان کے مسلمانوں کے لئے آج اور بھی زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ کیونکہ قائدِ اعظم کی وفات کے بعد ہمارے فرائض پہلے سے کہیں

زیادہ بڑھ گئے ہیں اور پاکستان والوں کو آج ہر قربانی کے لئے طیار رہنا چاہیئے۔ ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ لاکھوں مہاجرین نے پاکستان کے لئے کتنی زبردست قربانی دی ہے۔ ہمیں آج عہد کرنا چاہیئے کہ ہم ان بے در اور بے گھر مہاجرین کو پاکستان میں آباد کرنے کے لئے کسی قسم کی قربانی اور ایثار سے دریغ نہیں کریں گے تاکہ ہمارے ہادی حضرت **محمدؐ** صلی اللہ علیہ وسلّم کے فرمان کے بموجب انصار اور مہاجرین میں کوئی فرق نہ رہے۔

وزیرِ اعظم اور مہاجرین

پچھلے ہفتے ہمارے وزیرِ اعظم مسٹر لیاقت علی خاں ایک بہت ضروری کانفرنس میں شریک ہونے کے لئے ہوائی جہاز سے لندن تشریف لے گئے تھے۔ راستہ میں یہ چند گھنٹہ قاہرہ میں بھی ٹھہرے۔ قاہرہ میں ایک اخباری نمائندے کو بیان دیتے ہوئے پاکستان کے وزیرِ اعظم نے جہاں اور بہت سی باتوں کا ذکر کیا۔ وہاں مہاجرین کے مسئلے پر بھی روشنی ڈالی مسٹر لیاقت علی خاں نے فرمایا:-

"پاکستان میں مہاجرین کو بسانے کا سوال اتنا زبردست ہے کہ اس کی مثال تاریخ میں اور کہیں نہیں ملتی۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ مشکل مسئلہ ایک بہت بڑی حد تک حل ہو چکا ہے اور ہمیں امید ہے کہ آئندہ ایک سال کے اندر ہم ۷۰ لاکھ مہاجرین کو بسانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔"

لندن کی جس کانفرنس میں مسٹر لیاقت علی خاں شریک ہونے کے لئے تشریف لے گئے ہیں وہ بہت ضروری باتوں پر غور کرے گی۔ لندن کے راستہ میں جب ہمارے وزیرِ اعظم قاہرہ ٹھہرے تو اس وقت بھی اخبار کے نمائندوں نے انہی ضروری مسئلوں کے متعلق سوال کئے جو اس وقت دنیا کے سامنے پیش ہیں۔ ایسے نازک موقعہ پر ہمارے وزیرِ اعظم کا مہاجرین کے مسئلے کا ذکر اس بات کی ضمانت ہے کہ پاکستان کی حکومت مہاجرین کے بسانے کے سوال کو بے حد ضروری سمجھتی ہے۔ اور ہمارے وزیرِ اعظم دوسری سیاسی گتھیوں کو سلجھاتے وقت بھی مہاجرین کے مسئلے کو نظر انداز نہیں کرتے۔ بلکہ قاہرہ میں جہاں پاکستان کی اور باتوں کا ذکر کرتے ہیں۔ وہاں مہاجرین کے مسئلے کے متعلق بھی وضاحت سے بیان دیتے ہیں۔

یہ واقعی مہاجرین کی خوش قسمتی ہے کہ ہماری حکومت کے وزیرِ اعظم اور تمام دوسرے ذمے دار ارکان اس مشکل مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اور اب تمام دنیا نے دیکھ لیا کہ جس طرح قائدِ اعظمؒ نے اپنے پیغام میں جشنِ آزادی کے موقعہ پر اس مسئلہ کو سب سے زیادہ ضروری قرار دیا تھا۔ ان کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے پاکستان کے وزیرِ اعظم نے قاہرہ میں اعلان کر دیا کہ اگرچہ تاریخ میں مہاجرین کا مسئلہ اپنی مثال نہیں رکھتا۔ لیکن پاکستان کی حکومت اس مشکل مسئلہ کو ایک سال کے اندر حل کرنے کا فیصلہ کر چکی ہے۔ اور آئندہ سال انشا اللہ ۷۰ لاکھ مہاجرین کی آبادکاری کا سوال حل ہو جائے گا۔

کارخانے اور فیکٹریاں

مغربی پنجاب میں بہت سے کارخانے اور فیکٹریاں غیر مسلم مالکوں کی تھیں۔ یہ لوگ پاکستان بننے کے بعد ہندوستان چلے گئے اور قانون کے مطابق ان کے کارخانوں پر پاکستان کی حکومت نے قبضہ کر لیا۔ جب تک ہندوستان اور پاکستان کا غیر منقولہ جائدادوں کے متعلق فیصلہ نہیں ہو جاتا یہ کارخانے حکومتِ پاکستان کی تحویل میں رہیں گے۔ اور حکومت انہیں چلانے کے لئے لوگوں کو ٹھیکے پر دے گی۔

کچھ لوگوں کو پچھلے سال فیکٹریاں الاٹ کرنے کی پالیسی پر اعتراض تھا۔ چنانچہ پچھلے مہینے جب وزیرِ مہاجرین خواجہ شہاب الدین لاہور کے دورے پر گئے۔ تو چند لوگوں نے ان کی توجہ فیکٹریوں اور کارخانوں کی الاٹمنٹ کی طرف مبذول کرائی۔ خواجہ صاحب نے اس بارہ میں ایک ضروری اعلان جاری کیا ہے۔ جس سے گورنمنٹ کی پالیسی کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ چنانچہ میں اس اعلان کے چند ضروری حصے پیش کرتا ہوں۔

"کارخانے اور کارخانوں کی صنعتیں پاکستان کی زندگی کے لئے بے حد ضروری ہیں۔ اور حکومتِ پاکستان نے فیصلہ کیا ہے کہ ان کارخانوں اور صنعتوں کو فوراً بحال کر دیا جائے۔ گورنمنٹ کی نظر میں سب سے ضروری بات یہ ہے کہ کارخانوں کو چلایا جائے۔ اور یہ کارخانے ایسے لوگوں کو الاٹ کئے جائیں جنہیں کارخانے چلانے کا تجربہ ہو۔ اور کارخانہ چلانے کے لئے ان کے پاس وسائل موجود ہوں۔ اگر یہ اوصاف کسی مہاجر میں موجود ہیں تو یقیناً ایسے مہاجر کو کارخانہ الاٹ کرتے وقت ترجیح دی جائے گی۔ لیکن اگر کوئی مہاجر جسے نہ تو کارخانہ چلانے کا تجربہ ہے اور نہ اس کے پاس اتنا روپیہ ہے کہ کارخانہ چلا سکے تو پھر گورنمنٹ اس کی درخواست پر غور نہیں کر سکتی۔ یہ درست ہے کہ گورنمنٹ مہاجرین کی مدد کا اعلان کر چکی ہے۔ اور جہاں تک ممکن ہوا ہے گورنمنٹ نے مہاجرین کی مدد کی ہے لیکن کارخانے اور صنعتیں پاکستان کی دولت ہیں۔ انہیں قائم رکھنا ہماری خوشحالی کے لئے ضروری ہے۔ اور یہ اُسی صورت میں ممکن ہے کہ کارخانے صحیح قسم کے لوگوں کے ہاتھ میں ہوں۔ حکومت یہ بھی نہیں چاہتی کہ لوگ ان کارخانوں کے ذریعے لکھ پتی بن جائیں۔ اس لئے فیصلہ ہوا ہے کہ کارخانوں پر ایک قسم کا ٹیکس لگایا جائے تاکہ کارخانوں کی آمدنی اور منافع کا ایک حصہ حکومت کو واپس مل جائے۔"

پاکستان گورنمنٹ نے کارخانوں کو الاٹ کرنے کے لئے ایک کمیٹی مقرر کی تھی۔ پچھلے مہینہ کراچی میں اس کمیٹی کی رپورٹ پر پاکستان مغربی پنجاب مہاجرین کونسل نے غور کیا۔ اور جن کارخانوں کا الاٹمنٹ درست نہیں سمجھا گیا ان کا معاملہ پھر ایک کمیٹی کے سپرد کر دیا گیا۔ جن کارخانوں کا الاٹمنٹ منظور ہو چکا ہے۔ ان کے لئے احکام جاری ہو گئے ہیں۔ تاکہ فوراً یہ اپنا کام شروع کر دیں۔ اس سلسلہ میں بہت سے ضرورت مند اصحاب وزیرِ مہاجرین سے ملنے کے لئے کراچی آتے ہیں۔ ان کی اطلاع کے لئے کہا جاتا ہے کہ وزیرِ مہاجرین اس معاملہ میں کسی شخص سے

ملاقات نہیں کرتے۔ کیونکہ یہ معاملہ ایک کمیٹی کے سپرد ہے۔ اور کمیٹی کی سفارشات مہاجرین کونسل کے سامنے رکھی جائیں گی۔

روزگار دلانے والے دفتر

حکومتِ پاکستان نے بیکار مہاجرین کے لئے بڑے بڑے شہروں میں نوکری دلانے والے دفتر کھولے ہیں۔ انہیں انگریزی میں ایمپلائمنٹ ایکسچینج کہتے ہیں۔ اور ان دفتروں کی خوبی یہ ہے کہ بغیر کسی فیس یا معاوضے کے بیکار مہاجرین کو نوکری دلانے کا فرض انجام دیتے ہیں۔ ہر ایک شہر میں اس دفتر کی شاخیں قائم ہیں۔ جہاں مہاجرین جاکر اپنا نام لکھا سکتے ہیں۔ گورنمنٹ کے دفتروں میں۔ تجارتی کوٹھیوں میں۔ کارخانوں میں ملوں میں جہاں کہیں ملازموں کی ضرورت ہوتی ہے وہاں سے ایک خط اس دفتر کے نام آجاتا ہے۔ اس دفتر والے مناسب اور موزوں مہاجر کا نام اپنی سفارش کے ساتھ بھیج دیتے ہیں۔ اور اس طرح بہت سے مہاجروں کو ملازمتیں مل چکی ہیں۔

ابھی کچھ دن ہوئے وزیرِ مہاجرین آنریبل خواجہ شہاب الدین کراچی کے نوکری دلانے والے دفتر کا معائنہ کرنے گئے تھے۔ وہاں ہر روز صبح سے شام تک ملازمتیں ڈھونڈنے والوں کا جمگھٹا لگا رہتا ہے۔ ایک طرف موٹر ڈرائیوروں اور مشین کے پرزوں سے واقف لوگوں کے نام لکھے جارہے تھے۔ دوسرے کمرے میں دفتر کے کلرکوں کی فہرست بن رہی تھی۔ اوپر عورتوں کو ملازمت دلانے کے لئے علیحدہ لکھت پڑھت ہو رہی تھی۔ خواجہ صاحب کو ایک صاحب نے بتلایا کہ اس وقت گورنمنٹ کے محکموں میں ٹائپ کرنے والوں اور شارٹ ہینڈ کا کام جاننے والوں کی بہت کمی ہے۔ اگرچہ بیکار مہاجرین میں پڑھے لکھے نوجوان بہت ہیں۔ لیکن انہیں ٹائپ یا شارٹ ہینڈ نہیں آتا۔ اس لئے انہیں ملازمت نہیں مل سکتی۔ خواجہ صاحب نے فرمایا کہ ان نوجوانوں کو فوراً ٹائپ یا شارٹ ہینڈ کی تعلیم حاصل کرنی چاہیئے۔ ہر شہر میں ٹائپ سکھانے کی کلاسیں اگر کھل جائیں تو ایک پڑھا لکھا شخص دو مہینہ کے اندر بخوبی ٹائپ سیکھ لیتا ہے۔ اور چار مہینے میں اسے شارٹ ہینڈ لکھنا آسکتا ہے۔ اس کے بعد اسے ملازمت یقینی طور سے مل جائے گی۔ چنانچہ آج رات اگر پڑھے لکھے نوجوان مہاجر بھائی میری بات سن رہے ہوں تو انہیں چاہیئے کہ فوراً اس طرف توجہ کریں شارٹ ہینڈ سیکھنے کے بعد کسی دفتر یا تجارتی کوٹھی یا اخبار میں آپ کو آنکھیں بند کرکے عمدہ ملازمت مل سکتی ہے۔ اس کے علاوہ بعض کمشنریوں میں پٹواریوں کی سخت ضرورت ہے۔ اگر پٹواری بیکار ہوں تو انہیں چاہیئے کہ فوراً اپنا نام ملازمت دلانے والے دفتر میں لکھوادیں۔

نوکری دلانے والے دفتر نے اطلاع دی ہے کہ پاکستان بننے کے بعد سے لے کر ۲۸ اگست ۱۹۴۸ء

تک یہ دفتر ۴۱ ہزار ۲۳۰ مہاجرین کو ملازمتیں دلوا چکا ہے۔ اور صرف اگست ۱۹۴۸ء میں ۹۹۶ مہاجرین کو اس دفتر کی معرفت ملازمتیں ملی تھیں۔ پاکستان گورنمنٹ کے یہ دفتر آپ کی بے غرض خدمت کے لئے حاضر ہیں۔ اگر آپ کو کسی قسم کے ملازم کی ضرورت ہے تو فوراً اپنے ضلع کے نوکری دلانے والے دفتر کو لکھیئے یہ بہترین امیدواروں کے نام آپ کو بھیج دے گا اور اگر آپ کو ملازمت کی ضرورت ہو تو ایسی صورت میں بھی ملازمت دلانے والے دفتر میں آیئے۔ خدا نے چاہا تو آپ کی سب مشکلیں حل ہو جائیں گی ؛

صُوبہ سرحد کا سفر

اکیس ۲۱ اکتوبر کو ۳ دن کے مختصر دورے کے بعد وزیرِ مہاجرین آنریبل خواجہ شہاب الدین پشاور سے کراچی پہنچے۔ یہ تین مختصر دن۔ اور صوبہ سرحد جیسا دلچسپ اور مہمان نواز خطّہ۔ اگر موجودہ سائنس کی ایجادیں یعنی ہوائی جہاز اور موٹر انسان کے اختیار میں نہ ہوتیں تو شاید اس قدر لمبا سفر تین ہفتے میں بھی مشکل سے طے ہوتا ۱۹ اکتوبر منگل کی صبح کو آٹھ بجے ہم کراچی سے ہوائی جہاز میں صوبہ پشاور کی طرف روانہ ہوئے۔ موسم خوشگوار اور ہوا موافق تھی۔ اس لئے ہوابازوں نے بتلایا کہ یہ سفر ۴ گھنٹہ ہی میں طے ہو جائے گا۔ ابھی مشکل سے اخبار کے کاغذ اُلٹ پلٹ کئے تھے کہ ہواباز نے اندر سے کاغذ کے پُرزے پر لکھ کر بھیجا کہ اس وقت جہاز سکھر پر سے گزر رہا ہے۔ تھوڑی دیر بعد ملتان شہر پر سے گزرنے کی اطلاع آئی۔ اور اس کے بعد جو ہوائی جہاز کی کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھا تو صحرا اور ریتیلے میدان کی جگہ اُونچے اُونچے پہاڑ نظر آرہے تھے۔ گویا اب ہم صُوبہ سرحد کے اندر تھے۔ سربلند پہاڑوں کے درمیان بل کھاتی ہوئی سڑکیں نظر آرہی تھیں۔ اور کہیں کہیں دریا اور ندی نالوں کے منظر بھی دکھائی دیتے تھے۔ آدھ گھنٹہ بھی نہ گزرا تھا کہ پہاڑوں کے درمیان سبز کھیت اور گھر بھی نظر آنے لگے۔ اب خبر ملی کہ ہم کوہاٹ کے اُوپر سے گزر رہے ہیں اور پشاور پہنچنے والے ہیں۔ کوہاٹ کے اُوپر سے گزرتے ہی چند منٹ بعد پشاور کے باغات اور عمارتیں نظر آنے لگیں۔ ہوائی جہاز نے میدان کے اُوپر دو مرتبہ چکّر لگایا۔ اور سوا بارہ بجے ہوائی جہاز زمین پر اُتر آیا۔

صوبہ سرحد کے وزیرِ مہاجرین آنریبل میاں جعفر شاہ اور حکومت کے دُوسرے ارکان وزیرِ مہاجرین کے استقبال کے لئے موجود تھے۔ اس روز تیسرے پہر گورنمنٹ ہاؤس میں مہاجرین کی کونسل کا اجلاس تھا۔ اور اسی اجلاس میں شرکت کی غرض سے وزیرِ مہاجرین پشاور تشریف لائے تھے۔

۱۹ اکتوبر کے جلسہ کی صدارت حکومتِ سرحد کے گورنر نے کی۔ اور اس میں آنریبل خان عبدالقیوم خان وزیرِ اعظم صوبہ سرحد۔ آنریبل خان محمد عبّاس خاں اور آنریبل میاں محمد جعفر شاہ شریک ہوئے۔ کونسل نے فیصلہ کیا

کیا کہ صوبہ سرحد کے شہروں میں ۱۲ ہزار مہاجرین اور آباد کئے جا سکتے ہیں۔ کیونکہ غیر مسلم زیادہ تر شہروں سے گئے ہیں۔ اور جو زمینیں غیر مسلموں کی تھیں ان کو بھی پہلے سے ہی مسلمان کاشت کرتے تھے۔ اگر مہاجرین کے لئے گھر وغیرہ بنا دیئے جائیں تو زراعت کے سلسلے میں بھی ۲ ہزار مہاجرین کو آباد کیا جا سکتا ہے۔ مرکز نے صوبہ سرحد کو ۵ لاکھ روپیہ اس غرض سے دینا منظور کیا تھا کہ اسے مہاجرین کے آباد کرنے پر صرف کیا جائے۔ کونسل نے حکومتِ پاکستان سے سفارش کی کہ اس رقم میں سے ۵۰ ہزار روپیہ مہاجرین کے واسطے بیل وغیرہ خریدنے کے لئے اور ۵۰ ہزار روپیہ مکانات بنانے کے لئے صوبہ سرحد کی تحویل میں دیا جائے۔ یہ بھی طے پایا کہ صوبہ سرحد میں ایسے مہاجرین کو آباد کیا جائے جو صنعت اور دستکاری کے ماہر ہوں اور ایسے صناعوں اور دستکاروں کو کہ جن کی صوبہ سرحد میں خاص ضرورت ہے یہاں خاص طور پر لا کر بسایا جائے۔

دوسرے روز ۲۰ اکتوبر کی صبح سے جمعیۃ الانصار اور مہاجرین کے نمائندے اور دوسرے مہاجرین وزیرِ مہاجرین سے ملنے کے لئے آنے شروع ہوئے۔ اُن کی بات چیت سے مہاجرین کی تکالیف اور ان کی مشکلات کا اندازہ ہوا۔ وزیرِ مہاجرین ان کی تکالیف کے متعلق صوبہ سرحد کی حکومت سے گفتگو کریں گے۔ مہاجرین کے وفد سے ملاقات کے بعد تھوڑی دیر کے لئے وزیرِ مہاجرین صوبہ سرحد کی اسمبلی کے اجلاس کو دیکھنے کے لئے گئے اسمبلی میں حکومت کی طرف سے اس بل پر بحث ہو رہی تھی کہ شراب پینا صوبہ سرحد میں تمام مسلمانوں کے لئے ممنوع قرار دیا جائے اور شراب کے ٹیکسوں سے جو رقم ملتی تھی اس خسارے کو پورا کرنے کی غرض سے حکومت ایک اور ٹیکس لگائے۔ اسمبلی میں سب طرف سے اس بل کی حمایت میں تقریریں ہو رہی تھیں۔ اور ہر ممبر حکومت کے اس اقدام کی تعریف کر رہا تھا۔ تقریروں کے دوران میں ممبر قرآن پاک اور حدیثوں کو اس خوبی سے نقل کر رہے تھے کہ اسمبلی کے ایوان میں اسلامی شان نمایاں نظر آتی تھی۔

تیسرے پہر کو وزیرِ مہاجرین۔ آنریبل خان عبدالقیوم خاں وزیرِ اعظم۔ آنریبل خان محمد عباس خاں اور آنریبل میاں جعفر شاہ صوبہ سرحد کے وزیروں کے ہمراہ بذریعہ موٹر کوہاٹ روانہ ہو گئے۔ کوہاٹ کے ڈپٹی کمشنر میجر اللہ داد خاں صاحب درے کے سرے پر پیشوائی کے لئے موجود تھے۔ یہاں سے سب ایک جلسہ میں شرکت کے لئے روانہ ہوئے۔ جو کوہاٹ کے باشندوں کی طرف سے کیا گیا تھا۔ اس جلسے میں تقریر کرتے ہوئے وزیرِ مہاجرین نے صوبہ سرحد کے رہنے والوں سے خاص طور پر اس بات کی اپیل کی کہ یہ سب مل کر بلیک مارکیٹ اور نفع بازی کا خاتمہ کریں۔

وزیرِ مہاجرین نے وزیرِ اعظم کے الفاظ دہراتے ہوئے کہا کہ ہمیں بلیک مارکیٹ کرنے والوں کا حقہ پانی بند کر دینا چاہیئے۔ اور انہیں اپنی سوسائٹی میں کوئی جگہ نہیں دینی چاہیئے۔ اس طرزِ عمل سے اُمیدِ واثق ہے

کہ بلیک مارکیٹ کا خاتمہ ہو جائے گا۔

کوہاٹ کے خوشنما منظر کو چند منٹ دیکھنے کے بعد ہم سب ہنگو روانہ ہوئے۔ ہنگو کوہاٹ سے تقریباً ۲۵ میل کے فاصلہ پر ایک قصبہ ہے۔ جس میں صوبہ سرحد کا پولس ٹریننگ اسکول ہے۔ ٹریننگ اسکول کے پرنسپل اور صوبہ سرحد کے انسپکٹر جنرل پولس نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔ اور گارڈ آف آنر کا ملاحظہ کرنے کے بعد جسمانی ورزشش کا مظاہرہ کیا۔ اس اسکول میں ایک چھوٹا سا عجائب گھر بھی ہے۔ جہاں پولس کے متعلق عجائبات کو ایک جگہ جمع کیا گیا ہے۔ اس عجائب خانہ میں سب سے عجیب چیز ایک فاؤنٹین پن ہے۔ جو دیکھنے میں تو فاؤنٹین پن نظر آتا ہے۔ مگر اصل میں بارہ بور کی بندوق ہے جس کی گولی سے انسان ہلاک ہو سکتا ہے۔ بنانے والے نے واقعی کمال کر دیا۔ کہ قلم کے لباس میں بندوق بنا کر رکھ دی۔ اسی روز پشاور میں ایک صاحب نے مجھے ایک چھڑی دکھلائی تھی۔ جو دراصل بندوق تھی۔ میں چھڑی پر ہی حیرت کر رہا تھا کہ اب فاؤنٹین پن میں سے بندوق کو نکلتے دیکھ کر میرے تعجب کی کوئی انتہا نہ رہی۔

ہنگو میں رات کو ٹریننگ اسکول کے طالب علموں نے ڈو ڈرامے بھی دکھائے۔ جن سے اندازہ ہوا کہ یہاں پولس کی تربیت سائنس کے نئے اصولوں اور نئے طریق پر کی جاتی ہے۔ اس اسکول کا اصول ہے خدمتِ خلق۔ اگر تمام پولس والے اسی اصول پر کاربند رہیں تو ہمارے ملک پاکستان میں بھی پولس کے ملازمان کو نہایت عزت اور وقعت کی نظر سے دیکھا جائے۔ ہنگو کی رات بے حد خوشگوار تھی۔ سردی کا آغاز۔ ٹھنڈی ہوا اور سرسبز پہاڑوں کا دامن۔ یہی جی چاہتا تھا کہ کئی روز یہاں کی فضا سے دل بہلائیں۔ مگر علی الصباح پھر یہاں سے روانہ ہونا پڑا اور ہم سب کوہاٹ کے راستہ پشاور روانہ ہو گئے۔ ہنگو سے کوہاٹ تک سڑک کے دونوں طرف شاداب اور سرسبز کھیتوں کا سلسلہ ہے۔ ان کھیتوں میں اکثر جگہ فصل خریف طیار ہو چکی تھی۔ اور کہیں کہیں فصل ربیع کی طیاری ہو رہی تھی۔ اور جگہ تو لہلہاتے ہوئے کھیت ہمیشہ ایک شاعرانہ کیف اور سرور پیدا کرتے ہیں۔ لیکن صوبہ سرحد کی سرزمین چونکہ جفاکشی اور سپاہیانہ زندگی کی آئینہ دار ہے۔ اس لئے یہاں کے کھیتوں کی ہریاول سے بھی شجاعت اور بہادری کے آثار ہویدا ہیں۔

کوہاٹ اور پشاور کے درمیان آزاد قبائل کے علاقہ میں ایک عجیب و غریب کارخانہ کو دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ اس کارخانہ میں رائفلیں۔ بندوقیں اور پستول بنتے ہیں۔ بہ ظاہر چند چھوٹے چھوٹے گھر ہیں۔ مگر ان گھروں میں چابکدست صناعوں نے اپنے ہاتھ سے ایسی ایسی مشینیں اور کلیں ایجاد کی ہیں کہ اُن کے ذریعہ سے ولایتی بندوقوں کے مقابلے کی بندوقیں اور رائفلیں طیار کی جاتی ہیں۔ ان کاریگروں اور صناعوں کی صنعت اور کاریگری کا مقابلہ اس سے کر لیجئے کہ انہیں فولاد مشکل سے دستیاب ہوتا ہے اور کلیں چلانے کے لئے

اُن کے پاس بجلی بھی نہیں ہے۔ زمین پر بیٹھے چند کاریگر لوہے کے پہیئے یا فولاد کے دستے گھماتے ہیں۔ اور اُس کا نتیجہ آخر میں ایک ایسے پستول یا رائفل کی شکل میں نکل آتا ہے کہ جسے بہترین ولایتی رائفل یا پستول کے مقابلہ میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ وزیرِ مہاجرین نے چند رائفلیں اور پستول جو اسی کارخانے میں طیار کئے گئے تھے۔ خود ملاحظہ فرمائے۔ اور کاریگروں کی چابکدستی کی داد دی۔ کئی سو آزاد قبائل کے افراد اپنے معزز مہمانوں کے استقبال کے لئے احاطہ میں جمع تھے۔ اُن کے سفید پوشوں اور لیڈروں سے خواجہ صاحب نے گفتگو کی۔ اور اُن کی ضروریات کو سُنا۔ آزاد قبائلیوں کی طرف سے دستور کے مطابق دو دُنبے وزیرِ مہاجرین کی خدمت میں پیش کئے گئے۔ جنہیں ہاتھ لگا کر وزیرِ مہاجرین نے واپس کر دیا۔ آزاد قبائل کے نمائندوں نے پاکستان قائم ہونے پر خوشی کا اظہار کیا اور حکومتِ پاکستان کو یقین دلایا کہ تمام قبائل پاکستان کے ساتھ ہیں۔ اور استحکامِ پاکستان کے لئے ہر قربانی دینے کو طیار رہیں۔ حکومتِ برطانیہ کے زمانہ میں انہی آزاد قبائلی علاقوں میں امن و امان قائم رکھنے کے لئے بہت سی فوجیں مقرر تھیں۔ اور ہر سال ان پر کروڑوں روپیہ خرچ آتا تھا۔ جب سے پاکستان بنا ہے یہ تمام فوجیں قبائلی علاقوں سے ہٹائی جا چکی ہیں۔ کیونکہ اب اس ملک پر کسی غیر کی حکومت نہیں ہے ہر قبائلی کو اپنی آزادی کا احساس ہے۔ اور اس پر احتساب یا نگرانی کی کوئی ضرورت نہیں۔ اسے پاکستان کا اقبال یا اسلامی حکومت کا اعجاز سمجھیے کہ اب اُس علاقہ میں جو پہلے شورش اور فساد کے گھر کہے جاتے تھے امن امان کا مرکز بن گئے ہیں۔ چنانچہ پاکستان کی حکومت کا ایک وزیر اور صوبہ سرحد کی کابینہ کے تمام وزیر بغیر کسی پہرے یا حفاظت کے اپنے بھائیوں میں بیٹھے تھے۔ اور اس طرح گفتگو کر رہے تھے جیسے یہ اپنا ہی گھر ہے۔

اس دلچسپ کارخانہ کی سیر کے بعد ہم سب پشاور پہنچے اور بارہ بجے ہوائی جہاز سے روانہ ہو کر شام کو پانچ بجے کراچی آ پہنچے۔

دل تو یہی چاہتا تھا کہ سرحد میں چند روز اور قیام کیا جاتا۔ اس مہمان نواز صوبے کے با اخلاق باشندوں سے سیر ہو کر ملاقات ہوتی۔ اس تاریخی سرزمین کی سیاحت کرتے۔ مگر کراچی میں حکومت کے کاروبار نے اجازت نہ دی کہ وزیرِ مہاجرین دو دن سے زیادہ پشاور قیام فرمائیں۔ اس لئے یہ کہہ کر واپس آ گئے کہ انشاء اللہ پھر ملاقات ہو گی ۔

(۲؍دسمبر ۱۹۴۸ء)

پچھلے چند ہفتوں سے برابر خبریں چلی آتی تھیں کہ جب سے کشمیر کے مورچے پر ہندوستانی فوجوں نے نئے حملے شروع کئے ہیں۔ ہزاروں مظلوم کشمیری مرد۔ عورتیں اور بچے ہندوستانی فوجوں اور ہوائی جہازوں سے بچ کر پناہ لینے کے لئے پاکستان آرہے ہیں۔

آپ کو یاد ہوگا کہ پچھلے سال بھی ہندوستانی فوجوں کے مظالم سے بچنے کے لئے تقریباً ۴ لاکھ کشمیری مہاجرین نے پاکستان میں پناہ لی تھی۔ اور ایک سال سے یہ بیچارے مغربی پنجاب میں سر چھپائے بیٹھے تھے اگرچہ پاکستان کے سامنے ستر لاکھ سے زائد ایسے مہاجرین کا مسئلہ تھا جو مشرقی پنجاب اور ہندوستانی ریاستوں سے ہجرت کر کے یہاں آئے تھے۔ اور حکومت کے تمام وسیلے ان کی آبادکاری کے لئے وقف تھے۔ مگر قلبِ مومن کی طرح پاکستان کا دامن مظلوم کشمیری مہاجروں کے لئے بھی وسیع نکلا۔ اور مغربی پنجاب کی حکومت نے بلا تامل سیالکوٹ۔ گجرات۔ جہلم۔ راولپنڈی اور اٹک کے ضلعوں میں کشمیری مہاجرین کو جگہ دے دی ہندوستان کی فوج کے نئے حملے کے بعد سے کشمیری مہاجرین کی ایک بہت بڑی تعداد پاکستان میں پھر داخل ہونی شروع ہوئی۔ اور حکومت کے سامنے انہیں پناہ دینے کا مسئلہ دوبارہ پیدا ہوگیا۔ وزیرِ مہاجرین آنریبل خواجہ شہاب الدین گذشتہ دو مہینے سے سندھ میں مہاجرین کو بسانے کے لئے دن رات کوشش میں مصروف تھے۔ مگر کشمیری مہاجرین کی مصیبت کی داستان سُن کر فوراً کراچی سے لاہور روانہ ہوگئے۔ چنانچہ ۲۵ نومبر کی شام کو لاہور پہنچے۔ شب میں بہت دیر تک اس مسئلے کے متعلق پنجاب کے وزیرِ اعظم آنریبل خان افتخار حسین خان صاحب آف ممدوٹ اور دوسرے وزیروں سے گفتگو کی۔ دوسرے روز صبح مغربی پنجاب کے سرکاری افسروں کو ہدایات دیں۔ اور دن کے گیارہ بجے موٹر کے ذریعے سیالکوٹ روانہ ہوگئے۔

وزیرِ مہاجرین کے اس دورے کا مقصد مغربی پنجاب کے ان پانچ ضلعوں میں کشمیری مہاجرین کے کمپوں اور دوسرے انتظامات کا معائنہ کرنا تھا۔ اس دورے میں مغربی پنجاب کے وزیرِ بحالیات آنریبل سردار عبدالحمید دستی اور ڈپٹی کمشنر مسٹر لغاری بھی ان کے ساتھ تھے۔

لاہور سے سیالکوٹ تک

لاہور سے نکلتے ہی دریائے راوی کا پُل ہے۔ اور پُل سے اُترتے ہی سرسبز اور شاداب کھیتوں کا سلسلہ سڑک کے دونوں طرف کھیتوں میں سرسوں پھُولی ہوئی تھی۔ وھان کی فصل کٹ چکی تھی۔ اور کسان فصلیں اٹھا رہے تھے۔ سڑک پر جگہ جگہ کسانوں اور کاشتکاروں کے گروہ اپنی محنت اور خون پسینے کی کمائی بیل گاڑیوں میں لادے نظر آتے تھے۔ سردی کا آغاز تھا۔ اس لئے ہوا میں ایک لطیف سی خنکی محسوس ہوتی تھی۔ لاہور سے سیالکوٹ تک یہی منظر دیکھنے میں آیا۔ سیالکوٹ شہر ہم کوئی ½ ۱۲ بجے پہنچ گئے۔

سیالکوٹ کی شہرت تمام دنیا میں دُور دُور تک دو وجہ سے ہے۔ ایک تو یہ ایشیا کے سب سے بڑے شاعر علامہ اقبال کا وطن ہے۔ دوسرے سیالکوٹ میں کھیل کا سامان اس قدر عمدہ بنتا ہے کہ اس کی مانگ تمام دنیا کی منڈیوں میں ہے۔ سیالکوٹ کا ضلع ریاست جمّوں سے بالکل ملا ہوا ہے۔ اس لئے یہاں کشمیری مہاجرین کا ایک بہت بڑا حصّہ آباد ہے۔ جس کی تعداد پونے دو لاکھ کے قریب پہنچتی ہے۔ وزیرِ مہاجرین نے جمعہ کی نماز صدر کی مسجد میں ادا کی۔ اور نمازیوں کی درخواست پر نماز جمعہ کے بعد تقریر فرمائی۔ اس تقریر میں خواجہ صاحب نے مسلمانوں کو یاد دلایا کہ اوّل دن سے مسلمان کا بھروسہ تعداد کی کثرت پر نہیں بلکہ خداوندکریم کے فضل اور مہربانی پر رہا ہے۔ اور مسلمان دنیا کی کسی طاقت سے مرعوب نہیں ہو سکتا۔ کشمیر کے مسئلے کے متعلق پاکستان کی پالیسی کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ کشمیر پاکستان کا ایک حصّہ ہے۔ پاکستان یہ بات کبھی گوارا نہیں کر سکتا کہ ہندوستان کشمیر سے زبردستی الحاق کرے۔ اس بات کا فیصلہ صرف اسی طرح ممکن ہے کہ کشمیر اور جموں کے باشندے آزادی سے رائے دیں۔ اور رائے دیتے وقت ان پر کسی قسم کا بیرونی دباؤ نہ پڑے۔

نماز کے بعد خواجہ صاحب لال کرتی کمپ میں تشریف لے گئے۔ یہاں مہاجرین کا ایک اژدہام ان سے ملنے کے لئے جمع تھا۔ اس کمپ میں سب سے دلچسپ بات یہ ہے کہ مہاجر عورتوں کے لئے کرسچین ریلیف یونٹ کی طرف سے سلائی اور بنائی کا کام سکھایا جاتا ہے۔ اور اس طرح مہاجر عورتیں اپنا وقت مفید کاموں میں صرف کرتی ہیں۔ کمپ میں مہاجرین کے بچوں کے لئے تعلیم کا عمدہ بندوبست ہے۔ اور کاریگروں کو صنعت کے کاموں پر لگایا گیا ہے۔ سیالکوٹ میں کشمیری مہاجرین کے لئے چندے سے کئی موٹر لاریاں بھی خریدی گئی ہیں۔ جن پر دوائیاں وغیرہ لاد کر گاؤں گاؤں پھرایا جاتا ہے تاکہ دُور علاقہ میں رہنے

والے مہاجرین کا علاج معالجہ ہو سکے۔ اس علاقہ میں زیادہ تر مہاجرین کو گھروں میں آباد کیا جا چکا ہے۔ جو لوگ کیمپوں میں رہتے ہیں۔ انہیں مفت راشن ملتا ہے۔ اور گھروں میں رہنے والے مہاجرین کو راشن کارڈ دیئے جاتے ہیں جنہیں دکھا کر یہ ڈیپو سے مفت راشن لے سکتے ہیں۔

سیالکوٹ کے ڈپٹی کمشنر صاحب نے جس مستعدی سے مہاجرین کی آبادکاری کا کام سرانجام دیا ہے۔ اس کی مہاجر بہت تعریف کرتے ہیں۔ اور مہاجرین کو خود احساس ہے کہ سرکاری عملہ ان کے ساتھ نہایت ہمدردی اور خلوص سے پیش آتا ہے۔

سیالکوٹ کی مسلم لیگ کی طرف سے شام کو وزیرِ مہاجرین کو اسلامیہ سکول میں عصرانہ دیا گیا۔ جس کے بعد ایک مرتبہ پھر خواجہ صاحب نے مہاجرین کے متعلق گورنمنٹ کی پالیسی کی وضاحت کی۔ اس روز رات گئے تک سیالکوٹ کے انصار اور مہاجرین کے وفد وزیرِ مہاجرین سے ملنے کے لئے آتے رہے جنہوں نے مقامی حالات کے متعلق خواجہ صاحب سے تبادلہ خیالات کیا۔

۲۷ کی صبح کو روانگی سے پہلے وزیرِ مہاجرین نے فوج کی سلامی لی۔ اور جوانوں کی فوجی مشق کا معائنہ کیا۔ پاکستانی فوج کے جوان جس مستعدی اور پھرتی سے یہ مشق کر رہے تھے اسے دیکھ کر سب نے بے اختیار ان کی تعریف کی۔

گجرات۔ جہلم۔ راولپنڈی

گجرات پہنچنے پر خبر ملی کہ مغربی پنجاب کے وزیرِ تعلیم آنریبل چوہدری فضل الٰہی صاحب بھی خواجہ صاحب کے منتظر ہیں۔ گجرات کے راستہ میں یہ اطلاع ملی کہ ملتان کے قریب جس ہوائی جہاز کا حادثہ پیش آیا ہے اس میں وزارتِ مہاجرین کے سابق سکرٹری Wilfred Gregson صاحب بھی مارے گئے۔ گذشتہ سال جب وزارتِ مہاجرین بنی تھی۔ تو Wilfred Gregson صاحب نے اس کے بنیادی کاموں میں جس جوش و خروش سے حصہ لیا تھا اس کا حال صرف انہی لوگوں کو معلوم ہے جو ان کے ساتھ کام کر رہے تھے۔ ان کی ہمت اور ان کے خلوص نے مہاجرین کی جو خدمت کی اس کے لئے وزارتِ مہاجرین کی کارگزاری شاہد ہے۔ اور آج سب مہاجرین کو افسوس ہے کہ ایک مخلص افسر ہم سے جدا ہو گیا۔

ضلع گجرات کی سرحد پر سرائے عالمگیر میں کئی ہزار مہاجرین ایک جلسے کی شکل میں جمع تھے۔ یہاں تقریر کرنے سے پہلے خواجہ صاحب نے قصبے کے اندر جا کر مہاجرین کے مکانات اور محلوں کا معائنہ کیا۔ اس کے بعد جلسہ میں شرکت کی۔ کشمیری مہاجرین جو ابھی حال میں یہاں آئے ہیں۔ انہوں نے اپنی داستانِ غم و الم وزیرِ مہاجرین کو سنائی۔ ان بیچاروں سے مہاجرین کی حالت زار دیکھی نہیں جاتی۔ کئی کئی روز تک ہندوستانی ہوائی جہازوں کے خوف سے یہ لوگ رات کو سفر کرتے تھے۔ دن کو جنگلوں اور درختوں میں چھپ جاتے تھے۔

سر پر بم پڑتے اور ان کے پیچھے پیچھے ڈوگرہ سپاہیوں کے دستے حملہ کرتے چلے آتے تھے۔ سردی کے موسم میں بغیر کپڑوں کے یہ لوگ کشمیر سے بھاگ کر پاکستان آئے ہیں۔ اب انہیں کیمپوں میں کمبل اور راشن مل رہے ہیں۔ اور کم از کم جان کا خوف نہیں ہے۔ خواجہ صاحب نے ایک مرتبہ مہاجرین کو پھر یقین دلایا کہ پاکستان اپنے مہمانوں کی ہر طرح خدمت کرنے کے لئے حاضر ہے۔ اور اس مصیبت کے وقت میں پاکستان کشمیری بھائیوں کو نہایت فراخ دلی سے اپنے ہاں جگہ دینے کو طیار ہے۔

وزیر مہاجرین نے سرکاری ملازموں سے مخاطب ہو کر کہا کہ اب تک ہم ایک غیر ملکی حکومت کے ماتحت کام کر رہے تھے۔ مگر اب ہماری حکومت اپنی ہے۔ اور ہر سرکاری ملازم کا فرض ہے کہ دوگنی اور چوگنی مستعدی سے اپنے فرائض انجام دے۔ حکومت کا ہر ملازم پاکستان کے استحکام کے لئے ایک ستون کا کام دے سکتا ہے۔ اور ہر پاکستانی کو اپنا یہ فرض مذہبی فریضہ سمجھ کر ادا کرنا چاہیئے۔ وزیروں سے لے کر دوسرے حاکموں تک سب قوم کے خادم ہیں۔ اور ہم سب کا فرض ہے کہ قوم کی خدمت نہایت دیانتداری سے کریں۔ سرائے عالمگیر و جہلم شہر کے درمیان صرف دریائے جہلم ہے۔ اس لئے یہاں سے ہو کر چند منٹ میں ہم جہلم پہنچ گئے۔ جہلم کا ضلع وہ مردم خیز خطّہ ہے کہ جہاں کے جوان ہمیشہ سے فوجوں کی زینت ہوتے چلے آئے ہیں۔ اور یہ روایات آج بھی اس ضلع کا طرّۂ امتیاز ہیں۔

اس شہر کی سب سے بڑی تجارت لکڑی پر منحصر ہے۔ جو دریا کے ذریعہ کشمیر سے آتی ہے۔ اور پھر جہلم سے تمام ملک میں بھیجی جاتی ہے۔

جہلم کے ست سنگ کیمپ میں بھی وزیر مہاجرین نے تقریر کی۔ اور مجاہدین کشمیر کی فتح و نصرت کی دعا پر جلسہ ختم ہوا۔ ضلع جہلم میں کشمیری مہاجرین کا سب سے بڑا کیمپ کالا ہے۔ جہاں دس ہزار سے زیادہ مہاجرین آباد ہیں۔ کالا کیمپ میں ہسپتال کا انتظام پاکستان ویمنز والنٹیری سروس کے کارکنوں کے ہاتھ میں ہے۔ جو اسے بہت خوش اسلوبی سے چلا رہے ہیں۔ اس کیمپ کے مہاجرین نے شکایت کی کہ سردی غضب کی پڑ رہی ہے۔ اور رات کو سردی سے بچنے کے لئے ہمیں لکڑی کم ملتی ہے۔ وزیر مہاجرین نے فوراً اعلان کیا کہ آج سے لکڑی کا راشن دوگنا کر دیا جائے گا۔ اس اعلان کا استقبال سب مہاجرین نے نہایت گرم جوشی سے کیا۔

کالا کیمپ کے قریب ہی ڈینا نام کا قصبہ ہے۔ یہاں بھی وزیر مہاجرین کچھ دیر کے لئے گئے۔ اور مہاجرین مشرقی پنجاب سے اُن کے حالات سُنے۔ چونکہ اس قصبے میں وزیر مہاجرین بغیر اطلاع کے گئے تھے۔ اس لئے وہاں کے مہاجرین کو اس سے اور بھی خوشی ہوئی۔

کالا سے راولپنڈی تک تمام علاقہ پہاڑی ہے۔ اب شام ہو گئی تھی۔ اور سرد ہوا کے جھونکے اس سردی کا پتہ دے رہے تھے جو راولپنڈی کے لئے مخصوص ہے۔ جب ہم رات کے ۸ بجے راولپنڈی پہنچے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے برف خانہ میں آ گئے ہیں۔ مگر اس علاقہ کے باشندوں کی محبت اور خلوص کی گرمی نے راولپنڈی کی سردی کو محو کر دیا۔

۲۸ نومبر کی صبح کو سیالکوٹ، جہلم، گجرات اور راولپنڈی کے ڈپٹی کمشنروں کی ایک کانفرنس راولپنڈی کے کمشنر صاحب نے طلب کی تھی۔ اس کانفرنس میں وزیرِ مہاجرین نے کشمیری مہاجرین کے متعلق اب تک جس قدر کام ہوا ہے اس کی روئیداد سنی۔ ضلع کے حاکموں کی مشکلات کا جائزہ لیا۔ کیمپوں میں بسنے والے مہاجرین نے جو جو شکایات کی تھیں ان کو دور کرنے کے لئے احکام جاری کئے۔ اور آئندہ کی پالیسی کے بارے میں ضروری تجویزوں پر غور کیا۔ سب سے بڑا فیصلہ اس کانفرنس میں یہ ہوا۔ کہ جموں و کشمیر کے مہاجرین کو سردی سے بچانے کے لئے جن مکانات میں مرمت کی ضرورت ہے۔ ان کی فوراً مرمت کی جائے۔ اور مرمت ہوتے ہی زیادہ سے زیادہ مہاجرین کو ان مکانوں میں منتقل کر دیا جائے۔

دوسرے جموں و کشمیر کے مہاجرین میں بہت سے دستکار اور صناع بھی ہیں۔ ان کی مردم شماری کی جائے۔ اور مردم شماری کے بعد تعداد پر غور کر کے ہر کیمپ میں دستکاری اور صناعی کے مرکز قائم کئے جائیں۔ تاکہ سب ہنرمندوں کو بے کار وقت میں فائدہ مند کام کرنے کا موقعہ مل جائے۔ وزیرِ مہاجرین نے تمام کیمپوں میں بچوں اور بڑوں کے لئے اسکول اور مدرسے کھولنے کا بھی حکم دیا۔

کانفرنس میں فیصلہ ہوا کہ عورتوں کے لئے چرخے کاتنے اور کپڑا بُننے کا بندوبست کیا جائے۔ اور ہر کیمپ میں مذہبی تعلیم حاصل کرنے کے ذرائع مہیا کئے جائیں۔ کانفرنس میں یہ بھی طے پایا کہ چونکہ ہر ضلع میں مہاجرین کی دیکھ بھال کا کام اس قدر بڑھ گیا ہے کہ ایک ڈپٹی کمشنر یہ سب کام تنہا نہیں کر سکتا۔ اس لئے ان پانچ ضلعوں میں ایک ایک ایڈیشنل ڈپٹی کمشنر مقرر کر دیا جائے جو مہاجرین کی آبادکاری کے سلسلہ میں ڈپٹی کمشنر کی مدد کرے۔

اٹک کا دورہ

ڈپٹی کمشنروں کی کانفرنس ختم کرتے ہی وزیرِ مہاجرین ضلع اٹک میں مانسر کیمپ کے ملاحظہ کے لئے روانہ ہو گئے۔ مانسر راولپنڈی سے کوئی ۵۰ میل پر ایک بہت بڑا کیمپ ہے۔ جہاں چودہ ہزار کے قریب کشمیری مہاجرین آباد ہیں۔ مانسر کیمپ کے مہاجرین نے اپنی ضروریات کا اظہار ایک سپاسنامہ

کی شکل میں کیا۔ اور وزیرِ مہاجرین نے فوراً موقعہ پر ان کی شکایت کے احکام جاری کر دیئے۔ اس کیمپ میں بسنے والے مہاجرین کی صحت نسبتاً خراب ہے۔ اس لئے یہاں دوسرے کیمپوں کی نسبت مہاجرین کو راشن کی مقدار زیادہ ملتی ہے۔ مانسر کیمپ میں کشمیر سے جو نئے مہاجرین آئے تھے اُن سے بھی وزیرِ مہاجرین نے ملاقات کی۔ اور فرداً فرداً بہت سے لوگوں سے ملے۔ ایک کشمیری مہاجر نے بیان کیا کہ میں کشمیر کے محاذ سے صرف اپنے بیوی بچوں کو حفاظت کی جگہ چھوڑنے کے لئے آیا ہوں۔ اس کے بعد ہی فوراً مورچہ پر جانا چاہتا ہوں۔ یہی حال عام طور سے سب جوان مہاجرین کا تھا۔ جو اپنے ملک کی حفاظت کے لئے ہر قربانی کرنے کو تیار تھے۔

شام کے سات بجے وزیرِ مہاجرین اور پارٹی کے دوسرے ممبر راولپنڈی واپس آئے اور رات کے بارہ بجے کی ٹرین سے لاہور روانہ ہو گئے۔ اگرچہ رات کو سخت سردی تھی۔ اور آدھی رات گزر چکی تھی لیکن بہت سے مہاجرین راولپنڈی کے اسٹیشن پر وزیرِ مہاجرین کی خدمت میں درخواستیں پیش کرنے کے لئے موجود تھے۔ گاڑی روانہ ہونے تک ان سے ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ اور صبح آٹھ بجے لاہور میں پھر یہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ اسٹیشن سے اترتے ہی وزیرِ مہاجرین نے تمام دورے کے حالات کے متعلق مغربی پنجاب کے وزیرِ اعظم اور دوسرے وزیروں سے مشورے کئے۔ اور گورنر مغربی پنجاب سے ملاقات میں اپنے تمام فیصلوں کا ذکر کیا جو کشمیری مہاجرین کے لئے کئے گئے تھے۔

جیسا کہ میں نے شروع میں کہا ہے وزیرِ مہاجرین کے اس دورے کا مقصد کشمیری مہاجرین کی کیفیت کا معلوم کرنا تھا۔ یہ خود موقعہ پر پہنچ کر ان کے متعلق ضروری فیصلے کرنے چاہتے تھے۔ چنانچہ جموں و کشمیر مسلم کانفرنس کے صدر چودھری غلام عبّاس اور ان کے رفیقوں سے مل کر ضلعوں کے حاکموں۔ مہاجرین کے نمائندوں۔ انصار کے وفدوں اور قومی کارکنوں سے مشورے کرنے کے بعد بہت سے ضروری فیصلے کئے۔ اور ان پر مغربی پنجاب میں عمل شروع ہو چکا ہے۔

کراچی کو واپسی

کراچی واپس پہنچتے ہی وزیرِ مہاجرین نے سندھ میں مہاجروں کے بسانے کے متعلق افسروں سے رپورٹیں طلب کیں اور یکم دسمبر کو سندھ کے وزیرِ مہاجرین آنریبل میراں محمد شاہ اور سندھ کے کمشنر آبادکاری مسٹر نذیر احمد اور دوسرے متعلقہ افسروں کا ایک ضروری جلسہ منعقد کیا۔ اس مشورے میں مہاجرین کے لئے طبّی امداد اور خوراک اور غذا کے بارے میں ضروری فیصلے ہوئے۔ ایک لاکھ کمبل سندھ کے مہاجرین کے لئے پہنچ چکے ہیں۔ اور ایک بہت بڑی تعداد کمبلوں کی آ رہی ہے جو بہت جلد مہاجرین

میں تقسیم کر دیئے جائیں گے۔ گاؤں گاؤں اور علاقہ علاقہ پھرنے کے لئے سندھ کی گورنمنٹ نے ۱۴۰ حکیم اور ۹۰ ڈاکٹر ملازم رکھے ہیں۔ ان کے بارے میں بھی وزیرِ مہاجرین نے ضروری ہدایات جاری کیں اور حکم دیا کہ کوئی شخص سردی کے موسم میں بغیر گھر یا جھونپڑی کے نہ رہے۔ اور فصل خریف کی کاشت کے لئے ابھی سے طیاری شروع کر دی جائے۔

ہمارے مہاجروں سے ہمدردی صرف پاکستان والوں کو ہی نہیں ہے بلکہ دنیا کے جس علاقہ میں بھی پاکستان کے باشندے آباد ہیں۔ یہ اپنے مصیبت زدہ بھائیوں کی مدد کرتے رہتے ہیں۔ گزشتہ سال ایران سے پاکستانی بھائیوں نے مہاجرین کے لئے کئی ہزار روپیہ بطور امداد بھیجا تھا۔ اب بحرین سے پاکستانی بھائیوں نے مہاجرین کے لئے کپڑے کے ۲ بنڈل بھیجے ہیں۔ یہ کپڑے کراچی پہنچ چکے ہیں۔ اور بہت جلد مہاجرین میں تقسیم کر دیئے جائیں گے۔ پاکستان کے مہاجرین بحرین کے پاکستانی بھائیوں کا شکریہ ادا کرتے ہیں کہ ان کی محبت نے انہیں سردی کی سختیوں سے بچا لیا۔ خداوند کریم بحرین کے پاکستانی بھائیوں کو اس کی جزاء خیر دے۔

دہلی کانفرنس

(۱۶ دسمبر ۱۹۴۷ء)

پچھلے پندرہ دن میں لاہور اور دلّی میں دو کانفرنسیں ایسی ہوئی ہیں کہ جن کے فیصلے مہاجرین سے متعلق ہیں۔ پہلی کانفرنس لاہور میں ۴ دسمبر کو ہوئی۔ یہ مہاجرین کی مشترکہ کونسل تھی۔ جس نے فیصلہ کیا کہ آئندہ جس طرح مشرقی پنجاب اور مشرقی پنجاب کی ریاستوں سے آنے والے مہاجرین کو گورنمنٹ کی طرف سے گزارہ ملتا ہے۔ اسی طرح بیکانیر، بھرت پور اور الور سے آنے والے مہاجرین کو بھی سرکار کی طرف سے گزارہ ملا کرے گا۔ مشترکہ مہاجرین کونسل کا دوسرا فیصلہ ایسے مہاجرین سے متعلق ہے جو مشرقی پنجاب میں جائدادیں چھوڑ آئے ہیں اور اُن کی جائدادیں مغربی پنجاب میں بھی ہیں۔ اب تک ایسے مہاجرین کو گورنمنٹ کی طرف سے کوئی گزارہ نہیں ملتا تھا۔ اب فیصلہ ہوا ہے کہ اگر ان مہاجرین کی مشرقی پنجاب میں بہت کافی جائدادیں تھیں جن کی آمدنی اُن کی مغربی پنجاب کی جائدادوں سے زیادہ بنتی ہے تو انہیں گزارہ ضرور ملے گا مگر گزارے کی رقم میں سے مغربی پنجاب کی جائداد کی آمدنی کم کر دی جائے گی۔

لاہور میں مہاجرین کی مشترکہ کونسل کے اجلاس میں شرکت کرنے کے بعد ۵ دسمبر کو وزیرِ مہاجرین آنریبل خواجہ شہاب الدین ہوائی جہاز سے دلّی روانہ ہوئے۔ اس جہاز سے مغربی پنجاب کے وزیر آنریبل سردار عبدالحمید دستی اور دوسرے افسر بھی دلّی کانفرنس میں شریک ہونے کے لئے سفر کر رہے تھے۔ صبح ۱۰ بجے ہمارا ہوائی جہاز لاہور سے روانہ ہوا۔ اور پونے دو گھنٹے میں دلّی جا پہنچا۔ ہوائی جہاز کی کھڑکیوں میں سے سب مسافر دلّی کے آس پاس کی بستیوں اور پرانی عمارتوں کو تلاش کر رہے تھے۔ وہی پرانی عمارتیں کہ جن کی وجہ سے دلّی مشہور ہے روشن چراغ، حوض خاص، قطب مینار، مہرولی، ہمایوں کا مقبرہ، نظام الدین یہ سب نام جانے پہچانے ہیں۔ مگر آج ان آثار کو ہوائی جہاز سے دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا

جیسے وقت کی زنجیریں ٹوٹ گئیں۔ اور ہم سب کئی سو سال پیچھے پہنچ گئے۔ اتنے میں ہوائی جہاز نے نئی دلّی پر چکر لگایا۔ مگر ہمارا ذہن ابھی تک قدیم دور میں سے گزر رہا تھا۔ اِس لئے اتنی جلدی نئی دلّی کو قبول نہیں کر سکا۔ چنانچہ کبھی ہماری نظریں صفدر جنگ کے مقبرے پر جمتی تھیں اور کبھی گورنمنٹ ہاؤس کے مینار دیکھتی تھیں اور اسی ذہنی کش مکش میں ہم ہوائی میدان پر اترے۔ گورنمنٹ آف انڈیا کے افسر اور پاکستانی ہائی کمشنر کے نمائندے وزیروں کے استقبال کے لئے کھڑے تھے۔ خواجہ صاحب اور دستی صاحب تو گورنر جنرل کے مہمان تھے اس لئے سیدھے گورنمنٹ ہاؤس چلے گئے۔ ہم سب رائے سینہ ہوسٹل کی طرف روانہ ہو گئے کہ جہاں ہمارے قیام کا گورنمنٹ آف انڈیا کی طرف سے انتظام کیا گیا تھا۔ رائے سینہ ہوسٹل پہنچ کر مجھے ایک ذہنی کشمکش اور ہوئی، میں بار بار یہی سوچ رہا تھا کہ اگر دلّی میں بسنے والوں کی وہی بولی ہے جو آل انڈیا ریڈیو کی خبروں کے لئے استعمال ہوتی ہے تو میں اُن کی بات کیسے سمجھوں گا۔ اور ہوسٹل کے خدّام کو اپنے دل کی باتیں کیسے سمجھا سکوں گا۔ بارے جب ایک شخص نے مجھ سے آکر اُسی سیدھی سادھی زبان میں، جسے ہم اُردو کہتے ہیں، باتیں کرنی شروع کیں تو میری تشویش رفع ہوئی۔

نئی دلّی کی سڑکوں پر پہلے بھی جانے پہچانے لوگ بہت کم نظر آتے تھے کیونکہ نئی دلّی تو ایک دنیا ہی نئی ہے۔ البتہ شہر پناہ کے اندر ہر چند قدم پر شناسا صورتیں اور جانی پہچانی شکلیں مل جاتی تھیں۔ اب کی دفعہ میں دلّی کے بازاروں میں کئی کئی گھنٹے پھرا صرف اس امید میں کہ شاید کوئی جاننے والا مل جائے مگر دلّی والا کوئی نہیں ملا۔ اور اگر کوئی مِلا بھی تو اُس نے مجھے پہچانا نہیں۔ البتہ شہر کے بازار گلی کوچے آدمیوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ اور ہجوم کا یہ عالم ہے کہ چاندنی چوک میں ہر وقت ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے لوگ بے ٹکٹ خریدے نمائش میں گھس آتے ہیں۔ چاندنی چوک میں دُوسری بات یہ دیکھی کہ ہر چند منٹ کے بعد بہت سے لوگ جھنڈے سے نعرے لگاتے نظر آتے تھے۔ ابھی جو جلوس گیا تھا۔ یہ راشٹریہ سیوک سنگ کے ممبروں کی گرفتاری کے خِلاف احتجاج تھا۔ اس کے بعد بنک کے ملازمین کی ہڑتال کا مظاہرہ تھا۔ اور چند منٹ بعد شرن آرتھی جھنڈے اٹھائے چلے آتے تھے۔ گویا چاندنی چوک سیاسیات کا ایک مستقل اکھاڑہ بن گیا ہے اور یہی عالم شہر کے دُوسرے حِصّوں کا بھی ہے۔ جامع مسجد کی سیڑھیوں کی رونق اب صرف ایک افسانہ رہ گئی ہے۔ تھوڑے بہت لوگ اب بھی یہاں نظر آتے ہیں مگر وُہ پہلی جیسی بات نہیں۔ جامع مسجد کے قریب اُردو بازار میں کبھی زمانے میں اُردو کتابوں کا بہت اچھا بیوپار ہوتا تھا۔ اب یہاں کی دوکانیں سُنسان پڑی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔

کہ دوکاندار کہیں باہر چلے گئے اور خریداروں نے اس طرف کا رُخ چھوڑ دیا۔ دلی کے بازاروں میں اب عجیب عجیب قسم کی آوازیں سُننے میں آتی ہیں اور کان اُن رسیلی آوازوں کو ترستے ہیں جو خریداروں کے سامنے چنوں کو لذیذ ترین میوہ اور معمولی پھلوں کو دنیا کی بہترین نعمت بنا کر پیش کیا کرتی تھیں۔ اب تو سیب اور انگور اس طرح بکتے ہیں۔ جیسے کوئی اینٹ پتھر بیچ رہا ہو۔

۶ر دسمبر کو صبح دس بجے سے پاکستان اور ہندوستان کے نمائندوں کے درمیان کانفرنس شروع ہونے والی تھی۔ جس میں پاکستان کی طرف سے آنریبل مسٹر غلام محمد لیڈر تھے۔ اور ان کی مدد پر آنریبل خواجہ شہاب الدین، مشرقی بنگال کے وزیرِ اعظم مسٹر نورالامین اور مغربی پنجاب کے وزیر آنریبل عبدالحمید دستی اور پاکستان کے ہائی کمشنر اور پاکستان کے دوسرے افسر آئے تھے۔ ہندوستان کی طرف سے ڈیلیگیشن کے لیڈر آنریبل مسٹر گوپال سوامی آئینگر تھے۔ اور اُن کے ساتھ مغربی بنگال کے وزیرِ اعظم ڈاکٹر رائے اور مشرقی پنجاب کے وزیرِ اعظم ڈاکٹر بھارگو اور ہندوستان کے دوسرے وزیر موجود تھے۔ سیکریٹریٹ کے ایک بڑے کمرے میں ٹھیک دس بجے کانفرنس شروع ہوئی۔ آمنے سامنے لمبی لمبی دو میزیں لگائی گئی تھیں۔ ایک طرف پاکستان کے نمائندے بیٹھے تھے اور سامنے ہندوستان کا ڈیلیگیشن بٹھایا گیا تھا۔

کانفرنس کے ابتدائی اجلاس میں آنریبل مسٹر گوپال سوامی آئنگر نے پاکستان کے نمائندوں کا استقبال کیا اور جوابی تقریر میں مسٹر غلام محمد نے مناسب لفظوں میں کانفرنس کی اہمیت کا اعتراف کیا۔ فیصلہ یہ ہوا کہ کانفرنس کو مختلف کمیٹیوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ تاکہ سب ضروری معاملوں پر ایک وقت میں کام شروع ہو جائے اور یہ سب کمیٹیاں اپنی اپنی رپورٹ کانفرنس کے سامنے پیش کر دیں۔ ۶ر دسمبر سے لے کر ۱۲ر دسمبر تک برابر ان کمیٹیوں کے صبح شام اور دوپہر کو جلسے ہوتے رہے۔ آخر ۱۳ر دسمبر کو انھوں نے کام ختم کر لیا۔ اور اپنی اپنی رپورٹ کانفرنس کے سامنے پیش کر دی۔

کانفرنس کے دوران میں اکثر ہندوستان اور پاکستان کی طرف سے دعوتیں بھی دی جاتی تھیں۔ ان دعوتوں میں سے ایک دعوت کا ذکر میں خاص طور سے کرنا چاہتا ہوں۔ یہ دعوت پاکستان کے ہائی کمشنر مسٹر اسماعیل نے جیم خانہ کلب میں پاکستان کے نمائندوں کے اعزاز میں دی تھی۔ جس میں حکومتِ ہندوستان کے گورنر جنرل مسٹر راج گوپال اچاریہ، پنڈت نہرو، دوسرے وزیر، غیر ملکی سفیر، اسمبلی کے ممبر اور فوجوں کے افسر آئے تھے۔ کوئی چار سو مہمانوں کا مجمع ہوگا۔ جیم خانہ کلب کے بڑے ہال کمرے میں مہمان کھڑے چائے پی رہے تھے اور چھوٹی چھوٹی جماعتوں میں بیٹھے باتیں بھی کرتے جاتے تھے۔ ایک طرف

ہز ایکسیلنسی مسٹر راج گوپال اچاریہ کے گرد کچھ لوگ جمع تھے۔ پاس ہی پنڈت نہرو کے احباب کھڑے تھے۔ غیر ملکی سفیروں کا مجمع الگ نظر آتا تھا۔ مگر اس دعوت میں سب سے زیادہ ہجوم اُردو کے مشہور شاعر مولانا حسرت موہانی کے گرد تھا۔ اس ہجوم کو دیکھ دیکھ کر لوگ حیرت سے قریب آتے تھے۔ اور پوچھتے تھے کہ اس حلقہ میں کون کھڑا ہے۔ مولانا حسرت موہانی کے مداحوں کا یہ عالم تھا کہ مولانا کے شعر مزے لے لے کر انہیں سنا رہے تھے اور مولانا سے تازہ شعر سننے کی درخواست کر رہے تھے۔ کوئی جگی کی مشقت مشقِ سخن اور طرفہ طبیعت والا شعر پڑھ رہا تھا۔ کسی کی زبان پر حُسنِ بے پروا کو خود بین و خود آرا کر دینے کی شکایت تھی۔ اور مولانا ہر شخص سے اپنا کلام سُن سُن کر اُس کی داد دے رہے تھے۔ حد یہ ہے کہ دعوت کا سارا مجمع چھٹ گیا۔ سیاست دان اور سفیر غائب ہو گئے۔ مگر اُردو ادب کے دلدادہ اُسی طرح کھڑے رہے اور بہت دیر تک شعر و سخن کی محفل گرم رہی۔ میں نے اپنے دل میں کہا، سیاست پر شعر آج بھی بھاری ہے۔ بھلا یہ قدر کسی سیاست دان یا لیڈر کو کہاں نصیب جو ہمارے ایک اُردو شاعر کی آج ہو رہی ہے۔

دہلی کانفرنس میں پاکستان اور ہندوستان نے بہت سی باتوں کے متعلق فیصلے کیے۔ ان کا تعلق تجارت، مالیات اور مہاجرین کی جائداد سے ہے۔ مگر میں ان فیصلوں میں سے صرف مہاجرین سے متعلق باتوں کا ذکر کروں گا۔

مہاجرین کی زمینوں اور جائیدادوں کی فروخت یا تبادلے کے متعلق فیصلہ کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ دونوں طرف کی جائدادوں کی پوری تفصیل معلوم ہو جائے۔ مشرقی پنجاب اور مغربی پنجاب کی زمینوں کی جمع بندیاں نقل ہو کر ایک دوسرے کو بھیجی جا چکی ہیں۔ مگر ابھی یہ کام پورا نہیں ہوا۔ اس لئے فیصلہ ہوا کہ پاکستان اور ہندوستان کے ڈپٹی ہائی کمشنر لاہور اور جالندھر میں زمینوں کے کاغذوں کی نقلیں جلدی جلدی تیار کرا کے ایک دوسرے کو بھیج دیں۔ دونوں طرف کے مہاجرین کو اپنی اپنی جائدادوں کے متعلق اب تک معلومات نہیں مل سکیں کہ جو جائداد وہ چھوڑ آئے ہیں کس حالت میں ہے۔ اس لئے اب پاکستان اور ہندوستان کی طرف سے ایک ایک افسر مقرر کیا جائے گا جو دونوں ملکوں میں جائدادوں کے متعلق پوری معلومات مالکوں کو بتا سکے گا۔

فیصلہ ہوا ہے کہ شہروں میں جو مکان اور جائدادیں دونوں طرف کے لوگ چھوڑ آئے ہیں اُن کا کرایہ وصول کر کے مالکوں کو دیا جائے اور اس کام کے لئے جلدی سے انتظام مکمل ہو جائے۔ منقولہ جائدادوں کو ایک ملک سے دوسرے ملک میں لے جانے کے لیئے دونوں طرف کے ڈپٹی ہائی کمشنر مل کر بندوبست

کریں گے۔ تاکہ منقولہ جائدادیں آسانی سے پاکستان اور ہندوستان آجاسکیں۔

اس کے علاوہ حصّوں کی فروخت اور پراویڈنٹ فنڈ کے بارے میں بھی فیصلے ہوئے ہیں دونوں طرف کے بہت سے ملازموں اور اسکول کے استادوں کے فنڈ ابھی تک ادا نہیں ہوئے اور اس وجہ سے لوگوں کو بہت تکلیف ہے۔ اب فیصلہ ہوا ہے کہ پراویڈنٹ فنڈ کا روپیہ بھی جلد ادا کر دیا جائے گا۔ جو جائدادیں کورٹ آف وارڈ کے ماتحت ہیں ان کا روپیہ بھی مالکوں کو ادا کرنے کا فیصلہ ہوا ہے مگر ابھی بہت سی ایسی باتیں ہیں کہ ان کا فیصلہ آخری طور سے نہیں ہو سکا۔ اس لئے قرار پایا ہے کہ ۱۰ جنوری کو کراچی میں ایک کانفرنس اور ہوگی جس میں ان ضروری باتوں کے متعلق فیصلے کئے جائیں گے جو دہلی کانفرنس میں طے نہیں ہو سکیں۔ اخباروں میں کانفرنس کے فیصلوں کی پوری تفصیل چھپ چکی ہے اور اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دہلی کانفرنس بہت بڑی حد تک کامیاب رہی۔

اس کانفرنس میں دونوں ملکوں کے نمائندوں نے نہایت صفائی سے ایک دوسرے کے سامنے اپنا نقطۂ نظر رکھ دیا اور ایک دوسرے کو مشکلات سے آگاہ کیا۔ بہت سی باتوں پر دونوں نے اتفاق کیا۔ کچھ باتوں پر اتفاق نہیں ہو سکا۔ مگر اس سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ ایک دوسرے کے نقطۂ نظر سے آگاہی ہو گئی۔ چنانچہ کانفرنس کے خاتمہ پر پاکستان کی طرف سے آنریبل مسٹر غلام محمد نے گورنمنٹ آف انڈیا کا شکریہ ادا کیا۔ اور اُن کی مہمان نوازی کی تعریف کی۔ اس کے جواب میں ہندوستان کی طرف سے مسٹر گوپال سوامی آئنگر نے امید ظاہر کی کہ جو فیصلے ہوئے ہیں دونوں ملک ان پر عمل بھی شروع کر دیں گے۔ ۱۴ دسمبر کی رات کو گیارہ بجے کانفرنس کے فیصلوں پر پاکستان اور ہندوستان کے نمائندوں نے دستخط کر دیئے اور دونوں حکومتوں کی طرف سے اس بات کا اقرار ہوا کہ بہت جلد ان فیصلوں کو عملی جامہ پہنایا جائے گا۔ کانفرنس کا کام ختم ہو چکا تھا۔ اس لئے اب ہم سب نے چلنے کی تیاری کی۔ ۱۵ دسمبر کی صبح کو ابھی سورج بھی نہیں نکلا تھا کہ ہم نے اسباب باندھنا شروع کر دیا۔ دلّی میں دسمبر کی سردی سے سب کو کپکپی لگ رہی تھی۔ مگر سر پر سفر سوار تھا۔ اس لئے جلدی جلدی ناشتہ کیا اور موٹریں مسافروں اور سامان کو لے کر پالم کے ہوائی میدان کی طرف روانہ ہوئیں۔ ۹½ بجے ہوائی جہاز نے پر تولے اور پاکستان کا رُخ کر کے کراچی کو روانہ ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد دلّی کی قدیم عمارتوں کے آثار قطب مینار اور نئی دلّی کے نشانات نظروں سے اوجھل ہونے شروع ہو گئے اب ہمارا ہوائی جہاز راجپوتانہ کے صحرا پر سے گزرتا ہوا سندھ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ایک بجے کے قریب ہم دریائے سندھ پر سے گزرے جو آج بھی ہزاروں سال

پہلے کی طرح خاموشی سے سمندر کی طرف بہا چلا جاتا تھا اس کے کنارے سرسبز کھیت تھے اور کہیں کہیں نخلستان۔ دو بجے کراچی کے قریب پہنچے۔ سورج کی روشن کرنوں میں ایسا معلوم ہو رہا تھا۔ جیسے کراچی شہر صحرا اور ریتلے علاقہ سے دامن بچائے سمندر کا سہارا لئے انگڑائی لے رہا ہے ۰

مشرقی پاکستان میں

۲۷ جنوری سنہ ۱۹۴۹ء

پاکستان کے باشندوں کو دو گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک وُہ جنہوں نے ڈھاکہ دیکھا ہے اور دوسرے وُہ کہ جنہوں نے ڈھاکہ نہیں دیکھا۔ میرا اب تک شمار آخری قسم کے لوگوں میں ہوتا تھا۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ اب میں نے ڈھاکہ دیکھ لیا۔ ۱۴ جنوری کو تیسرے پہر کلکتے سے ہمارا ہوائی جہاز روانہ ہوا۔ ابھی اخبار کے آخری صفحہ پر ہی میری نظر تھی کہ کسی نے کہا ذرا نیچے تو دیکھئے۔ کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھا۔ تو معلوم ہوا کہ ہمارا ہوائی جہاز ایک نہایت خوبصورت لہراتے بل کھاتے دریا پر سے گزر رہا ہے۔ ایک ہم سفر نے بتلایا کہ یہ دریائے پدما ہے۔ جس کے حسن اور لطافت کا اثر تمام مشرقی پاکستان کی زندگی پر نمایاں نظر آتا ہے۔ دریائے پدما اور اُس کی بے شمار شاخیں مختلف ناموں سے اس سرزمین پر بہتی ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ ایک دریا نہیں بلکہ غزل کا مصرع طرح ہے جس نے اس خطّے کی زندگی کو ہم وزن اور موزُون بنا دیا ہے۔

۱۵ جنوری کی شام کو پاکستان کے وزیرِ داخلہ و مہاجرین آنریبل خواجہ شہاب الدین کراچی سے ڈھاکہ پہنچنے والے تھے۔ اگرچہ سب کو معلوم تھا کہ ان کا ہوائی جہاز دیر میں آئے گا، لیکن مشتاق نگاہیں اپنے عزیز مہمان کے اشتیاقِ ملاقات میں تیسرے پہر سے آسمان پر ہوائی جہاز کو تلاش کر رہی تھیں۔ ڈھاکے والوں کو فخر تھا کہ اُن کا ہم وطن آج رونقِ محفل ہونے والا ہے۔ اس لئے سینکڑوں لوگ ہوائی میدان پر استقبال کے لئے کھڑے تھے۔ مشرقی بنگال کے وزیرِ اعظم آنریبل نورالامین، مشرقی بنگال کے دوسرے وزیر۔ اعلیٰ افسر شہر کے عمائد۔ یونیورسٹی کے محترم استاد۔ مسلم لیگ کے صدر اور اُن کے ہمراہ لیگ کے بہت سے کارکن۔ گورنر کے نمائندے اور مسلم لیگ نیشنل گارڈ کے رضا کار ہوائی جہاز

آنے سے کئی گھنٹے پہلے صفیں باندھے ہوائی میدان پر موجود تھے۔ وقت گزارنے کے لئے کہیں سیاست پر بحث ہو رہی تھی۔ کہیں موسم پر قیاس آرائیاں کی جا رہی تھیں۔ سب سے دلچسپ وہ گوشہ تھا جہاں چند احباب نے شعر و سخن کے تذکرے سے ڈھاکہ کے ہوائی میدان کو بزمِ ادب کی دلچسپ محفل میں بدل دیا تھا۔ مشرقی پاکستان کے دورانِ سفر میں اس کے بعد بھی شعر و سخن کی اکثر محفلوں میں مجھے شریک ہونے کا موقعہ ملا لیکن یہ پہلی مرتبہ مجھے ہوائی میدان پر معلوم ہوا کہ شرابِ ادب کا وافر حصہ ڈھاکہ کو ملا ہے، اور اس لحاظ سے بھی مشرقی پاکستان مغربی پاکستان سے کسی طرح کم نہیں۔

ہوائی میدان پر اگرچہ لوگ باتیں کر رہے تھے۔ مگر سب کے کان ہوائی جہاز کی آواز پر لگے ہوئے تھے۔ جب سورج غروب ہو گیا اور آسمان پر ہوائی جہاز کا کہیں پتہ نہ ملا تو سب کو ایک قسم کی تشویش سی ہونے لگی۔ کیونکہ ہوائی میدان پر رات کے اندھیرے میں ہوائی جہاز اترنے کا کوئی بندوبست نہیں تھا۔ ابھی اس معاملہ پر بحث ہو ہی رہی تھی کہ دُور سے سیاہ آسمان پر ہوائی جہاز کی سبز روشنی نظر آئی۔ ہوائی میدان سے کسی نے رہنمائی کے لئے سُرخ اور سبز شعلہ چھوڑا اور ہوائی جہاز نے اس کے سہارے زمین کا رُخ کرنا شروع کیا۔ ہجوم کی کیفیت اس وقت دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ ہر شخص کی نگاہیں آسمان کی طرف تھیں اور زبان پر دعا کے الفاظ۔ ہوائی جہاز جب زمین کے قریب آیا تو مجمع پر ایسی خاموشی طاری تھی جیسے ہر شخص خود ہوا باز کی طرح حفاظت سے ہوائی جہاز زمین پر اتارنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اور جب ہوائی جہاز نے زمین کو چھُو لیا تو بے ساختہ سب کی زبان سے الحمدللہ نکلا اور فضا اللہ اکبر کے نعروں سے گونج اُٹھی۔

مشرقی بنگال کے باشندوں کے دل میں جو محبت اور خلوص خواجہ صاحب کے لئے ہے اس کے مظاہرے دورانِ سفر میں اکثر ہوتے رہے۔ اور ۱۶ر جنوری سے لے کر ۲۵ر جنوری تک جو سرکاری اور غیر سرکاری مصروفیات رہیں وہ ضمانت تھیں اس خلوص کی جو اُن سب کے دل میں خواجہ صاحب کے لئے ہے۔ ان میں سے چند تقریبوں کا ذکر میں آپ کی دلچسپی کے لئے کرنا چاہتا ہوں۔ ۱۶ر جنوری کو تیسرے پہر خواجہ صاحب نے ڈھاکہ اسٹیشن کے نئے ٹرانس مٹر کا افتتاح کیا۔ یہ جلسہ ریڈیو پاکستان ڈھاکہ کے خوبصورت لان میں کیا گیا تھا۔ جس وقت خواجہ صاحب تقریر کرنے کھڑے ہوتے ہیں، قریب ہی درخت کی شاخ پر کوئل بیٹھی کوک رہی تھی۔ کوئل کی کوک کے پس منظر میں ریڈیو کے ٹرانس مٹر کا افتتاح تمام دنیا کے ریڈیو اسٹیشنوں کی تاریخ میں پہلی مثال ہے۔ مشرقی پاکستان کے سبزہ زاروں کی مناسبت سے بھی یہ بہت لُطف کی چیز تھی جسے سننے والوں نے دُور دُور تک سُنا ہو گا۔

۱۷ جنوری کی صبح کو فیل خانہ کے وسیع میدان میں بنگال پولیس کی سالانہ پریڈ تھی۔ صبح ساڑھے آٹھ بجے سے پہلے مہمان اور تماشائی میدان میں جمع ہونے شروع ہو گئے۔ پولیس کا بینڈ مہمانوں کی دلچسپی کے لئے نغمے چھیڑ رہا تھا۔ پہلے گورنر نے پریڈ کی سلامی لی۔ پھر تمغے اور انعامات تقسیم کئے۔ انعام پانے والوں میں ایک شخص کا نام مجھے اب تک یاد ہے مولوی محمد فقیر چند۔ انعامات تقسیم ہونے کے بعد مشرقی بنگال کے وزیر اعظم نے تقریر کی اور اُن کی تقریر کے بعد خواجہ صاحب نے پولس کے نوجوانوں سے خطاب کیا۔ اس تقریر کا سب سے دلچسپ حصہ جس کا ذکر مشرقی پاکستان کی اکثر محفلوں میں کئی روز تک ہوتا رہا وہ تھا جس میں خواجہ صاحب نے فرمایا کہ پہلے مائیں اپنے بچوں کو پولس کے نام سے ڈرایا کرتی تھیں۔ اب ہمیں کوشش کرنی چاہیئے کہ سب کو پولس پر کامل اعتماد ہو اور مصیبت کے وقت پولس سے مدد مانگیں۔

ڈھاکے کے چار روزہ قیام کے دوران میں اس کثرت سے خواجہ صاحب کے اعزاز میں ایٹ ہوم اور دعوتیں ہوئیں کہ اُن کی تفصیل صرف کام و دہن اور ذائقے کو ہی یاد رہ سکتی ہے۔ مصروفیت کا یہ عالم تھا کہ صبح سے لے کر رات گئے تک کوئی وقت خالی نہیں ملتا تھا۔

ان دعوتوں میں ایک قابلِ ذکر دعوت ڈھاکہ کے سردارانِ محلہ کی طرف سے دی گئی تھی۔ ڈھاکے کی قدیم تاریخی روایتوں میں اسلامی پنچایت کا ادارہ بہت مشہور ہے۔ اس ادارے کے ماتحت ہر محلے کا ایک سردار مقرر ہے۔ اس کے علاوہ چند عہدہ دار اور بھی ہوتے ہیں۔ محلے میں شادی غمی کے انتظامات سب اسی پنچایت کی معرفت طے پاتے ہیں۔ ہندوستان کے دوسرے شہروں میں شادی غمی کی خبر نائی لے کر جاتا ہے۔ مگر ڈھاکے میں اس کام کو ایک پنچایتی عہدہ دار انجام دیتا ہے۔ حد یہ ہے کہ مُردے کا غسل و کفن بھی پنچایت کے ممبروں کے ہاتھوں سرانجام پاتا ہے۔ پنچایت کا ادارہ بنگال میں اسلامی حکومت قائم ہونے سے پہلے سے قائم ہے چنانچہ کئی سو سال سے اس کی روایات ڈھاکے کی زندگی میں رس بس گئی ہیں۔ ڈھاکے کی پنچایت دو فریقوں میں تقسیم ہے۔ ایک کو بارہ کہتے ہیں اور دوسرے کو "بائیس" اصل میں یہ تقسیم زبان کی وجہ سے ہے۔

بارہ والی پنچایت کی زبان بنگالی ہے۔ اور بائیس والے سب کے سب اُردو بولتے ہیں۔ پنچایت کا سردار یہ منصب ورثے میں پاتا تھا لیکن اب اس کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ ان پنچایتوں کی چند اصطلاحیں دلچسپ ہیں۔ جو شخص موت کی خبر اور شادی کی نوید لے کر جاتا ہے اسے "گرید" کہتے ہیں۔ چاندہ وہ پنچایتی حصہ ہے جو پنچایت کے ممبر خاندانوں میں گھر گھر بھیجا جاتا ہے۔ پنچایت کے ممبر برادر کہلاتے ہیں۔ جو

شخص پنچایت کا باقاعدہ ممبر نہ ہو اسے "صلواتی" کہتے ہیں۔ اور پنچایت کے سامنے مقدمہ پیش کرنے والا "فریادی" کہلاتا ہے۔ سرداران محلہ کی طرف سے جو دعوت دی گئی تھی۔ اسے گویا تمام اہل شہر کی طرف سے دعوت سمجھنا چاہیئے۔

ایک اور دلچسپ دعوت مسلم چیمبر آف کامرس کی طرف سے شہر کے سوداگروں اور تاجروں نے خواجہ صاحب کو دی تھی۔ اس دعوت میں یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اب تجارت میں بھی مسلمان حصہ لے رہے ہیں۔ ۱۹ر جنوری کی صبح کو مشرقی پاکستان کے جنرل آفیسر کمانڈنگ میجر جنرل ایوب خاں نے خواجہ صاحب کو ایسٹ بنگال رجمنٹ کا ملاحظہ کرنے کے لیئے بلایا۔ اس موقعہ پر وزیر اعظم مشرقی بنگال، مشرقی بنگال کے دوسرے وزیر اور خاص خاص افسر بھی آئے تھے۔ سب نے مشرقی بنگال کے نوجوانوں کو فوجی تربیت پاتے دیکھ کر بہت خوشی ظاہر کی۔ اور جس مستعدی و تندہی سے یہ نوجوان کام سیکھ رہے تھے اس کی سب نے تعریف کی۔ فوجی تربیت اگرچہ سخت ضرور ہوتی ہے لیکن ان نوجوانوں نے چند ہی روز میں تربیت کے ڈھنگ رواں کر لیئے ہیں اور مشرقی پاکستان کے یہ سپوت بھی بہت جلد اپنے وطن کی حفاظت کے لیئے تیار ہو جائیں گے۔

۲۰ر جنوری سے ۲۴ر جنوری تک خواجہ صاحب نے راج شاہی۔ سارہ دا اور چاٹگام کا دورہ کیا۔ اور اس دورے میں بھی مختلف مقامات پر پبلک جلسوں میں تقریریں کیں۔ سپاسناموں کا جواب دیا۔ مہاجرین کے وفدوں سے ملے۔ پاکستان کے تمام صوبوں کے انسپکٹر جنرل صاحبان کی کانفرنس میں شرکت کی۔ غرض تعجب ہوتا ہے کہ اس مختصر قیام میں کتنے ضروری کام ہو گئے۔

میں ڈھاکہ شہر میں اگرچہ چند روز سے زیادہ نہیں ٹھہرا لیکن اس مختصر قیام میں بھی اس قدیم شہر کی چند باتوں کا میرے دل پر گہرا اثر ہوا ہے۔ پہلی مرتبہ جب میں اس شہر میں پہنچا ہوں تو رات ہو چکی تھی۔ مگر شب کی تاریکی کے باوجود اس شہر کی قدیم وضع سے ایک تاریخی عظمت برستی تھی۔ خاص خاص عمارتیں ہر شہر میں جاذب نظر ہوتی ہیں۔ لیکن ڈھاکہ کے قدیم باغات۔ پرانے محلے اور تاریخی مکانات اپنے دامن میں تاریخ کے دفتر چھپائے ہوئے ہیں۔ اس خصوصیت کی وجہ سے اس شہر میں ایک عجیب دلکشی پیدا ہو گئی ہے جس کا اثر ہر بات میں نمایاں ہے۔ بعض شہر اگرچہ بے حد خوبصورت اور خوشنما ہوتے ہیں مگر ان کے ماحول میں کوئی دلکشی نظر نہیں آتی۔ اس کے برخلاف ڈھاکہ میں قدم قدم پر مجھے قدیم روایات کی جیتی جاگتی تصویریں ملیں۔ اقبال کو سواد رومۃ الکبریٰ دیکھ کر دلی یاد آتی تھی۔ مجھے ڈھاکہ کے بازاروں اور گلیوں میں دلی کی جھلک نظر آئی۔ اس شہر کے بازاروں کے نام کس قدر تاریخی ماحول لیئے ہوئے ہیں

کاغذی ٹولہ۔ فراش گنج۔ جامدانی نگر۔ چوبدار ٹولی اور خواجہ دیوان۔

مسلمانوں کی موجودہ دور کی تاریخ میں ڈھاکہ کی اس لئے عظمت ہے کہ سب سے پہلے ہماری سب سے بڑی سیاسی جماعت مسلم لیگ کی بنیاد ١٩٠٦ء میں اسی شہر میں رکھی گئی تھی۔ اس لئے ڈھاکہ کے مسلمان اس بات پر جتنا بھی فخر کریں کم ہے کہ پاکستان کا سنگِ بنیاد اسی شہر میں رکھا گیا تھا۔ ڈھاکہ کے باشندوں نے مسلمانوں کی عملی سیاست میں جتنا حصّہ لیا ہے۔ غالباً کسی ایک شہر نے اتنا کام نہ کیا ہوگا۔ اس سلسلے میں ڈھاکہ کے نواب خاندان کا ذکر خاص طور سے کیا جاتا ہے۔ اور سچ تو یہ ہے۔ کہ ڈھاکے کے ہر حصّہ پر اس خاندان کی عظمت کی مُہر لگی ہوئی ہے۔ نواب احسن اللہ خاں مرحوم اور نواب سلیم اللہ مرحوم کے نام سے کون مسلمان واقف نہیں۔ اسی خاندان کے چشم و چراغ ہز ایکسیلنسی خواجہ ناظم الدین اس وقت ہمارے گورنر جنرل ہیں۔ جن کی سیاسی۔ دانائی، تجربے اور خلوص پر تمام قوم کو مکمل اعتماد ہے۔

ہز ایکسیلنسی اس ہفتے اپنے وطن تشریف لئے جا رہے ہیں۔ اور اہلِ ڈھاکہ نے ابھی سے اپنے سپوت کے استقبال کی شاندار طیاریاں شروع کر دی ہیں۔

ڈھاکہ کے عوام کی زبان لوگ کہتے ہیں کہ بنگالی ہے۔ مگر میرا تجربہ ہے کہ بازاروں میں ہر شخص نے میری اُردو سمجھی، اور میں نے ہر شخص سے اُردو ہی میں بات چیت کی۔ خواص کی اُردو کا تو یہ عالم ہے کہ اُن کی زبان اور تلفظ کے سامنے دلّی اور لکھنؤ کی اُردو شرماتی ہے۔

جیساکہ میں نے پہلے کہا تھا۔ اُردو شاعری کا ڈھاکہ میں خاص طور سے خوب چرچا ہے۔ اور یہاں خوش قسمتی سے اس وقت چند ایسے قادر الکلام شاعر موجود ہیں کہ اُردو ادب اُن پر فخر کرتا ہے۔ دِلّی اور لکھنؤ اجڑنے کے بعد رہا سہا اُردو کا مستقبل ڈھاکہ، کراچی اور لاہور ہی میں نظر آتا ہے۔ اور میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ موقعہ ملنے پر ڈھاکہ کا حصّہ اُردو کے ادبی ذخیرے میں بہت نمایاں ہوگا۔ کہ اس کی مٹی بہت زرخیز ہے۔ ریڈیو پاکستان ڈھاکہ اسٹیشن سے اُردو پروگراموں کے اضافے کی جو مانگ آ رہی ہے اس سے ایک ہلکا سا اندازہ اُردو سے عوام و خواص کی دلچسپی کا ہو سکتا ہے۔

مجھے خوش قسمتی سے چند روز کے لئے راج شاہی۔ سارداا اور چاٹگام بھی جانے کا موقعہ ملا۔ اور اس طرح سے مشرقی بنگال کے اندرونی علاقوں کو بھی دیکھ لیا۔ اس سفر کا سب سے دلچسپ حصّہ وہ تھا جو میں نے دریا کے سینے پر طے کیا۔ مشرقی پاکستان میں دریا سفر کا ایک بہت ضروری وسیلہ ہیں۔ اور ان دریاؤں سے بالکل وہی کام لیا جاتا ہے جو ہم سڑکوں سے لیتے ہیں۔ لیکن خوبی یہ ہے کہ ہر سڑک کے متوازی

جس قدر بے لُطفی گرد وغبار سے ہو جاتی ہے۔ اس کا اثر دریائی سفر میں کہیں نہیں ملتا۔ مشرقی پاکستان کے دریا مصروفیت کے لحاظ سے بھی سڑکوں سے کم نہیں۔ جس طرح وقت پر موٹر بسیں اور ٹرینیں چلتی ہیں۔ اسی طرح ان دریاؤں میں دُخانی جہاز اور میل اسٹیمر چلتے ہیں۔ ہر چند منٹ کے بعد پاس سے کوئی مسافروں سے بھری ہوئی کشتی نکل جاتی ہے۔ یا پٹ سن سے لدا ہوا بجرہ۔ ملک کی زرخیزی اور سرسبزی کا اندازہ بھی دریا کے سفر سے ہی ہوتا ہے۔ قدرت نے مشرقی بنگال کو جو دولت ونعمت دی ہے۔ اس کا اندازہ ہم مغربی پاکستان کے باشندے نہیں کر سکتے۔

صرف پٹ سن ہی کو لے لیجئے۔ تمام دنیا میں سب سے زیادہ پٹ سن مشرقی بنگال میں پیدا ہوتا ہے جس کی مانگ یورپ اور امریکہ کے ملکوں سے چلی آتی ہے۔ یہ بھی انہیں دریاؤں کے ذریعے چاٹگام کی بندرگاہ تک جاتا ہے۔ ملک کے اندرونی علاقوں میں اکثر بڑے بڑے شہر اور قصبے بھی دریاؤں کے کنارے آباد ہیں اور اُن کی دلکشی دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ مشرقی پاکستان کے بسنے والے قدرت کی رعنائیوں سے لطف اندوز ہونا کس قدر جانتے ہیں۔ راج شاہی کے سامنے دریا کا خوبصورت پاٹ اور اس کے دوسرے کنارے پر مرشد آباد کی غم میں ڈوبی ہوئی عمارتیں یا دریا کے موڑ پر سبزہ زاروں کے درمیان سارودا کا پولیس ٹریننگ کالج یہ سب نظارے میرے ذہن میں محفوظ ہیں۔ اور ان کی یاد مدتوں باقی رہے گی۔ مشرقی پاکستان کے چھوٹے چھوٹے دیہات بھی آرٹ کا عمدہ نمونہ ہیں۔ امیر زمیندار کا محل ہو یا غریب کاشتکار کا جھونپڑا۔ نفاست اور سلیقہ آپ کو ہر جگہ ملے گا۔ چاہے شہر ہو یا گاؤں۔ یہاں انسان نے قدرت کی نعمتوں سے جی کھول کر فیض حاصل کیا ہے۔ دریاؤں کے سینے پر کشتی کھینے والے ملاح کا گیت ہو یا زمین کے جگر پر ہل چلانے والے دہقان کی مدھ بھری آواز، مشرقی پاکستان میں رسیلے نغمے ہر جگہ ملتے ہیں۔ خوبصورت شہروں میں چاٹگام کی بندرگاہ اپنے قدرتی مناظر کے لحاظ سے لاجواب ہے۔ سبز چوٹیوں پر خوشنما بنگلے اور ان کے نیچے موجیں مارتا ہوا دریا۔ اسی دریا میں بڑے بڑے جہاز پاکستان سے مال لے جانے کے لئے دساور کی منڈیوں سے ہر روز یہاں آتے ہیں۔ قدرت کے اس عطیے کا ہم کہاں تک شکر ادا کریں۔ کہ ہمیں مشرقی پاکستان جیسا زرخیز اور سرسبز وشاداب علاقہ ملا۔ جہاں انسان کے قدم ہر وقت نرم گھاس کے سبز قالین پر چلتے ہیں۔ یہ قدرت کی فیاضی کا ایک ادنیٰ نمونہ ہے

مشرقی بنگال کی صبح کے منظر اکثر میں نے ٹرین میں سے دیکھے ہیں۔ اُجالا ہونے سے پہلے تمام رُوئے زمین پر ہلکا سا دُودھیا غبار چھا جاتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے فطرت کی مشاطہ سبزے کے رُخ پر سے باریک چادر جو ڈھاکہ کی ململ سے بھی زیادہ لطیف ہے۔ اُٹھا رہی ہے۔ اور اس کے پیچھے سویا ہوا سبزہ انگڑائی

لیتا ہوا سورج کی کرنوں سے ہم آغوش ہونے کے لئے بیقرار ہے۔

یہ مشرقی پاکستان کا ہلکا سا نقشہ ہے جو پچھلے بارہ دن میں میرے دل و دماغ پر پیوست ہو گیا۔ اور کل صبح جب ڈھاکے کے ہوائی میدان سے ہمارا جہاز کلکتہ کی طرف اُڑ رہا ہے تو میں دریا کے اُس موڑ کو تلاش کر رہا تھا۔ جہاں دو روز پہلے میں نے سفید بادبان والی کشتی میں مشرقی بنگال کے ملاح کا نغمہ سنا تھا۔
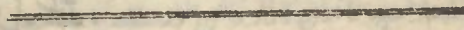
وزارتِ مہاجرین کی ایک جھلک

(۳۰ دسمبر ۱۹۴۸ء)

مہاجرین کے متعلق حکومتِ پاکستان کی اسکیمیں اور ان کو بسانے کی کوشش جو حکومت کے افسر کر رہے ہیں، ان کا حال آپ اکثر اخباروں میں پڑھتے ہیں اور ریڈیو کے ذریعے سنتے ہیں۔ آج ہم آپ کو وزارتِ مہاجرین کے دفتروں کی سیر کرانی چاہتے ہیں۔ تاکہ آپ کو یہ بھی معلوم ہو جائے۔ کہ مہاجرین کا مسئلہ حل کرنے کے لئے حکومتِ پاکستان کے عمّال کس طرح کام کرتے ہیں۔

مہاجرین کی آبادکاری اور ان کو بسانے کا کام ایک نہایت مشکل مسئلہ ہے جسے مختلف منزلوں میں سے گزرنا پڑتا ہے۔ ان منزلوں کو طے کرنے میں حکومتِ پاکستان کے بڑے سے بڑے افسروں سے لے کر چھوٹے سے چھوٹے درجے کے اہل کار شامل ہیں۔ اور جب تک اس مشین کے تمام کل پُرزے مل کر کام نہ کریں اس میں حرکت نہیں آسکتی۔ وزارتِ مہاجرین کے ایک کارکن مسٹر علی رہنما سے سنیئے کہ وزارتِ مہاجرین میں کام کیسے شروع ہوا اور اس نے مہاجرین کی خدمت کن حالات میں کی۔

کام کی ابتداء

مجھے اِس نئی وزارت میں آنے پر دو قسم کے نئے تجربے حاصل ہوتے۔ ایک تو نئے دفتر کے قائم کرنے کی ابتدائی مرحلوں سے متعلق ہے جس کا ذکر آپ کے لئے غیر دلچسپ ہوگا۔ البتہ دوسری قسم کے تجربہ کا حال سنیئے۔ ہم لوگ یعنی وزارت کے ملازم عام طور پر کاغذ پر کام کرنے کے عادی ہوتے ہیں

ہمارے کمروں میں سوائے شرکا رکار کے غیروں کی شکلیں شاذ و نادر ہی دکھائی دیتی ہیں۔ لیکن اُس وزارت میں پہلے ہی روز سے لوگوں کے ہجوم آنے شروع ہو گئے۔ کوئی اپنے بچوں کے لئے پریشان تھا۔ اور کوئی والدین کے لئے متفکر۔ کوئی رشتے داروں کی خیریت کا طالب تھا۔ اور کوئی عزیز دوستوں کی عافیت کا خواہاں مشرقی پنجاب اور دہلی سے انخلاء کا کام جاری تھا۔ خطرے میں گھرے ہوئے مسلمان پاکستان پہنچے ہوئے عزیزوں اور دوستوں سے مدد کے خواستگار تھے۔ یہ لوگ وزارت کے دفتر میں آتے تا کہ مدد کے طریقے نکالیں۔ عموماً گھبرائے ہوئے ہوتے تھے۔ عزیزوں کی مدد کرنا چاہتے تھے لیکن فاصلہ اور حالات حائل تھے۔ حکومت کے تعاون کے بغیر کچھ نہ ہو سکتا تھا چنانچہ یہ معمول بھی فرائضِ منصبی میں شامل ہو گیا تھا کہ دن دن بھران لوگوں کو تسلی دی جائے۔ حکومت کی ہمدردی کا یقین دلایا جائے۔ اور بتایا جائے کہ حکومت خطرے کے تمام مقامات سے مسلمانوں کو نکالنے کا انتظام کر رہی ہے۔ بارہا ان لوگوں کی بیان کی ہوئی دلدوز داستانوں پر آنسو بہانا پڑتے تھے قتل و غارت۔ بھوک پیاس اور جانی خطرہ کے تکلیف دہ حالات سُن کر دل کٹ جاتا تھا۔ اظہارِ ہمدردی یا تعزیت ایک انسانی فریضہ تھا۔

انخلاء میں ترجیح پانے کے خیال سے ملازمین حکومت اپنے اپنے خاندان والوں کی فہرستیں داخل کرتے تھے۔ یہ بڑی طویل ہوتی تھیں۔ اور گفتگو و اصرار کے باوجود بھی کوئی صاحب اپنی دی ہوئی فہرست میں کمی کرنے پر آمادہ نہ ہوتے تھے۔ بعض فہرستوں میں پچاس سے بھی اُوپر نام شامل تھے۔ اور یہ سب خاندان کے فرد کہلاتے تھے معلوم ہوتا ہے لفظ خاندان کی وسعت رشتے داروں سے گزر کر اہلِ محلہ تک پہنچا دی گئی تھی۔

وزارت کا دفتر شروع میں تمام سکریٹریٹ کے ساتھ کراچی میں تھا۔ لیکن مہاجرین کی آمد قریب قریب کُل کی کُل مغربی پنجاب کے راستے سے تھی۔ جس کی وجہ سے سرحدِ پاکستان میں مہاجرین کو قبول کرنے کی پہلی ذمہ داری مغربی پنجاب کی حکومت پر پڑتی تھی۔ یہ کام تنہا صوبائی حکومت کے بس کا نہ تھا۔ اسی لئے پاکستان کابینہ نے پاکستان پنجاب مشترکہ مہاجرین کونسل قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ ابتدائی دور میں وزارت کا بیشتر کام اسی کونسل کے مشورہ سے ہوتا رہا۔

حالات ہنگامی تھے نہایت کم وقت میں اہم فیصلے کرنے ہوتے تھے۔ وزارت کا دفتر کراچی میں تھا۔ اور کام کا تعلق مغربی پنجاب سے۔ اس مشکل کے پیشِ نظر وزارت کو قیام کے ڈیڑھ ہی مہینہ بعد لاہور منتقل کر دیا گیا۔ اب تک ہم لوگ مسئلۂ مہاجرین سے یا دفتر کے کاغذات کے ذریعے واقف ہوتے تھے یا دفتر میں آنے والوں کی زبانی۔ لاہور کی جانب سفر نے پہلا موقعہ دیا۔ کہ اس مسئلہ کے کچھ منظر آنکھوں کے

سامنے آئیں۔ ہماری اسپیشل سمہ سٹہ تک سکون سے گئی۔ لیکن سمہ سٹہ اسٹیشن پر پہنچتے ہی گاڑی کا استقبال
مہاجرین کے بہت بڑے اور بے چین مجمع نے کیا۔ جو سب کے سب گاڑی میں سوار ہونا چاہتے تھے
وہاں سے لاہور تک ہماری اسپیشل عجیب ہیئت سے گئی۔ مہاجرین کی بھیڑ صرف گاڑی کے اندر ہی نہ تھی۔
بلکہ چھتوں تک پر مہاجر ہی مہاجر بھرے ہوئے تھے۔

لاہور میں مشترکہ مہاجرین کونسل کے سامنے بڑا کٹھن کام تھا۔ ہفتہ میں دو دو اجلاس تک ہو جاتے
تھے۔ غیر رسمی مشورے تو گویا ہمہ وقت ہوتے رہتے تھے۔ خود وزیرِ اعظم صاحب حکومتِ پاکستان لاہور
ہی میں تشریف فرما تھے۔ ہر کام تیزی چاہتا تھا۔ اور تیزی سے کیا جاتا تھا۔ کام کی ہما ہمی میں کبھی یہ احساس ہی
نہ ہوا کہ ہم لوگ سکریٹریٹ سے کٹ کر علیحدہ پڑے ہوئے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ حکومت کی تمام تر
توجہ اسی ایک مسئلے پر مرکوز ہے اور لاہور پاکستان کا عملی پایۂ تخت ہے۔

سرکاری کام کی سُست رفتاری بدنامی کی حد تک مشہور ہے۔ لیکن ہماری وزارت نے تمام رسمی
کارروائیوں کو پسِ پشت ڈال کر صرف کام پر نظر رکھی۔ مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے درمیان کاغذات کے آنے
جانے کی رسمی پابندیوں سے ہی مشترکہ سکریٹریٹ بنا کر آزادی حاصل کر لی گئی تھی۔ عام طور پر صبح نو بجے سے
رات کے نو بجے تک دفتر کی نذر ہو جاتے تھے۔ جمعہ اور اتوار کے کوئی خاص معنی نہ تھے۔ رات کی ڈیوٹی
کے اسٹاف کا کام علیحدہ رہا۔ دراصل کام کے ہنگامے سے ایسا معلوم ہوتا تھا گویا ملک کسی جنگ سے دوچار ہے

حکومتِ پاکستان کے وزیروں اور افسروں سے ہر شخص مل سکتا ہے لیکن یہ ضروری ہے کہ
ملاقات کرنے والوں سے پہلے دریافت کر لیا جائے کہ یہ کس سے ملنا چاہتے ہیں۔ کیوں ملنا چاہتے
ہیں۔ اور جس افسر سے یہ ملنا چاہتے ہیں۔ وہ اس وقت مصروف ہیں یا انہیں ملنے کی فرصت بھی
ہے۔ اس کام کے لئے حکومت کے ہر دفتر میں ایک دفترِ استقبالیہ کھولا گیا ہے۔ جس میں
ملاقاتیوں کو پہلے جا کر تمام تفصیلات معلوم کرنی پڑتی ہیں۔ آیئے آج آپ کی ملاقات اُن صاحب
سے کرائیں۔ جو وزیرِ مہاجرین سے ملنے والوں کو معلومات بہم پہنچاتے ہیں۔ ان کا نام فدا حسین
ہے۔ اور یہ خود اپنے کام کی تفصیل آپ کو سنائیں گے۔

دفتر کی مُلاقات

میرا دفتر حکومت پاکستان کی سکریٹریٹ کے سامنے ہے۔ میرا کام یہ ہے کہ جو صاحب کسی سرکاری افسر

سے ملنے آئیں۔ اُن کا نام۔ کام اور جس افسر سے ملاقات مقصود ہو معلوم کر کے افسر سے بذریعہ ٹیلیفون پوچھ لوں کہ وہ ملاقات کر سکتے ہیں یا نہیں۔ اور جب افسر اجازت دے دیں تو پاس دے کر بذریعہ چپڑاسی اُن کے کمرے تک پہنچا دوں۔

روزانہ تقریباً ۲، ۳ سو صاحبان مختلف افسروں سے ملاقات کے لئے تشریف لاتے ہیں جن میں زیادہ تر تعداد مہاجر بھائیوں کی ہوتی ہے۔ مہاجرین عام طور پر وزیرِ مہاجرین سے ملنا چاہتے ہیں۔ اور وُہ صاحبان دُور دراز کا سفر طے کر کے آتے ہیں میں اُن کا نام اور جس کام کے لئے وُہ وزیرِ مہاجرین سے ملنا چاہتے ہیں دریافت کر کے وزیرِ مہاجرین کے پرائیویٹ سکرٹری صاحب کو بذریعہ ٹیلیفون پیغام پہنچا دیتا ہوں۔ بعد ازاں پرائیویٹ سکرٹری صاحب۔ اُن کو اپنے کمرے میں بلا لیتے ہیں۔ یا وزارتِ مہاجرین کے کسی ایسے افسر کے پاس جن سے اُن کے کام کا تعلق ہو بھیج دیتے ہیں۔

مجھے ایک حد تک اندازہ ہو چکا ہے کہ بہت سے مہاجرین ایسے کاموں کے لئے اپنا قیمتی وقت ضائع کرتے ہیں جس کام کو اُن کے ضلع کے حاکم یا مقامی افسر بھی کر سکتے ہیں مثلاً زمینوں یا مکانوں کا الاٹمنٹ۔ اغوا شدہ عورتوں کی بازیابی۔ ملازمت۔ راشن کی دوکان کا کوٹا۔ لاریوں کے پرمٹ وغیرہ وغیرہ۔ اگرچہ ہمارے وزیرِ مہاجرین ہر شکایت کو نہایت ہمدردی سے سُنتے ہیں۔ تاہم مہاجر بھائیوں سے میں کہتا رہتا ہوں۔ کہ وزیرِ مہاجرین سے ملنے کے لئے اُس وقت تشریف لا دیں۔ جب اُن کا کام اپنے ضلعوں کے حاکموں یا مقامی افسروں سے نہ ہو سکے۔ اسی طرح وُہ اپنا اور اپنے ہمدرد وزیر کا قیمتی وقت بچا سکتے ہیں۔ مقامی صاحبان کئی دفعہ ایک ہی مقصد کے لئے وزیرِ مہاجرین سے بار بار ملنا چاہتے ہیں۔ اُنہیں ہم۔ یا وزیرِ مہاجرین کے پرائیویٹ سکریٹری سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ ان کا کام بجائے وزیرِ مہاجرین کے فلاں فلاں افسر سے تعلق رکھتا ہے۔ مگر وُہ وزیرِ مہاجرین سے ملاقات کے لئے بہ ضد رہتے ہیں۔ میرا کام دلچسپ بھی ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ میں اسے مہاجرین کی خدمت بھی سمجھتا ہوں۔ میں خود مہاجر ہوں۔ اور اسی لئے مجھے مہاجرین کی تکلیفات کا احساس بھی ہے۔ اور جب کوئی مہاجر اپنی مصیبت بیان کرتا ہے تو میں فوراً اس کا پیغام وزیرِ مہاجرین کے پرائیویٹ سکرٹری تک پہنچا دیتا ہوں۔ اور اسی طرح یہ سلسلہ صبح کے ۱۰ بجے سے لے کر شام کے ساڑھے پانچ بجے تک جاری رہتا ہے۔

وزارتِ مہاجرین کا ایک فرض یہ بھی ہے کہ جو فیصلے حکومتِ پاکستان مہاجرین کی آبادکاری کے متعلق کرے ان کی اطلاع مہاجرین تک پہنچا دی جائے۔ یہ کام پاکستان کے اخبار اور

ریڈیو بھی کرتے ہیں۔ اور سچ تو یہ ہے کہ پاکستان کے اخبارات نے جس تندہی سے مہاجرین کی ترجمانی کی ہے اُس کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ پاکستان ریڈیو سے تو آپ مہاجرین کے متعلق سنتے رہتے ہیں لیکن حکومت کے فیصلوں کی اطلاع ایک سرکاری اخبار کے ذریعے سے بھی مہاجرین کو کرائی جاتی ہے۔ اس اخبار کا نام "نئی زندگی" ہے جو کراچی سے مہینے میں دو بار یکم و ۱۵ تاریخ کو اُردو اور سندھی میں چھپتا ہے۔ "نئی زندگی" خاص طور سے اُن مہاجرین کے لئے جاری کیا گیا ہے۔ جو مغربی پنجاب کے کیمپوں سے سندھ میں آئے ہیں۔ اور اب آہستہ آہستہ یہاں آباد ہو رہے ہیں۔ نئی زندگی کے ایڈیٹر فضل حق قریشی صاحب اپنے اخبار کے متعلق آپ کو کچھ باتیں بتائیں گے۔

نئی زندگی

مہاجرین کو آباد کر دینے کے بعد بھی حکومت کی ذمّے داریاں ختم نہیں ہوئیں۔ ملک کے اربابِ حل و عقد نے سوچا کہ ان مظلوموں کو نئے وطن سے مانوس کرے۔ انہیں دل لگا کر اپنے کام کاج میں حصّہ لینے اور پچھلی باتیں اور چھوڑے ہوئے وطن کو بھول کر اپنی نئی سلطنت کو مضبوط بنانے کے لئے ہر طرح طیار کیا جائے۔ دوسری طرف ضرورت تھی کہ سندھ کے باشندوں کو یہ بات اچھی طرح سمجھا دی جائے کہ ان مسلمان بھائیوں کو اپنے ساتھ ملا کر نئی دنیا آباد کرنا خود آپ کے لئے بھی مفید ہے۔ کیونکہ دراصل اپنے وطن میں رہتے ہوئے انہیں ایک نئی زندگی سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ اس مقصد کے لئے وزارتِ مہاجرین نے اپنی خاص نگرانی میں ایک پندرہ روزہ رسالہ کراچی سے نکالا۔ اس کا نام وقت کی مناسبت سے "نئی زندگی" رکھا گیا اور اسے اُردو اور سندھی میں الگ الگ شائع کرنا شروع کیا۔ الگ ہونے کے بعد بھی ان کے مضامین تقریباً یکساں ہوتے ہیں۔ لہذا ایک شخص کے لئے ان دونوں کا پڑھنا ضروری نہیں ہے

ابتدا میں تصویروں سمیت دونوں پرچوں کے الگ الگ دس صفحے رکھے لیکن جلد ہی چودہ کر دیئے گئے۔ آئندہ ضرورت کا لحاظ رکھتے ہوئے اس میں اور اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ اس رسالے کے صفحات میں تمام معلومات کی باتوں سے باخبر رکھنے کے علاوہ ایسے مضامین شائع ہوتے ہیں جن کا مطالعہ نئی زندگی کی ترقی و تعمیر میں نہایت مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ اس رسالہ کا سب سے اہم مضمون تاریخ اسلام کا ایک ورق ہے۔ فی الحال ہجرتِ نبوی کے واقعات دُہرائے جا رہے ہیں۔ ان واقعات کی یاد ہمیں محسوس کراتی ہے کہ ہجرت کرنا مسلمانوں کے لئے کوئی نئی بات نہیں ہے جب کہ ہمارے مذہب کی بزرگ ہستیوں اور خود رسول اللہ صلعم

نے اپنا وطن اور سب مال متاع چھوڑ کر نئی سرزمین پر نئے سرے سے زندگی بسر کی ہے۔ اور اس سلسلے میں ہر قسم کی مصیبتیں اٹھائی ہیں۔ ہمیں یہ بھی یاد آتا ہے کہ مکّہ سے ہجرت کر جانے والوں کے ساتھ انصارِ مدینہ نے کس قسم کا برتاؤ کیا۔ اور اس کی روشنی میں اب ہمارا فرض کیا ہے۔ اس رسالے کا دُوسرا مفید سلسلہ ہماری گھریلو صنعتوں سے متعلق ہے۔ پاکستان کے باشندے جو زیادہ تر دیہات میں آباد ہیں اپنے فالتو اوقات میں کوئی چھوٹا موٹا کام شروع کر سکتے ہیں جس سے اصل کاروبار میں فرق نہ آئے۔ بلکہ اپنی اور قومی آمدنی میں اضافہ ہوتا رہے۔ گھریلو صنعتوں کے لئے میدان بہت وسیع ہے اور انہیں اختیار کرنے کے لئے کسی چیز کی کمی محسوس نہیں ہوتی۔ خود ہمارے محبوب قائدِ اعظم مرحوم نے بارہا فرمایا ہے کہ قدرت نے ہمیں ہر چیز بڑی افراط سے دی ہے۔ اسے اپنے لئے مفید بنانا ہمارا کام ہے۔ اس پرچے میں ان فیصلوں کا بھی تفصیل سے ذکر ہوتا ہے۔ جو حکومت ان مہاجرین کی آبادکاری اور بحالی کے سلسلے میں وقتاً فوقتاً کرتی رہتی ہے۔ مثلاً یہ کہ مہاجرین کے لئے کتنے کمبل خریدے جائیں۔ اور انہیں کن کن ضلعوں میں کس طرح تقسیم کیا جائے۔ سرکاری حکیم اور ڈاکٹر مہاجرین کے علاج معالجے کے لئے کن علاقوں میں کب کب دورہ کریں۔ اور ان کے لئے دواؤں کا انتظام کس طرح کیا جائے۔ کھیتوں کے لئے بیل اور ہل بیج اور کھاد فراہم کرنے کے لئے کیا ترکیب کی جائے۔ پھر مہاجرین اور اہلِ سندھ جنہیں ہم انصار کہتے ہیں۔ اپنی اپنی شکایتیں لکھ کر ہمیں بھیجتے ہیں یا ضروری باتوں کی بابت دریافت کرتے ہیں۔ ہم ان کے سوالات کا جواب نئی زندگی کے صفحات میں شائع کرتے ہیں۔ وہ باتیں جن کا جواب ہم خود نہیں دے سکتے لکھ کر وزارتِ مہاجرین کے ذمے دار افسروں کو پہنچاتے ہیں تاکہ ان کا جواب آنے پر ہم اسے اپنے پرچے میں شائع کر دیں۔ نئی زندگی میں صحت و صفائی کی اہمیت اور تندرستی قائم رکھنے کے طریقوں پر بھی اظہارِ خیال کیا جاتا ہے۔ تاکہ نئے ماحول میں لوگ صحتِ جسمانی کا پُورا پُورا طرح خیال رکھ سکیں۔

اس خیال سے کہ یہ رسالہ صرف ہدایت کا دفتر بن کر خشک نہ رہے۔ دلچسپ کہانیاں، لطیفے اور نظمیں وغیرہ بھی اس میں شامل کی جاتی ہیں۔ تاکہ فائدہ کے ساتھ ساتھ کچھ تفریح کا سامان بھی فراہم ہوتا رہے۔ تصاویر کے دو صفحوں میں بھی انہیں باتوں کا لحاظ رکھا جاتا ہے۔ پھر لطف کی بات یہ ہے کہ اس رسالہ کی کوئی قیمت نہیں ہے ڈاک کے ٹکٹ تک اپنے پاس سے لگا کر اسے روانہ کیا جاتا ہے۔ ضرورت مند حضرات کو چاہیئے کہ خط کے ذریعے ہمیں اطلاع دیں۔ تاکہ ہم ان کے نام اور پتے پر یہ پرچہ ہمیشہ بھیجتے رہیں۔ ہمارا پتہ صرف اتنا ہے:۔

ایڈیٹر نئی زندگی پوسٹ بکس ۱۰۱، کراچی

وزیرِ مہاجرین یا ان کے پرائیویٹ سکریٹری سے ملنے کے بعد ہر شخص ایک درخواست بھی پیش کرتا ہے۔ اس کے علاوہ ہر روز ڈاک سے تقریباً دو سو خط وزارتِ مہاجرین میں پاکستان کے ہر حصے سے آتے ہیں جنہیں نہایت غور سے پڑھ کر متعلقہ شعبہ میں بھیج دیا جاتا ہے۔ ہر شعبہ ان خطوط کے متعلق ضروری کارروائی کرتا ہے۔ اور اس کی رپورٹ وزیرِ مہاجرین کی خدمت میں پیش کی جاتی ہے۔ وزارتِ مہاجرین کا تعلق براہِ راست مہاجرین سے ہے۔ کیونکہ اس کا فرض مہاجرین کی خدمت ہے۔ اب اخبارات۔ ریڈیو اور اسی قسم کے دوسرے ذریعوں سے مہاجرین کی امداد اور ہمدردی کی ترغیب تمام پاکستان میں دی جا رہی ہے۔ اور اس کام میں امیر، غریب، عورت، مرد سب شامل ہیں۔ ہمارے مہاجرین کی امداد کا کام صرف پاکستان ہی میں نہیں بلکہ دنیا کے دوسرے حصّوں میں بھی ہو رہا ہے۔ ایران۔ مصر، عرب اور بحرین سب اسلامی ممالک ہیں۔ اس لئے پاکستان کے مسلمانوں کو بجا طور سے ان کی ہمدردی کی امید ہو سکتی ہے۔ خوشی اس بات کی ہے کہ پچھلے ہفتے لندن میں بھی ہمارے مہاجرین کے لئے چندہ جمع ہوا۔ لندن کے اس میلے کا حال بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔

لندن میں مہاجرین کی امداد

لندن میں ۱۱ر دسمبر کو کرسمس میلے کے نام سے پاکستان کے ہائی کمشنر صاحب کی بیگم صاحبہ نے ریجنٹ پارک کے اسلامی مرکز میں ایک بازار منعقد کیا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ پاکستان میں مہاجرین کی مدد کی جائے بیگم رحمت اللہ خود تمام دکانوں اور اسٹالوں کا معائنہ و نگرانی کر رہی تھیں۔ اور پاکستانی افسروں کی بیویاں تمام دکانوں پر سامان فروخت کرنے کا انتظام کر رہی تھیں۔ شام کو پاکستان کے ہائی کمشنر مسٹر ابراہیم رحمت اللہ اور ان کی والدہ بھی اس میلے میں تشریف لائیں اور دو دکانوں سے کچھ سامان خریدا۔ سب سے زیادہ چہل پہل کی دوکان وہ تھی جہاں زرد اور سبز رنگ کے بیج اور پھول فروخت ہو رہے تھے۔ ان کو پاکستانی جھنڈے کے نمونے کے طور پر بنایا گیا تھا۔ یہ بیج میلہ شروع ہونے سے پہلے بھی پاکستانی خواتین نے لندن میں مہاجرین کی امداد کے لئے فروخت کئے تھے۔ معلوم ہوا ہے کہ لندن کے اس میلہ میں ۲ ہزار روپیہ کی آمدنی ہوئی۔ یہ رقم مہاجرین فنڈ کے لئے پاکستان بھیجی جا رہی ہے۔"

غرض اسی طرح دن رات پاکستان کے عمّال مہاجرین کی خدمت میں منہمک رہتے ہیں۔ کیوں کہ مہاجرین کا مسئلہ ہماری موت اور زندگی کا مسئلہ ہے۔ وزیرِ مہاجرین خواجہ شہاب الدین نے درست

فرمایا ہے کہ اس وقت پاکستان کی حفاظت کے سوال کے بعد اہمیت کے لحاظ سے دوسرا سوال مہاجرین کی آبادکاری کا ہے۔ اور پاکستان کی حکومت اس مسئلے کی اہمیت سے خوب واقف ہے "

اغوا شدہ عورتوں کی بازیابی

(۶ جنوری ۱۹۴۹ء)

آپ نے اخباروں میں پڑھا ہوگا کہ پاکستان کی پارلیمنٹ کا اجلاس آج کل کراچی میں ہو رہا ہے۔ یہ پارلیمنٹ، ہماری سب سے بڑی قانون ساز انجمن ہے۔ جس میں ہر ممبر کو اختیار حاصل ہے۔ کہ حکومت کے مختلف شعبوں اور محکموں کے متعلق وزیروں سے سوال دریافت کر سکتا ہے پارلیمنٹ میں مہاجرین کے متعلق اکثر سوال دریافت کئے جاتے ہیں۔ اور ان سوالوں کے جواب وزیرِ مہاجرین ممبروں کو دیتے ہیں۔

ابھی چند دن ہوئے مشرقی پاکستان کے ایک نمائندے نے وزیرِ مہاجرین سے اغوا شدہ عورتوں کے متعلق پارلیمنٹ میں سوال کئے تھے۔ ہم آج کے پروگرام میں آپ کو ان سوالوں کے جواب سُنانا چاہتے ہیں۔ مشرقی پاکستان کے نمائندہ نے دریافت کیا تھا۔

ممبر: آنریبل وزیرِ مہاجرین بتائیں گے کہ کیا یہ صحیح ہے کہ

(۱) پچاس ہزار سے زیادہ مسلمان عورتیں اور بچّے اغوا ہوئے ہیں۔

(۲) اور صرف ۷ ہزار یا اس سے کم کی بازیابی ہوئی ہے۔

وزیرِ مہاجرین: اغوا شدہ افراد کی صحیح تعداد بتانا ناممکن ہے۔ لیکن جہاں تک معلوم ہوا ہے اغوا شدہ مسلمان عورتوں اور بچوں کی تعداد ۴۶ ہزار سے کم نہیں ہے۔ ۶ دسمبر ۱۹۴۷ء کے بعد سے اب تک جن کی بازیابی ہوئی ہے ان کے ناموں کی مکمل فہرست طیار کی گئی ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے۔ کہ ۶ دسمبر ۱۹۴۷ء سے لے کر اب تک ۹ ہزار ۸۲۹ مُسلمان عورتیں اور بچّے مغربی پنجاب میں پہنچ چکے ہیں۔

ممبر: کیا آنریبل وزیرِ مہاجرین بتلائیں گے کہ

مشرقی پنجاب اور مغربی پنجاب کی ریاستوں میں جن لوگوں کے عزیز و اقارب رہ گئے ہیں یا گم ہو گئے ہیں۔ ان کے متعلق پاکستان میں بسنے والوں نے کتنی مرتبہ معلومات حاصل کرنے کے لئے حکومت کو لکھا ہے۔

وزیرِ مہاجرین، اس قسم کی معلومات حاصل کرنے والوں نے ۳ لاکھ پچاس ہزار اشخاص کے بارے میں دریافت کیا ہے۔

ممبر: کیا مغربی پنجاب میں کوئی ایسا دفتر کھل چکا ہے کہ جہاں گم شدہ لوگوں کے متعلق دریافت کیا جا سکے۔

وزیرِ مہاجرین: مغربی پنجاب کی حکومت میں مہاجرین کا محکمہ یہ خدمت انجام دیتا ہے۔

ممبر: اس قسم کے کتنے دفتر کھلے ہیں اور یہ آفس کہاں ہیں۔

وزیرِ مہاجرین: گم شدہ لوگوں کے متعلق جب کوئی استفسار کیا جاتا ہے تو چاہے یہ استفسار مغربی پنجاب کے محکمہ مہاجرین سے کیا جائے۔ یا کیمپوں کے کمانڈر سے یا صوبائی حکومتوں سے۔ ہر صورت میں معلومات حاصل کرنے والے کی خط و کتابت مغربی پنجاب کے محکمہ مہاجرین کو بھیج دی جاتی ہے۔

ممبر: کتنے گم شدہ لوگوں کے متعلق اس طرح معلومات کا پتہ چلا ہے۔

وزیرِ مہاجرین: اگر اس سوال کا مطلب یہ دریافت کرنا ہے کہ محکمہ مہاجرین سے معلومات حاصل کرنے کے بعد کتنے گم شدہ لوگوں کا پتہ چلا تو اس کا جواب ایک لاکھ پینسٹھ ہزار ہے۔

وزارتِ مہاجرین پاکستان اور مغربی پنجاب کے محکمہ مہاجرین میں ہر روز بہت سے خط گم شدہ عزیزوں اور رشتے داروں کے متعلق وصول ہوتے ہیں۔ ان خطوں میں اُن دردناک واقعات کو دہرایا جاتا ہے جو اگست ۱۹۴۷ء میں پیش آئے۔ ان میں سے ہر ایک خط کو محکمے کے افسر اور ان کا عملہ بہت غور سے پڑھتا ہے جو معلومات ان خطوں میں لکھی جاتی ہیں ان کی فہرستیں بنتی ہیں اور جہاں جہاں ان گم شدہ عورتوں اور بچوں کا پتہ چلتا ہے وہاں سے اس کے متعلق اور حالات دریافت کئے جاتے ہیں۔

اس قسم کے خطوں میں سے ایک نمونہ کا خط یہ ہے:۔

جناب وزیرِ مہاجرین پاکستان۔ السلام علیکم۔ عرض یہ ہے کہ میں مشرقی پنجاب کا رہنے والا ہوں اگست ۱۹۴۷ء میں جب فسادات ہوئے تھے۔ تو ان دنوں میں لاہور میں تھا۔ میرے گھر کے آدمی مارے گئے۔ اور میرے گھر کی پانچ لڑکیاں اغوا ہو گئیں۔ ان کے مکمل نام اور پتے اس خط کے ساتھ بھیج رہا ہوں۔ میری التجا ہے کہ میری ان لڑکیوں کو واپس لایا جائے براہِ مہربانی میری درخواست پر جلد از جلد غور کیا جائے۔

ایسے خطوں پر حکومت کے دفتر میں فوراً غور کیا جاتا ہے۔ اور ہندوستان کی حکومت کو لکھا جاتا ہے کہ جن

عورتوں اور بچّوں کا پتہ بتایا گیا ہے۔ ان کے متعلق تحقیقات کی جائے۔ چنانچہ اسی کوشش کا نتیجہ یہ ہے کہ اب تک تقریباً دس ہزار عورتیں اور بچے نکالے جا چکے ہیں۔ اسی طرح ہندوستان کی گورنمنٹ کو جن غیر مسلم عورتوں اور بچوں کا پتہ چلتا ہے کہ یہ پاکستان میں ہیں ان کے متعلق ہندوستان کی گورنمنٹ پاکستان کی حکومت کو لکھتی ہے۔ اور حکومتِ پاکستان کے افسران کا پتہ چلاتے ہیں۔ اس طرح ۵ ہزار کے قریب غیر مسلم عورتیں اور بچے پاکستان سے ہندوستان بھیجے جا چکے ہیں۔

معصوم بچّوں اور لاوارث عورتوں کو ان کے عزیزوں اور رشتہ داروں تک پہنچانا ایک ایسا نیک اور ثواب کا کام ہے کہ اسے مذہبی فریضہ سمجھ کر ادا کرنا چاہیئے۔ حکومت پاکستان اور گورنمنٹ آف انڈیا دونوں حکومتیں اس بات پر زور دے رہی ہیں کہ جہاں جہاں اغوا شدہ عورتوں اور بچوں کا سراغ ملے۔ اُنہیں فوراً نکال کر ان کے وارثوں کے حوالے کیا جائے۔ چنانچہ کراچی اور دہلی میں دونوں حکومتوں کے نمائندوں کے درمیان اس بارے میں متعدد بار بات چیت ہو چکی ہے۔ تاکہ عورتوں اور بچوں کی بازیابی کے متعلق کام کے طریقے سوچے جائیں۔ حکومتِ پاکستان اور گورنمنٹ آف انڈیا نے عہد کر لیا ہے کہ اس مشکل مسئلہ کو جلد حل کیا جائے گا۔ اور دونوں مملکتوں میں عورتوں پر جو ظلم کئے گئے ہیں ان کا انصاف ہوگا۔

اب فیصلہ ہوا ہے کہ پاکستان اور ہندوستان کی حکومتیں اپنے اپنے علاقے میں اغوا شدہ عورتوں کی بازیابی کی ذمہ دار ہوں گی۔ اور ایک حکومت دوسری حکومت کو ان لوگوں کے نام اور پتے بھیجے گی جو ایسی عورتوں اور بچوں کو اپنے یہاں چھپائے ہوئے ہیں۔ اس کام کو انجام دینے کے لئے پاکستان کے وزیرِ مہاجرین آنریبل خواجہ شہاب الدین اور ہندوستان کے وزیر آنریبل مسٹر گوپال سوامی آئنگر نے ایک مشترکہ اپیل جاری کی ہے۔

اپیل

انسانیت کے نام پر ہم دونوں مملکتوں کے باشندوں سے اپیل کرتے ہیں کہ اغوا شدہ عورتوں کو نکالنے میں حکومت کے افسروں اور سوشل کام کرنے والوں کی مدد کریں۔ ہندوستان اور پاکستان دونوں کے نام پر یہ ایک دھبّہ ہے جسے بہت جلد مٹا دینا چاہیئے۔ جب تک عوام میں اس قسم کا جذبہ پیدا نہیں ہوگا۔ اس وقت تک حکومت کے افسروں اور سوشل کام کرنے والوں کی کوششیں کامیاب نہیں ہو سکتیں۔ پبلک کو اپنی ذمہ داری کا پورا پورا احساس ہونا چاہیئے اب تک ہماری کوششیں صرف ایک حد تک کامیاب ہوئی ہیں۔ اس بُرائی کو پُوری طرح

سے دور کرنے کے لئے ہمیں اپنی کوششیں نئے سرے سے تازہ دم ہو کر شروع کرنی ہوں گی اس کام کے لئے ہم دونوں ملکوں کے باشندوں سے مدد کی اپیل کرتے ہیں۔ ہم حکومت کے افسروں اور سوشل کام کرنے والوں سے بھی اپیل کرتے ہیں کہ اپنی کوششیں دُگنی کر دیں۔ تاکہ یہ کام بہت تھوڑے عرصے میں پورا ہو جائے۔"

مہاجرین کی مصیبتوں کا بار ہلکا کرنے کے لئے حکومت نے جو تدابیر اختیار کی ہیں۔ ان کا ذکر آپ اکثر سنتے رہتے ہیں۔ لیکن یہ ایک اتنا زبردست کام ہے کہ صرف حکومت کی سرکاری امداد سے حل نہیں ہو سکتا۔ مہاجرین کا مسئلہ تمام پاکستان کا مسئلہ ہے۔ اور اسے حل کرنے کے لئے ہم سب کو مل کر کام کرنا ہو گا۔ حکومت مہاجرین کو ہل چلانے اور کاشت کرنے کے لئے زمینیں دے سکتی ہے۔ رہنے کو مکان دے سکتی ہے جب تک فصلیں طیار نہ ہوں اس وقت تک کے لئے حکومت کی طرف سے مہاجرین کو تقاوی کی شکل میں امداد مل سکتی ہے۔ سردی میں مہاجرین کو حکومت کی طرف سے کمبل اور گرم کپڑے دیئے جا سکتے ہیں۔ مریضوں کی دیکھ بھال کے لئے حکومت حکیم اور ڈاکٹر مقرر کر سکتی ہے۔ مگر حکومت کی یہ تمام تدبیریں اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتیں جب تک کہ ہم اور آپ اپنی اپنی ذمہ داری کا احساس نہ کریں۔ حکومت کی تدابیر اس وقت تک بے کار رہیں گی جب تک کہ ہم سب حکومت کے پروگرام کو کامیاب نہ بنائیں گے۔

وزارت مہاجرین کے پاس اکثر خطوط میں۔ اس بات کی شکایت کی جاتی ہے کہ فلاں شخص نے اپنا فرض ادا کرنے میں کوتاہی کی۔ فلاں شخص نے حکومت کے اعلان کے باوجود مہاجرین کی مدد نہیں کی۔ ایسے لوگ ملک اور قوم کے دشمن ہیں۔ کیونکہ جب تک ہم اور آپ اس مشکل مسئلے کو حکومت کے پروگرام کے مطابق حل نہیں کر لیتے پاکستان کا مستقبل شاندار نہیں بن سکتا۔

ایک غریب مہاجرہ نے اسی قسم کی شکایت بھیجی ہے۔

جناب وزیر مہاجرین۔ جناب کی خدمت میں مجھ بیوہ کی عرض ہے کہ میں ایک مہاجرہ ہوں میرے شوہر چار بچوں کو چھوڑ کر اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اور ان بچوں کا بار میں محنت مزدوری کر کے اٹھاتی رہی۔ لیکن قسمت نے یہاں بھی میرا ساتھ نہیں دیا۔ انقلاب آنے کی وجہ سے میں لاہور آ گئی۔ راستہ میں لڑکی کا جو کچھ بمشکل تمام میں نے جہیز جوڑ ا بنایا تھا وہ بھی لٹ گیا۔ لاہور میں مجھے رہنے کو کوئی مکان نہیں ملا۔ کچھ دن اپنے ایک عزیز کے یہاں رہی۔ مصیبت یہ آئی کہ ان کے مکان کو کسی اور نے الاٹ کرا لیا۔ حالانکہ وہ شخص مقامی باشندہ تھا۔ اور اس کے پاس رہنے کو اچھا خاصا مکان تھا۔ ہم نے اس کی بہت منت سماجت کی کہ خدارا ہمیں سر چھپانے کو یہ ٹھکانہ

دے دے مگر اس نے ایک نہ سُنی اور ہمیں نکلوا دیا۔"
اس قسم کے اکثر خط وزارتِ مہاجرین میں آتے رہتے ہیں۔ آپ نے کبھی غور کیا۔ مہاجرین کی مصیبتوں کو دُور کرنے میں ہم اور آپ کتنی مدد کر سکتے ہیں۔ جن صاحب نے زبردستی اس بیوہ کو مکان سے نکالا۔ اگر یہ اپنی جگہ پر غور کرتے کہ ان کی ذمہ داری کتنی زبردست ہے تو آج ہماری بہت سی مصیبتیں حل ہو جائیں۔ اگر ہم دوسروں کی مصیبت کو اپنی مصیبت سمجھیں۔ اور کسی دوسرے کے حصے پر ناجائز قبضہ نہ کریں تو دنیا کی آدھی مصیبتیں ختم ہو سکتی ہیں۔ اور یاد رکھیے جب تک ہم خود غرضی کی لعنت میں گرفتار رہیں گے اس وقت تک ہمیں ان مصیبتوں سے نجات نہیں مل سکتی۔

خدا کا شکر ہے کہ اس دور میں بھی کچھ ایسے نیک بندے موجود ہیں جو غریبوں کی مدد اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ مہاجرین کی خدمت میں دن رات ایک کر دیتے ہیں۔ اور اسی قسم کے نیک بندوں نے مصیبت میں اپنے بھائیوں کا ہاتھ بٹا کر اپنے لئے دنیا اور آخرت دونوں جگہ اعلیٰ مقام اور مرتبہ حاصل کیا ہے۔
اسی قسم کے ایک نیک انسان کی بھلائیوں کا حال ہمیں ایک مہاجر نے یُوں لکھ کر بھیجا ہے:۔
مشرقی پنجاب کی مصیبتیں جھیل کر ہم ایک سال تک لاہور کے کیمپ میں رہے۔ خدا کا شکر ہے کہ ہماری سب کی جان بچ گئی۔ اور پاکستان پہنچ کر ہمیں حکومت کی طرف سے ہر ممکن امداد کی گئی۔ جب ہمیں لاہور میں حکم ملا کہ ہم سب سندھ جائیں۔ تو ہمیں بہت افسوس ہوا۔ کیونکہ لاہور کے کیمپ سے ہمیں ایک قسم کی محبت سی ہو گئی تھی۔ لیکن جس گورنمنٹ نے ہماری اتنی مدد کی تھی۔ ہم اُس کا حکم کیسے نہ مانتے۔ ہم سب ریل میں بیٹھ کر سندھ آ گئے۔ سندھ میں ہمیں ایک جگہ اتار دیا گیا۔ لاہور کیمپ کے ایک افسر ہمارے ساتھ تھے۔ اور ہم دس دن کا راشن اپنے ساتھ لائے تھے۔ دو دن تک تو ہم اسٹیشن کے پاس ہی ایک میدان میں رہے اس کے بعد ہمیں ایک گاؤں بھیج دیا گیا۔ اس گاؤں کے مسلمان بہت نیک دل مسلمان ہیں۔ یہ گاؤں سے کئی میل آگے ہمارے لینے کو کھڑے تھے۔ ان کے ساتھ گاؤں کے اور آدمی بھی تھے۔ ان سب نے بہت محبت سے ہمیں اپنے گاؤں میں جگہ دی۔ گاؤں کے چند مکان خالی تھے اُن ہی میں ہمیں اُتارا گیا۔ گورنمنٹ کے افسران نے ہمیں راشن دیا۔ اور چوتھے روز مختار کار نے ہمیں زمینیں الاٹ کرنی شروع کیں۔ ان میں سے کچھ زمینیں اچھی تھیں کچھ کی حالت اچھی نہیں تھی۔ مگر زمیندار صاحب نے کہا تم بے فکر رہو میرے آدمی ہل کر ہل چلائینگے ہل چلانے کے لئے ہمارے پاس بیل بھی نہیں تھے۔ زمیندار صاحب کے آدمیوں نے ہمیں

بیل دیئیے۔ کاشت میں ہماری مدد کی۔ اور اب ہم سب اس گاؤں میں بھائی بھائی کی طرح رہتے ہیں۔ خدا ان زمیندار صاحب کو خوش رکھے۔

واقعی خوش نصیب ہیں وہ مہاجر جن کا ایسے نیک انصار سے سابقہ پڑے۔ ہم میں سے ہر شخص خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا۔ امیر ہو یا غریب اسی طرح مہاجرین کی مدد کر سکتا ہے۔ کیونکہ مہاجر پاکستان کی امانت ہیں اور جیسا کہ قائدِ اعظمؒ نے فرمایا تھا۔

"جب تک ہم تمام مہاجرین کو آباد نہیں کر لیتے ہم پر عیش و آرام حرام ہے۔"

مہاجرین اور اسلامی ممالک

مغربی پاکستان میں اس وقت ۷۰ لاکھ سے زائد مہاجرین پناہ لینے کے لئے ہندوستان اور ہندوستانی ریاستوں سے آئے ہیں جس بے سروسامانی اور پریشانی کی حالت میں ۷۰ لاکھ مہاجرین پاکستان آئے۔ ان کی مصیبت کی داستان اب تمام دنیا کو معلوم ہو چکی ہے۔ اور آیندہ تاریخ لکھنے والا پاکستان کی تاریخ میں جب مہاجرین کی مصیبتوں اور پریشانیوں کا باب لکھنے بیٹھے گا تو اسے مہاجرین کے حالات تلاش کرنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی۔ کیونکہ ان واقعات سے پاکستان کا بچہ بچہ واقف ہے۔ پاکستان نے اس خطرناک دور میں جو مرحلے طے کئے ہیں۔ اب اگر ہم مڑ کر انہیں دیکھیں تو آج بھی سننے والوں کے دل لرز اٹھتے ہیں۔ اور جن پر یہ حقیقت بیتی تو وہ خاص طور سے اسے تمام عمر نہیں بھلا سکتے۔ فضل الرحمٰن صاحب سے ان کی آپ بیتی سنئیے:۔

پاکستان میں مہاجرین کی آمد

میری زندگی میں ۲۷ ستمبر ۴۷ء بھی ایک یادگار دن تھا جب کہ ہم اپنا سب کچھ چھوڑ کر دہلی سے روانہ ہوئے جس مصیبت اور تباہی کی حالت میں ہم اپنے گھر سے نکلے ہیں اس کے خیال سے ہی رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ لاکھ کوشش کی کہ کسی طرح کراچی کے ٹکٹ مل جائیں لیکن نہ ملنے تھے نہ ملے۔ آخر کوئٹے کے ٹکٹ خرید کر بیوی بچوں کو ہمراہ لے بغیر کسی سامان کے گھر بار چھوڑ کر خدا کے بھروسہ پر ہوائی جہاز سے ہی کوئٹہ روانہ ہو گیا۔ ایک تو اتنی بے سروسامانی کہ ہمارے پاس تن کے کپڑوں کے علاوہ پانی پینے کے لئے گلاس تک نہیں تھا۔ دوسرے کچھ عزیز ہمارے ابھی خطرے میں تھے۔ اس لئے ہم سب بے حد فکرمند تھے۔ خاص طور پر میری بیوی بلکہ وہ تو رونے لگی۔ میں نے کہا بیگم یہ وقت تو صبر اور خدا کو یاد کرنے کا ہے۔ جس کی جان بھی بچ جائے غنیمت سمجھو۔ اور پیسہ تو آنی جانی چیز ہے۔ غرض بہ ہزار خرابی ہم کوئٹہ پہنچے۔ اور تیسرے روز وہاں سے کراچی روانہ ہو گئے۔

بذریعہ ریل جب میں کوئٹہ سے روہڑی پہنچا تو دیکھا کہ لاہور سے آنے والی گاڑیوں سے ہزاروں مہاجرین کراچی کی طرف آرہے تھے۔ ٹرینوں کی حالت یہ تھی کہ تمام گاڑیاں مہاجرین سے لپی ہوئی تھیں۔ یعنی چھت پر اور گاڑیوں کے پائیدانوں پر حد یہ کہ انجن پر بھی مہاجرین ہی مہاجرین دکھائی دیتے تھے۔

اگرچہ میں رہنے والا دہلی کا ہوں لیکن کاروباری سلسلے میں ۱۹۱۴ء سے کراچی برابر آتا جاتا رہتا ہوں۔ کراچی میں لوگ مجھے دلی والا کہتے ہیں۔ اور دہلی میں کراچی والے کے نام سے مشہور رہا ہوں۔ اس لئے میں کراچی کے لئے نیا نہیں تھا۔ مگر اب کی دفعہ جو میں کراچی آیا تو میں نے یہاں پہلے کی بہ نسبت زیادہ بھیڑ بھاڑ دیکھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ساری دنیا یہیں امڈی چلی آتی ہے۔ اور ہر شخص پریشان تھا۔ کیونکہ ساری کائنات پیچھے چھوڑ آیا تھا۔ اور نہیں جانتا تھا کہ مجھے یہاں کیا کرنا ہے۔

میں نے کراچی آکر یہ بھی سُنا کہ گورنمنٹ نے کیمپ کھول دیئے ہیں۔ اور اس میں مہاجرین کو ٹھہرایا جارہا ہے۔ غرض کراچی پہنچ کر اطمینان کا سانس آیا۔ اور یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ پاکستان میں مہاجرین کے لئے بہت سی سہولتیں ہیں۔ گورنمنٹ کی طرف سے کیمپوں میں راشن کا مفت انتظام ہے۔ اور کچھ مخیر حضرات نے ایسا بندوبست کیا ہے کہ مہاجرین کو قرضِ حسنہ دے کر انہیں چھوٹے چھوٹے کاروبار میں لگا دیتے ہیں۔ اور پاکستانی بہنوں نے تو اس آڑے وقت میں ایسی ہمت دکھائی کہ جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ رات دن گھر گھر پھر کر مہاجرین کے لئے چندے جمع کئے۔ گرم کپڑے جمع کئے اور اس طرح مہاجرین اور دُکھے ہوئے دلوں کے لئے مرہم کا کام کیا۔

ستم رسیدہ مہاجرین کے دلوں پر صرف پاکستانی بہنوں اور بھائیوں نے ہی مرہم نہیں رکھا بلکہ تمام دنیا میں جس جس نے ان کی داستان سُنی اس نے ان سے ہمدردی کی۔ خاص طور پر اسلامی ممالک نے کہ جن سے پاکستان کا روحانی اور ایمانی رشتہ ہے۔ ان تمام ملکوں کے مسلمانوں نے اس مصیبت کے وقت اپنی اپنی بساط کے مطابق پاکستان کے مہاجروں کی مدد کی۔ پاکستان کے پایۂ تخت کراچی کے قدموں میں بحیرۂ عرب کی لہریں ہر وقت لوٹتی ہیں۔ اور یہی لہریں کچھ اور آگے جاکر خلیج فارس سے مل جاتی ہیں۔ خلیج فارس کے کنارے پر ایران کی سلطنت ہے اور اس کے سامنے ایک چھوٹی سی آبادی بحرین کے نام سے مشہور ہے۔ جس طرح بحرین کی سرزمین پر تیل کے چشمے اُبلتے ہیں اس سے کہیں زیادہ بحرین کے مسلمانوں کے دل میں پاکستان کی محبت کا سمندر موجزن ہے۔ جن میں خلوص کے آبدار موتی بھرے ہیں۔ مصیبت کے وقت بحرین کے مسلمانوں

نے پاکستانی مہاجرین کی جس طرح مدد کی اس کا حال بحرین کے شیخ محمد بن مصطفٰے سے سُنیئے۔

بحرین کے مُسلمان

بحرین عربی میں دو سمندروں کو کہتے ہیں۔ بحرین دو جزیروں پر منقسم ہے۔ مگر یہ دونوں جزیرے بحرین کے نام سے مشہور ہیں۔ اور خلیج فارس میں واقع ہیں۔ بحرین کی کل آبادی تقریباً ایک لاکھ نفوس کی ہے۔ وہاں بہترین موتی ہوتا ہے اور زیادہ تر موتی کی تجارت ہوتی ہے۔ وہاں تیل کے چشمے بھی ہیں۔ اس چھوٹی سی آبادی کے لحاظ سے ماشاء اللہ یہ لوگ جمیع عالمِ اسلام اور خصوصاً پاکستان کی خدمت کے لئے ہمیشہ کوشاں رہتے ہیں۔ بحرین کے مسلمان پاکستان کے ہمیشہ ہمدرد رہے ہیں خصوصاً ضرورت مند مہاجرین کی دل سے خدمت کرتے ہیں۔ چنانچہ جب کبھی پاکستان نے مہاجرین کی امداد کے لئے اپیل کی ہے فوراً مسلمانان بحرین نے بخوشی اپیل منظور کرتے ہوئے چندہ فراہم کرنا شروع کر دیا ہے۔ جہاں تک مجھ کو یاد ہے پہلی مرتبہ چندہ جنوری ۱۹۴۷ء میں فراہم کیا تھا جو کہ مہاجرینِ بہار کی امداد کے لئے ہوا تھا۔ اور جس کی تعداد تقریباً تیس ہزار روپیہ تھی۔

اس کے بعد دوسری مرتبہ چندہ قائدِ اعظم ریلیف فنڈ کے واسطے فراہم کیا گیا۔ جس کی تعداد تریسٹھ ہزار روپیہ تھی۔ یہ تمام رقم خود میرے والدِ بزرگوار شیخ مصطفٰے ابن عبد اللطیف نے مسلمانانِ بحرین کی درخواست پر قائدِ اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں پیش کی تھی۔ بعد ازاں نومبر ۱۹۴۷ء میں گرم سِلے ہوئے اور بغیر سِلے ہوئے کپڑوں کے اکیس عدد بنڈل مسلمانانِ بحرین نے مہاجرین کی امداد کے لئے پیش کئے تھے۔ اور اس کے بعد ۱۹۴۸ء میں بھی دو بنڈل کپڑا بحرین سے مہاجرین کے لئے روانہ کیا گیا۔ آج کل باشندگانِ بحرین کشمیر فنڈ کے لئے چندہ جمع کر رہے ہیں۔ اور اب تک تقریباً پچیس ہزار روپیہ فراہم کر چکے ہیں۔

روپے کی فراہمی کا یہ کل کام چند پاکستانی اور چند عرب صاحبان کی سرگرم کوشش سے انجام کو پہنچا ہے مثلاً شیخ اسحٰق بن عبد الرحمٰن اور جاسم بن محمد کانو صاحبان وغیرہ۔

علاوہ اس کے بحرین میں ہر سال پاکستان ڈے زیرِ اہتمام شیخ بحرین ہز ہائی نس شیخ سلمان بڑی شان و شوکت کے ساتھ منایا جاتا ہے۔

میں حال ہی میں بحرین سے یہاں آیا ہوں۔ وہاں پر مجھے یہ بات دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی کہ بحرین کے عرب اور ایرانی باشندگان پاکستان کے معاملات میں بڑی سرگرمی و جوش کے ساتھ حصہ لے رہے ہیں جب کبھی میں اُن لوگوں سے ملاقات کرتا تھا وہ ہمیشہ پاکستان کے معاملات پر گفتگو کرتے تھے۔ درحقیقت وہاں پر سب

لوگوں کو پاکستانی معاملات سے بہت گہری دلچسپی ہے۔ میں خدا کی ذات سے امید رکھتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ مہاجرین کی آبادکاری کے متعلق سب کام اطمینان و سہولیت کے ساتھ انجام پا جائیں۔ آخر میں یہ دعا کرتا ہوں کہ سلطنت پاکستان و مسلمانانِ دنیائے اسلام کو روز افزوں ترقی اور خوش حالی حاصل ہو اور سلطنتِ پاکستان کا بڑی سلطنتوں میں شمار ہو۔ آمین۔

بحرین کے سامنے خلیج فارس کے دوسرے کنارے پر ایران کی سرزمین ہے۔ وہی سرزمین کہ جس میں آبِ رکنا باد اور گلگشتِ مصلیٰ کے نغمے آج بھی گائے جاتے ہیں۔ ایران پاکستان کا ہمسایہ ملک ہے۔ اور ہماری تہذیب، تمدن اور زبان کی کڑیاں ایران سے ملتی ہیں۔ اس لئے تعجب نہیں کہ پاکستانیوں کی مصیبت میں ایرانیوں نے اپنی اس روایتی سخاوت اور کشادہ دلی سے کام لیا کہ جس کا سبق مسلمانوں نے تمام دنیا کو پڑھایا تھا۔ ممتاز احمد صاحب حال میں ایران سے واپس آئے ہیں۔ اُن کی زبانی ایرانیوں کی محبت اور خلوص کا حال سُنیئے۔

ایرانیوں کی مہاجرین سے ہمدردی

یہ امر ہم سب کے لئے بے حد تشکر کا موجب ہے کہ ایران سب سے پہلا ملک تھا جس نے پاکستان میں مہاجرین کا مسئلہ شروع ہوتے ہی نئی اسلامی سلطنت کی طرف دوستی اور محبت کا ہاتھ بڑھایا اور مالی امداد بھی۔ ایران کے متعدد سیاسی اور مذہبی رہنماؤں نے نہ صرف مرحوم قائدِ اعظم کو پوری ہمدردی اور امداد کا یقین دلایا۔ بلکہ انہوں نے اہلِ ایران سے بھی اپیل کی کہ وُہ پاکستان کو ان مشکلات سے رہائی حاصل کرنے میں حتی الامکان مدد دیں۔

جس وقت پاکستان معرضِ وجود میں آیا۔ ایران میں آقائے قوام السلطنۃ وزیرِ اعظم تھے۔ اور ایران خود کئی ایک اندرونی مسئلوں سے دوچار تھا۔ لیکن جونہی پاکستانی مہاجرین کی تکالیف و مصائب کی داستان اس ملک میں پہنچی۔ حکومت نے فوراً ایک گراں قدر رقم ان کے آرام اور بحالی کے لئے ارسال کی۔ اور یہ سب سے پہلی بیرونی امداد تھی جو پاکستان کی نوزائیدہ سلطنت کو حاصل ہوئی۔ حکومتِ ایران کے اس دوستانہ اقدام نے دونوں ملکوں کے مابین یگانگت کے جذبات کو مزید نمایاں کر دیا۔ آقائے قوام السلطنۃ کے علاوہ ایران کے سابق وزیرِ اعظم آقائے سید ضیاء الدین طباطبائی اور مشہور مذہبی رہنما سید ابو القاسم کاشانی نے بھی پیغامات کے ذریعے حکومتِ پاکستان کو پوری ہمدردی اور امداد کا یقین دلایا۔ اور اپنی قوم کو پاکستان

کی امداد کی ترغیب دی۔ جس کے نتیجے میں ایران کے مختلف حصوں سے مہاجرین فنڈ کے لئے چندہ بھیجا گیا۔ طہران۔ زاہدان اور آبادان میں مقیم پاکستانی تاجروں اور ملازمین نے بھی کافی امدادی رقوم بھیجیں۔

آج اس بات کو قریباً ڈیڑھ سال کا عرصہ ہو گیا ہے۔ لیکن مہاجرین کے بارے میں ایرانی اخبارات اور عوام کی دلچسپی پاکستانیوں سے کم نہیں ہے۔ ایران میں اپنے چھ ماہ کے قیام کے دوران میں میں نے دیکھا کہ پاکستانی مہاجرین کے بارے میں اخبارات خبریں۔ تصویریں اور مضامین بڑے نمایاں طور پر شائع کرتے ہیں۔ اور ان کی بحالی پر خوشی اور اطمینان کا اظہار کرتے ہیں۔ رسمی اور غیر رسمی تقریبات اور دعوتوں میں ایرانی دوست اکثر مہاجرین کے مسئلہ کو گفتگو کا موضوع بناتے ہیں۔ اور اس بارے میں پاکستان سے تازہ خبروں پر بحث کرتے ہیں۔ ہوٹلوں اور قہوہ خانوں میں اگر کسی صاحب سے راہ ورسم پیدا ہو جائے تو ان کی دلچسپی کا مرکز زیادہ تر مہاجرین کا مسئلہ ہوتا ہے۔ چند ماہ سے میں نے پاکستانی سفارت کے دروازے کے نزدیک شیشے کے دو بڑے چوکھٹے بنوا کر آویزاں کروا دیئے ہیں۔ اور ان میں مہاجرین کی تصویریں چسپاں کی جاتی ہیں یہ تصویریں شروع دن سے ہی عوام کی کشش کا موجب بن گئی ہیں۔ اور سارا دن آتے جاتے لوگوں کی ایک خاصی تعداد ان تصویروں کے مطالعہ میں محو نظر آتی ہے۔

آپ کو یاد ہو گا۔ کہ پچھلے سال شروع اگست میں جب مسٹر غضنفر علی خاں پاکستان کے سفیر کی حیثیت سے ایران میں داخل ہوئے۔ تو اہلِ ایران کی طرف سے ان کا نہایت پرجوش استقبال کیا گیا تھا۔ اکثر ایرانی اخباروں نے اپنی قوم کے اس اظہارِ محبت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا۔ کہ ایرانیوں کے لئے یہ موقعہ بے حد مسرت اور فخر کا باعث ہے کہ وہ اپنی ہمسایہ اسلامی سلطنت کے پہلے سفیر کا خیر مقدم کر رہے ہیں۔ جو نہ صرف حصولِ پاکستان کی جدوجہد میں قائدِ اعظم کے دستِ راست تھے۔ بلکہ جنہوں نے بعد ازاں بطور وزیرِ مہاجرین ساٹھ لاکھ مہاجرین کے مسئلہ کو حل کرنے کے لئے دن رات محنت اور فکر سے کام کیا ہے۔

مجھے شروع دسمبر میں مسٹر غضنفر علی خاں کے ہمراہ دو ہفتے عراق میں بھی بسر کرنے کا اتفاق ہوا ہے۔ اور ہمارے مہاجرین کے بارے میں جو جذبۂ ہمدردی میں نے ایرانیوں میں دیکھا۔ وہی میں نے عربوں میں پایا۔ بغداد میں دس روزہ قیام کے دوران میں مختلف لوگوں سے ملنے کا موقعہ ملا۔ اور میں نے محسوس کیا کہ پاکستان کے مسائل میں اُن کی دلچسپی کسی سے کم نہیں ہے۔ یہ امر ہم سب کے لئے حوصلہ افزا ہے کہ پاکستان نے جس بہادری اور استقلال سے مہاجرین کے مسئلہ کو برداشت کیا ہے اُس نے مشرقِ وسطیٰ کے لوگوں کے دلوں میں پاکستان کے لئے بے حد احترام پیدا کر دیا ہے۔ اور اُن لوگوں کا یقین ہے کہ پاکستان ایک روز دنیا کے طاقتور ملکوں میں شمار ہو گا۔

مشرقِ وسطیٰ کے ملکوں میں بسنے والے مسلمانوں کی ہمدردی کا ذکر آپ نے سُنا مشرقِ بعید میں بھی جا بجا مسلمانوں کی آبادی ہے۔ جن کا رُوحانی رشتہ پاکستان سے وابستہ ہے۔ ان مسلمانوں نے پاکستان بنتے ہی ہم سے جس ہمدردی اور اخوت کا ثبوت دیا۔ اس کی ہلکی سی جھلک سنگاپور کے مسلمانوں کے رویّے سے ملتی ہے۔ اس کا حال آپ کو آفتاب نقوی سناتے ہیں۔

مشرقِ بعید کے مسلمان

سنگاپور جزیرہ نما ملایا کی آخری سرحد پر جنوب مشرقی ایشیا میں سب سے بڑا شہر ہے۔ اور تجارت کا مرکز ہونے کی وجہ سے یہاں سیام۔ برما۔ ہندچینی۔ چین۔ جاوا۔ سماٹرا اور دوسرے جزیروں کے باشندے آباد ہیں۔ ملایا میں پچاس فی صدی سے زیادہ تعداد مسلمانوں کی ہے۔ سنگاپور کے اخباروں میں ۱۴ اگست سے کئی روز پہلے تقسیمِ ہند کی خبریں نمایاں طور پر چھپ رہی تھیں۔ آخر ۱۴ اگست کا دن آپہنچا۔ اس روز شام کو کراچی سے تار کے ذریعے ہمیں پاکستان کے جھنڈے کا ڈیزائن ملا۔ مگر راتوں رات سینکڑوں پاکستانی جھنڈے تیار ہو گئے۔
۱۵ اگست کو سنگاپور میں پاکستانی فوج کے دستوں نے جو وہاں مقیم تھے اپنے قومی جھنڈے کو سلامی دی۔ جگہ جگہ شہر میں مسلمان دوکانوں پر پاکستانی جھنڈے اُڑتے نظر آتے تھے اور شام کو اکثر احباب نے اس جشن کی خوشی میں مختلف جگہ دعوتیں دی تھیں۔ چند دن بعد پاکستانی فوج کے افسروں نے ایک شاندار ڈنر دیا جس کے مہمانوں میں غیر ممالک کے نمائندے اور پاکستان کے بہت سے ہمدرد بھی شامل تھے۔ اس دوران میں خبریں آنے لگیں کہ لاکھوں مسلمان مہاجرین کی شکل میں پاکستان میں داخل ہو رہے ہیں۔ ان خبروں کا ذکر سنگاپور کے اخبار اور ریڈیو نمایاں طور سے کرتے تھے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ صرف پاکستانی مسلمان ہی نہیں بلکہ دوسرے مسلمان بھی مہاجرین کی تکلیفوں کو اپنی تکلیف سمجھنے لگے۔ ہر مسلمان بے چین نظر آتا تھا۔ بازار میں اگر کسی ملائی، چینی یا برمی مسلمان سے ملاقات ہو جاتی تو وہ فوراً انتہائی ہمدردی کا اظہار کرتا۔ ہمارے پاکستانی لیڈروں کے نام وہاں کے لوگ صبح سے شام تک اس طرح لیتے تھے جیسے یہ انہی کے لیڈر ہوں۔ وہاں کے لوگوں میں پاکستانی مہاجرین کی مدد کا جذبہ بھی موجود تھا۔ چنانچہ قائدِ اعظم ریلیف فنڈ میں لوگوں نے دل کھول کر چندہ دینا شروع کیا میں نے یہ بھی دیکھا کہ پاکستان جانے سے پہلے پاکستانی فوجی افسر اور سپاہی کمبل اور دوسری ضروری چیزیں بھی خرید رہے تھے جس سے اُن کا مقصد پاکستان پہنچ کر مہاجرین کی امداد کرنا تھا۔ ہم میں سے وہ لوگ کہ جن کے عزیز اور رشتہ دار مشرقی پنجاب میں گھر گئے تھے۔ وہ ہر وقت انہی کی فکر میں رہتے تھے۔ اس تاریک دور میں ہماری ہمت صرف اس بات سے بندھی ہوئی تھی کہ پاکستان کی ہمدردی جنوب مشرقی ایشیا

کے بسنے والے سب مسلمانوں کے دلوں میں ہے۔ اور اس علاقے کے لوگ اپنی بساط کے مطابق پاکستان کی مدد کرنے کو تیار ہیں۔

مشرقی ملکوں نے جس دریا دلی سے پاکستانی مہاجرین کی امداد کی۔ اس کا حال آپ نے سُن لیا۔ اس موقعہ پر یورپ اور امریکہ کے اکثر ملکوں نے بھی پاکستان سے ہمدردی کا اظہار کیا تھا۔ اور یہ ہمدردی صرف لفظوں تک محدود نہیں تھی۔ لندن کی ایک انجمن نے اپنی ہمدردی کو یوں عملی جامہ پہنایا۔

لندن کے تحفے

۳۰ سال سے دنیا کے مختلف ملکوں میں بچوں کی دیکھ بھال اور مدد کا کام ایک انجمن کرتی ہے۔ اس انجمن کا صدر مقام لندن میں ہے۔ اور اس کا نام Save The Children Fund ہے۔ عام طور سے اسے ایس۔ سی۔ الیف کہتے ہیں۔ پاکستان میں مہاجر بچوں کی مدد کے لئے ایس۔ سی۔ الیف کی طرف سے ۲۹ر دسمبر کو لندن میں ایک جلسہ کیا گیا تھا۔ اس جلسے میں پاکستان کے ہائی کمشنر ابراہیم رحمت اللہ کو پاکستانی بچوں کے لئے گرم کپڑے، سویٹر اور قمیصوں کا کپڑا دیا گیا۔

ان تمام تحفوں کی قیمت تقریباً ۱۷۔۱۸ ہزار روپیہ ہوتی ہے۔ ایک ہزار ۱۷ گز لٹھا ۳۰ اگز قمیصوں کا کپڑا، ۴۶۴ گز کوٹ کا کپڑا، ۲۴۴ گز گرم ٹویڈ، ۳۵۱ سویٹر اور ۵۵۲ بنیان۔ یہ سب کپڑا پاکستانی مہاجر بچوں کے لئے لندن میں پیش کیا گیا تھا۔ S.C.F کی طرف سے تحفے دیتے ہوئے اس کے صدر نے کہا کہ یہ حقیر تحفے پاکستان کی جو محبت ہمارے دل میں ہے اس کے نشان ہیں۔

ایس۔ سی۔ الیف کا شکریہ ادا کرتے ہوئے مسٹر ابراہیم رحمت اللہ نے کہا۔ کہ اس محبت کے نشان کی پاکستان قدر کرتا ہے۔ تحفے کی قدر اس کی قیمت کی وجہ سے نہیں ہوتی۔ بلکہ جس جذبہ کے ماتحت تحفہ دیا جاتا ہے اس کی وجہ سے اس کی قدر کی جاتی ہے۔ مسٹر رحمت اللہ نے کہا۔ بچوں کی دیکھ بھال ہر ملک کی ذمہ داری ہے۔ اور خاص طور سے پاکستان جیسی اسلامی سلطنت کے قانون میں اس کی وضاحت کی گئی ہے کہ بیواؤں اور یتیموں کی مدد کرنا حکومت کا سب سے پہلا فرض ہے پاکستان کے ۷۰ لاکھ مہاجرین میں سے کم از کم دس لاکھ مہاجر بچے ہیں۔ جنہیں مدد کی ضرورت ہے۔ کیونکہ جن بچوں کی آج آپ کا فنڈ مدد کر رہا ہے۔ کل یہی بڑے ہو کر شہری بن جائیں گے۔ اور تمام عمر آپ کی مدد کا احسان نہیں بھولیں گے۔"

مسلمان کبھی کسی کے احسان کو فراموش نہیں کرتا۔ پاکستان اور پاکستان کے مہاجرین

بحرین۔ ایران۔عراق۔ ملایا۔جاوا۔سماٹرا اور یورپ اور امریکہ کے بسنے والوں کا شکریہ ادا کرتے ہیں کہ انہوں نے مہاجرین کی مدد کی۔ جب پاکستان کی تاریخ لکھی جائیگی تو اس داستان میں مہاجرین کے ساتھ ان سب بھائیوں کی ہمدردی اور محبّت کا ذکر بھی نمایاں طور سے کیا جائے گا جنھوں نے مصیبت کے وقت مہاجرین کا ساتھ دیا۔

کراچی کے مہاجرین کی کہانی

کچھ اپنی کچھ دوسروں کی زبانی

پاکستان کا پایۂ تخت کراچی — نئی سلطنت کا نیا دارالسلطنت، کراچی جس کے ایک سرے پر بحیرۂ عرب کی لہریں سرگوشیاں کرتی ہیں اور دوسرے سرے پر کوہستان محال کا سلسلہ پہرہ دیتا ہے۔ کراچی پاکستان کی سب سے بڑی بندرگاہ ہے جہاں ہر روز خلیج فارس، بحیرۂ احمر، افریقہ، ہندوستان، آسٹریلیا اور یورپ اور امریکہ سے جہاز آتے ہیں۔ کراچی، ایشیا کا سب سے بڑا ہوائی میدان جو یورپ اور مشرق بعید کے ہوائی راستوں کا ایک بہت اہم مرکز ہے۔ کراچی جس کی خوشگوار آب و ہوا، خوبصورت سڑکیں، بارونق بازار، دلکشا بنگلے، سمندر کے فرحت افزا ساحل تمام دنیا میں مشہور ہیں۔ کراچی حکومتِ پاکستان کا دل ہے جس کی دھڑکن ہر پاکستانی کے سینے میں سنائی دیتی ہے۔

پاکستان بننے سے پہلے کراچی کی آبادی مشکل سے تین ساڑھے تین لاکھ ہوگی۔ تمام دنیا سے الگ تھلگ کراچی کا شہر پاکستان بننے سے پہلے آرام کی نیند سو رہا تھا۔ مگر پاکستان بنتے ہی کراچی نے انگڑائی لی اور اس کی سوتی ہوئی قسمت جاگ اٹھی۔ کراچی کی آبادی تین لاکھ سے گیارہ لاکھ کے قریب ہو گئی۔ سندھ کے ایک قدیم باشندے عبدالواحد صاحب نے اس شہر کی قسمت جاگنے کا حال قلمبند کیا ہے۔

کراچی جب اور اب

برطانوی عہدِ حکومت میں کراچی صوبہ سندھ کا پایۂ تخت تھا۔ آبادی تقریباً تین لاکھ تھی۔ بندرگاہ ہونے کی وجہ سے یہاں پر ہر رنگ، نسل اور قومیت کے لوگ رہتے تھے۔ یہاں کی تجارت، صنعت و حرفت، تعلیم اور ملازمت پر غیر مسلم قابض تھے۔ مسلمانوں کی آبادی کثرت سے پس ماندہ علاقوں میں تھی۔ جیسے لیاری کوارٹرز

کھڈہ اور کلاں کوٹ وغیرہ۔ یہ لوگ زیادہ تر محنت مزدوری کر کے بسر اوقات کرتے تھے۔ یہاں کی سڑکیں، بسیں، ٹرامویے اور گھوڑا گاڑیاں اس زمانہ کی آبادی کے لئے کافی تھیں۔ یہاں کی تفریح گاہیں، تعلیمی ادارے اور ثقافتی مراکز اس زمانہ کے اعتبار سے کافی وسیع تھے۔ یہاں کی زندگی پر سندھی ہندو کا بہت گہرا اثر تھا۔

۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کا سورج اپنی پوری کامرانیوں اور کامیابیوں کے ساتھ طلوع ہوا۔ ہندوستانی مسلمانوں نے اپنے محبوب قائدِ اعظم کی قیادت میں اپنا سیاسی مطالبہ پاکستان اپنے حریفوں سے منوا لیا۔ اب کراچی کی قسمت جاگ اٹھی۔ ملتِ پاکستان نے اس کو دولتِ خداداد پاکستان کا پایۂ تخت بنایا۔ دارالخلافہ بنتے ہی اس کی آبادی دن دونی رات چوگنی ترقی کرنے لگی۔ اس کی آبادی تین لاکھ سے چار لاکھ ہوئی اور اب بڑھتے بڑھتے گیارہ لاکھ ہو گئی ہے۔

ہندوستان کے مختلف علاقوں سے عام طور پر مسلمان تاجر، صناع، سرمایہ دار اور مزدور کراچی آ گئے۔ انہوں نے آکر تمام کاروبار سنبھال لئے۔ انہوں نے اپنے سیاسی حریفوں کے اس جھوٹے پروپیگنڈے کی دھجیاں اڑا دیں کہ "مسلمان کاروباری تنظیم کی صلاحیت نہیں رکھتے"۔ اس وقت مسلمان کراچی میں خوانچہ کے کاروبار سے لے کر بینکنگ کے پیچیدہ کاروبار تک بڑی خوش اسلوبی سے چلا رہے ہیں۔ نئی نئی کمپنیاں اور فرمیں بن رہی ہیں۔ صنعتی اداروں کی منصوبہ بندیاں ہو رہی ہیں۔ "عظیم تر کراچی" کے خاکے بن رہے ہیں۔ موجودہ کراچی کی آبادی میں بول چال، رہن سہن، پہناوا دہلی اور لکھنؤ کا سا معلوم ہوتا ہے۔ کھانے پینے کی چیزوں میں نہاری، دہی، بڑے اور کباب فروشوں کی آوازیں دہلی کا سماں پیدا کر دیتی ہیں۔

علم وادب کی محفلیں، مشاعروں اور مکالموں کی مجلسیں، رسالوں اور اخباروں کی کثرت پاکستان کی ادبی ترقی کے لئے نیک فال ہے۔ تعلیمی ادارے اور ان میں طلباء اور طالبات کی کثرت پاکستان کے شاندار مستقبل کی ایک ہلکی سی جھلک ہے۔ ہر محلہ میں نئی نئی مسجدیں بن رہی ہیں۔ یہ پاکستانی مسلمانوں کی خدا پرستی اور مذہب سے دلی لگاؤ کی ایک علامت ہے۔

قدرت نے کراچی کو بندرگاہ ہونے کی حیثیت سے یہ خصوصیت بخشی ہے کہ یہ اسلامی مقاماتِ مقدسہ کے قرب کی وجہ سے چینی ترکستان، تبت، وسط ایشیا، افغانستان، پاکستان اور ہندوستان کے زائرین کے لئے بہترین بندرگاہ ہے۔ ان ممالک کے زائرین یہیں سے آتے جاتے ہیں۔ انہی وجوہ کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ کراچی ایشیا کا "عظیم ترین شہر" بنے گا۔ اور بحری، بری اور فضائی آمد و رفت کا اہم مرکز۔

پاکستان بننے کی سب سے زیادہ خوشی ہم سندھی مسلمانوں کو ہوئی کیونکہ کراچی پاکستان کا پایۂ تخت

بنایا گیا اور ہم نے سندھ کی قدیم روایات کے بموجب اپنے عزیز مہمانوں کا ان لفظوں میں خیر مقدم کیا:۔

"اسانجا پیارا اچا ڀلي ڪري آيا"

شہر کی آبادی بڑھنے کے ساتھ ساتھ نئی مشکلات پیدا ہونے لگیں۔ مغربی پاکستان کے ہر ایک بڑے شہر کی طرح کراچی میں بھی مہاجرین نے آکر پناہ لی۔ کراچی کے بازار اور گلی کوچے مہاجرین سے پُر ہونے لگے کھلے میدانوں میں مہاجرین نے جھونپڑیاں ڈالیں۔ مکانوں کے اندر مہاجرین کے ہجوم سے تل دھرنے کو جگہ نہ رہی۔ مدرسوں اور کالجوں کی عمارتوں پر مہاجرین چھا گئے لیکن کراچی کے فراخدل شہر نے مسکرا کر اپنا دامن اور وسیع کر دیا۔ چودھری عزیز اللہ کراچی میں مہاجرین کے کیمپوں کے سپرنٹنڈنٹ ہیں۔ انہوں نے مہاجرین کے آنے اور عارضی طور پر قیام کرنے کا چشم دید حال بڑی سچائی سے لکھا ہے:۔

کراچی میں مہاجرین کی کثرت

حکومتِ سندھ نے سالِ گزشتہ مئی کے مہینہ میں کراچی کی مردم شماری کی تھی۔ اس کے مطابق اس وقت تک کراچی میں چار لاکھ بائیس ہزار ایک سو چوراسی مہاجرین آچکے تھے۔ چونکہ نو وارد مہاجرین کے نام رجسٹر کرنے کے لئے کوئی انتظام نہیں تھا۔ اس لئے صحیح اعداد و شمار موجود نہیں ہیں۔ لیکن ایسا اندازہ ہے کہ مئی ۱۹۴۸ء کے بعد قریب ۴۵ ہزار مہاجرین کراچی میں آئے۔ ہندوستان سے آنے والے مہاجرین کا بیشتر حصہ کراچی کا ہی رُخ کرتا ہے۔ متعدد بار اخبارات اور ریڈیو کے ذریعہ اعلانات کئے جا چکے ہیں۔ کہ کراچی میں اب نہ تو آنے والوں کے لئے رہنے کو مکانات میسر ہو سکتے ہیں اور نہ ان کے روزگار کی کوئی صورت ہو سکتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود اندازہ کیا گیا ہے کہ ہر مہینہ قریب ۵ ہزار مہاجر کراچی میں نئے آتے ہیں۔ اس کا لازمی نتیجہ یہی ہے جو آپ دیکھ رہے ہیں۔ کہ ہر کونے میں۔ سڑک کی ہر پٹڑی پر اور شہر کے ہر ایک کھلے میدان میں مہاجر بھائی ڈیرہ ڈالے بیٹھے ہیں۔ کراچی میں اس وقت قریب ۹۵ ہزار ایسے مہاجر ہیں جن کے لئے مناسب رہائشی جگہ کا انتظام نہیں ہے۔ ان میں سے قریب ۴۵ ہزار مہاجرین کے لئے کراچی میں نہ تو رہنے کو مکان ہیں اور نہ ان کے روزگار کی یہاں کوئی صورت نظر آتی ہے۔ کوشش کی جا رہی ہے کہ ان مہاجرین کو صوبہ سندھ، سرحد اور ریاست بہاولپور میں منتقل کر دیا جائے۔

میں حال میں کچھ شہروں کا دورہ کر کے آیا ہوں۔ بعض شہروں میں مہاجرین کے لئے کافی گنجائش دیکھی ہے۔ ان

۵۴ ہزار مہاجرین کو منتقل کرنے کے بعد کراچی میں ۵۰ ہزار مہاجرین رہ جائیں گے۔ جن کے لئے دس ہزار مکانات کی ایک کالونی بنانے کی تجویز زیرِ غور ہے جس کا نام ناظم آباد کالونی ہوگا۔ یہ کالونی گولی مار کے علاقہ میں بنائی جائے گی جو جگہ اس کالونی کے لئے تجویز کی جارہی ہے اس میں بعض مہاجر بھائیوں نے اپنے گھر ابھی سے بلااجازت بنانے شروع کر دیئے ہیں۔ اس علاقہ میں ریل کی لائن اور متعدد سڑکیں بنائی جائیں گی۔ اس لئے اندیشہ ہے کہ جو بلااجازت مکانات بنائے جارہے ہیں ان میں سے بعض کو گرانا پڑے گا۔ بار بار نوٹس کے ذریعہ مطلع کیا گیا ہے کہ بغیر منظوری کے اس علاقہ میں کوئی مکان نہ بنایا جائے لیکن اس کے باوجود ایک دوسرے کی دیکھا دیکھی مکانات تعمیر کئے جارہے ہیں۔ اس موقعہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں یہ عرض کروں گا کہ اس علاقہ میں کسی قسم کی عمارت بلااجازت نہ بنائی جائے۔

ناظم آباد کالونی کی اسکیم کے شروع ہونے کا اخبارات میں اعلان کیا جائے گا۔ اس کا انتظار فرمائیے۔

بیجا نہ ہوگا اگر اس سلسلہ میں میں کراچی کے کیمپوں کے متعلق بھی کچھ عرض کروں۔ جہاں کہیں دو تین سو مہاجر ڈیرہ ڈال کر بیٹھ جائیں وہ جگہ کیمپ بن جاتی ہے۔ اس وقت تک کراچی میں ۲۹ کیمپ بن چکے ہیں جن کی آبادی قریب ۴۰ ہزار ہے۔ ان کیمپوں میں ۲۷ عمارتیں ایسی ہیں کہ جو پہلے تعلیمی درسگاہوں کے طور پر استعمال کی جاتی تھیں۔ ان عمارتوں کے رُکے ہوئے ہونے کی وجہ سے آپ خود اندازہ فرما سکتے ہیں کہ ہماری قوم کے بچوں کی تعلیم کا کس قدر حرج ہو رہا ہے۔ ہر مہاجر بھائی کا فرض ہے کہ وہ ان عمارتوں کو خالی کرانے میں حکومت کا ہاتھ بٹائے تاکہ آئندہ نسل تعلیم حاصل کر کے پاکستان کے لئے مفید اور کارآمد ثابت ہو سکے۔ صرف یہی نہیں بلکہ عمارتوں میں گنجائش سے زیادہ افراد رہتے ہیں جس کی وجہ سے انتہائی کوششوں کے باوجود صفائی ٹھیک نہیں ہو سکتی جس کا کہ کیمپ میں رہنے والوں کی صحت پر بُرا اثر پڑتا ہے۔ اور صحتِ عامہ کے لئے بھی شدید خطرہ ہے۔ حالانکہ کیمپوں کی صفائی پر ماہانہ پندرہ ہزار روپیہ خرچ کیا جارہا ہے۔

ماہ جنوری میں جب کہ جلّہ کا جاڑا پڑ رہا تھا آپ نے شاید کچھ رات گئے اپنے کیمپ کے اندر ایک موٹر گھومتی ہوئی دیکھی ہوگی یا اس کی آواز آپ کے کانوں میں پڑی ہوگی۔ اس موٹر میں محکمہ مہاجرین کا عملہ کمبل لادے ہوئے چکر کاٹا کرتا تھا تاکہ کوئی مہاجر بھائی شدّت کی سردی کا شکار نہ ہو جائے۔ محکمہ مہاجرین کا عملہ ضرورت مندوں کو کمبلوں سے ڈھانکتا پھرتا تھا۔ اس رات گئے کی تقسیم میں بڑی بڑی دردناک مثالیں دیکھنے میں آئیں۔ حاجی کیمپ میں ایک ایسی مہاجرہ قریب نصف شب کے نظر آئی جو اپنے نوزائیدہ بچے کے ساتھ آسمان تلے ایک ململ کا دوپٹہ اوڑھ کر رات گزار رہی تھی۔ اس کو اسی وقت لحاف، گدیلا، کمبل اور

تکیہ دیا گیا۔ بوہری جماعت خانہ میں ایک نوعمر مہاجرہ جس کا شوہر بدقسمتی سے بھرت پور میں مُرتد ہوگیا تھا نہ صرف اپنا ایمان بچا کر پاکستان آگئی بلکہ اپنے معصوم بچوں کو بھی ساتھ لے آئی۔ اس غریب مہاجرہ کے پاس محض تین بوریاں تھیں جن کے اندر وہ اپنے بچوں کو سلاتی تھی۔ قائدِاعظم کے مزار کے پاس جو مہاجرین رہتے ہیں ان میں سے کئی ایک اوڑھنے کے سامان کی کمی کی وجہ سے رات بیٹھ بیٹھ کر گزارتے تھے۔ اس طرح شب و روز کی تقسیم میں ۲۸۶۰ کمبل تقسیم کیے گئے۔

یہ دیکھتے ہوئے کہ بچوں کی جسمانی پرورش ٹھیک طرح سے نہیں ہو رہی ہے۔ قائدِاعظم ریلیف فنڈ سے دس ہزار کی رقم مستحق بچوں کو دودھ پلانے کے لیئے منظور کی گئی تھی۔ مختلف کیمپوں میں قریب آٹھ سو بچوں کو پاؤ بھر دودھ یومیہ کے حساب سے تقسیم کیا جاتا ہے۔ ان میں یتیم بچے بھی شامل ہیں مستحق بچوں کو کارڈ تقسیم کر دیئے گئے ہیں، اور ان کارڈوں کے مطابق ان کو ہر روز دودھ پہنچا دیا جاتا ہے۔

کراچی شہر کے وسط میں ایک اونچے ٹیلے پر قائدِاعظم کا مزار ہے جس کی زیارت کو صبح شام ہزاروں لوگ جاتے ہیں۔ اسی ٹیلے پر اور اس کے دامن میں چاروں طرف مہاجرین نے اپنے لیئے کئی بستیاں قائم کی ہیں۔ ان میں رہنے والے اپنے محبوب قائدِاعظم کی ابدی خوابگاہ کی پاسبانی اور زبانِ حال سے ان نئی امیدوں کی ترجمانی کرتے ہیں جو ہر ایک مہاجر کے دل میں موجزن ہیں۔ پہاڑی کے مغربی دامن میں قائم ہونے والی بستی قائدآباد کے نام سے مشہور ہوگئی ہے فضل حق قریشی نے اس بستی کو دیکھنے اور حاجی کیمپ میں چکر لگانے کے بعد اپنے خیالات کو الفاظ کا جامہ یُوں پہنایا ہے:۔

کراچی میں مہاجرین کے کیمپ

کراچی کے مہاجرین کیمپوں میں جانے کا بارہا ارادہ کیا، مگر اس خیال سے کبھی ہمت نہ ہوئی کہ اُن بیکس و مجبور ہستیوں کو بھلا کن آنکھوں سے دیکھا جائے گا جو اپنے گھر بار لٹا کر، اپنے عزیزوں کی جانیں گنوا کر، عزت و آبرو پر داغ لگوا کر نہ جانے کس طرح یہاں تک پہنچے ہیں۔ مجھے یقین تھا کہ وہ لوگ اب بھی اس قدر پریشان ہوں گے کہ انہیں دیکھ کر رُوح لرز جائے گی۔ لیکن ایک روز اتفاقاً ادھر جا نکلا تو میرا قیاس غلط ثابت ہوگیا۔ وُہ لوگ اپنے غموں کو بھول کر اپنے پاؤں پر کھڑے ہو کر نئی زندگی کی تعمیر کے لئے کمرِ ہمت کس چکے ہیں، اور ان کی اس نئی زندگی میں ایک قسم کی آسودگی پیدا ہو چلی ہے۔ میرا مطلب مہاجرین کی اس عارضی بستی سے ہے جو بندر روڈ کے مشرقی سرے پر نمائش کے قدیم میدان میں آہستہ آہستہ قائم ہوئی اور

اب قائد آباد کے نام سے مشہور ہے۔ اس بستی میں کھڑے ہو کر مشرق کی طرف دیکھیں تو قائدِ اعظم کا مزار ایک چھوٹی سی پہاڑی پر نظر آتا ہے۔ گویا امیروں کی عالیشان کوٹھیوں کی طرف پاؤں پھیلائے قبر کے گوشے میں سونے والے بیکسوں کے ہمدرد کا رُخ انہی مہاجرین کی بستی کی طرف ہے جن کی آبادکاری اور بحالی کا احساس مرتے دم تک ان کے لئے سوہانِ روح بنا رہا تھا۔

قائد آباد کا نقشہ ایک بڑے گاؤں سے ملتا جلتا ہے۔ ٹاٹ، تربال، کھجور کے بوریے اور پھونس وغیرہ سے بنی ہوئی جھونپڑیوں کے علاوہ مٹی کے کچے گھروندے اور کچھ پختہ مکان بھی اس جگہ نظر آتے ہیں۔ اس بستی کی داغ بیل کسی ماہرِ فن انجینئر نے نہیں ڈالی۔ پھر بھی ان عارضی قیامگاہوں کے گرد و پیش چھوڑے ہوئے سیدھے سیدھے راستے باقاعدہ گلیاں اور بازار معلوم ہوتے ہیں جن میں لگی ہوئی دوکانوں پر عام ضروریات کی سبھی چیزیں مل جاتی ہیں اور اگر کسی چیز کی کمی رہ جائے تو اسے پھیری سے سودا بیچنے والے پورا کر دیتے ہیں یہاں ہندوستان کے مختلف صوبوں کے لوگ آباد ہیں جن کو ان کے مشغلوں اور پیشوں کے لحاظ سے پہچانا جا سکتا ہے۔ آگرے کے چند لوگوں نے "تاج ہوٹل" کے نام سے چائے پانی کا انتظام کر رکھا ہے تو دوسری طرف اسی شہر والوں نے جوتوں کی دکان لگا کر وہ صراحیاں بھی رکھ لی ہیں جو ملک کی تقسیم سے پہلے صرف آگرے ہی میں مل سکتی تھیں اور اب جن کی تیاری کے لئے سندھ کی مٹی میں لوچ پیدا کر لیا گیا ہے مراد آباد والے مراد آبادی برتن بنا رہے ہیں تو علی گڑھ والے بسکٹ اور ڈبل روٹیاں۔ ان لوگوں نے جو اپنے پیشوں سے اپنے وطن کو ظاہر نہیں کر سکے۔ ذرا وضاحت سے کام لیا ہے یعنی گتے کے بورڈ لگا کر یا دیوار پر لکھ کر ظاہر کر دیا ہے کہ گوشت کی یہ دکان میرٹھ کے ایک مشہور قصائی نے لگائی ہے۔ یہاں امرتسر کے فلاں پہلوان کی بھینسوں کا دودھ بکتا ہے۔ اس جگہ دلی کا چٹورپن پھلکیوں، پکوڑیوں اور دہی بڑوں کی صورت میں نظر آتا ہے۔ اور یہاں منہ میٹھا کرنے کے لئے پانی پت کی لائی اور دوسری مٹھائی مل سکتی ہے۔ ایک رامپوری بزرگ نے پان کی دکان لگائی اور فالتو وقت میں خود ہی بیڑیاں بناتے رہتے ہیں۔ ایک حکیم صاحب نے ذرا شہرت پانے کے لئے اپنے بورڈ پر نام کے ساتھ "شاگردِ رشید مسیح الملک" بھی لکھ لیا ہے۔ یہاں یونانی کے ساتھ ڈاکٹری علاج بھی چلتا ہے۔ ایک ڈاکٹر صاحب رضاکارانہ طور پر ہفتہ میں تین مرتبہ اپنی خدمات پیش کرتے اور مہاجرین کو مفت دوا دیتے ہیں۔ چھوٹے بچوں اور بچیوں کے لئے الگ الگ مدرسے بھی قائم ہیں۔ دوکانوں اور بازاروں کے ہنگاموں سے ذرا ہٹ کر مسلسل چلنے والے چرخوں کی آواز ہر گزرنے والے کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے۔ سوت کاتنے کے ساتھ کپڑا اور نواڑ بننے کا بھی انتظام ہے۔ غرض یہ کہ زندگی کا انہماک ہر رنگ میں نظر آتا ہے۔ یہاں رہنے والوں کی تعداد کا اندازہ اس طرح لگایا جا

سکتا ہے کہ راشن کی دو دکانوں اور لکڑی کی تین ٹالوں پر ہر وقت بھیڑ لگی رہتی ہے۔ اس جگہ سے شمال مغرب کی طرف چار پانچ میل پرے حاجی کیمپ میں جائیے تو زندگی کی گھما گھمی قائد آباد سے بھی زیادہ تیزی کے ساتھ جلوہ گر نظر آتی ہے۔ یہاں بھی بے سروسامانی کے باوجود ایک قسم کی آسودگی اپنا سکّہ جمائے ہوئے ہے۔ فرق اتنا ہے کہ محدود جگہ میں آبادی زیادہ گنجان ہے۔ شروع میں آنے والوں نے پکے سائبانوں میں جو حاجیوں کے لئے مخصوص تھے۔ ٹاٹ کے پردے لگا کر الگ الگ پناہ لی۔ اور جب وہ کھچا کھچ بھر گئے تو باہر کے کھلے میدان میں سرکاری طور پر تنبو لگا دیئے گئے۔ وہ ناکافی ثابت ہوئے تو جھونپڑیاں بن گئیں۔ ان سے بھی پوری نہ پڑی اور اندر تِل دھرنے کو جگہ باقی نہ رہی تو لوگوں نے باہر کی پٹڑیوں پر اس طرح ڈیرے ڈال دیئے کہ سڑک پر گاڑیوں کی آمد و رفت بالکل بند ہو گئی۔ گھریلو دستکاریاں جاننے والوں اور دوسرے پیشہ وروں نے یہاں بھی اپنے روزگار کی مختلف صورتیں پیدا کر لی ہیں۔ نیم سرکاری انتظام کے باوجود وہ اپنے رکھ رکھاؤ کا خود خیال رکھتے ہیں۔ انہیں اس بات کا احساس ہے کہ حکومت پر زیادہ بوجھ ڈالنا مناسب نہیں ہے۔ لیکن بری طرح گھٹی ہوئی گنجان آبادی کا یہ سلسلہ زیادہ عرصہ قائم نہیں رہ سکتا۔ اگر خدانخواستہ کوئی وبائی مرض پھیلا تو چشم زدن میں بہت سوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیگا۔ چنانچہ جب سے حکومت نے یہ اعلان کیا ہے کہ ۴۵ ہزار کے قریب مہاجرین کو کراچی سے لے جا کر سندھ کے اندرونی علاقوں میں آباد کیا جائے گا۔ حاجی کیمپ کے رہنے والے پر تولے بیٹھے ہیں اور اپنے کوچ کا نقّارہ سننے کے لئے تیار ہیں۔

مہاجرین کے کیمپوں میں صحت اور صفائی کا خیال رکھنا سب سے زیادہ ضروری ہے کراچی کے انصار و مہاجرین نے اس کام کے لئے مختلف انجمنیں قائم کی ہیں۔ ان کے اراکین نے جن میں عورتیں اور مرد برابر شامل ہیں، اپنا خالی وقت مہاجرین کی خدمت کے لئے وقف کر رکھا ہے۔ اسی قسم کی ایک انجمن "انجمن انصار المہاجرین" کہلاتی ہے جو کلیٹن روڈ کولونی کے آخری سرے پر قائم ہونے والے کیمپ کے مہاجرین کی دیکھ بھال کرتی ہے۔ اس کیمپ میں طبّی امداد کا کام ایک جرمن ڈاکٹر میکس ہینر نے اپنے ذمہ لے رکھا ہے۔ ان کے اہم کام کی تفصیل خود ان کے قلم سے پڑھیئے:۔

طبّی امداد

"میں بھی آپ جیسا ایک مہاجر ہوں اور میں بھی کیمپوں میں رہ چکا ہوں۔ اس لئے میں جانتا ہوں کہ کیمپ

ہیں لوگ کیسے رہتے ہیں۔ لیکن آپ کے کیمپ بہت اچھے ہیں۔ ان کے چاروں طرف کوئی تار نہیں اور آپ جب چاہیں کیمپ سے باہر جا سکتے ہیں۔

ایک سال ہوا کہ کچھ لوگوں نے مل کر مہاجرین کی مدد کے لئے کراچی میں کام کرنا شروع کیا۔ اور "انصار المہاجرین" بنائی۔ ہم سب نے مل کر اس نیک کام کو شروع کیا۔ ہم مہاجرین کی مدد کرنا چاہتے تھے کراچی کے ایک چھوٹے مہاجرین کیمپ کو ہم نے چُنا۔ یہ کیمپ ایک اسکول کی عمارت میں تھا۔ اور اس میں آٹھ سو آدمی رہتے تھے سب سے پہلے ہم نے اس کو صاف کیا۔ اس کی نالیاں صاف کیں۔ پھر ہم نے سب کے چیچک، ٹائیفائڈ اور ہیضے کے ٹیکے لگائے۔ اس بات کو کسی نے پسند نہیں کیا۔ لیکن بہت جلدی سب نے دیکھ لیا کہ ٹیکہ اچھی چیز ہے۔ پھر سب نے ٹیکے لگوا لئے۔

اب ہم نے ملیریا کا علاج شروع کیا۔ کیمپ میں آدھے سے زیادہ لوگ ملیریا میں گرفتار تھے اس لئے ہم نے مچھروں کو کیمپ سے نکالنے کی کوشش کی۔ تین ہفتے کی لگاتار محنت کے بعد ہم نے یہ لڑائی جیت لی۔ اب کیمپ میں پیلے اور کمزور بچے نظر آنے کم ہو گئے۔

ان تمام باتوں کے باوجود بھی کیمپ کی زندگی میں ایک کمی تھی۔ کیونکہ مہاجرین کے لئے کوئی اسپتال نہیں تھا۔ اور یہ کمی ابھی تک پوری نہیں ہو سکی۔

کچھ مہینے ہوئے کہ شہر سے باہر گورنمنٹ نے ایک کیمپ کھول دیا۔ اس جگہ کی آب و ہوا بہت اچھی ہے۔ چند روز کے اندر سب مہاجرین کی صحت اچھی ہو گئی۔ جو پہلے کمزور نظر آتے تھے۔ اب یہ خوب چلنے پھرنے لگے۔ ہمیں بہت سی دوائیاں مفت مل گئیں اور ایک نیک رحمدل عورت نے ہمیں دودھ کے پوڈر کا ایک بہت بڑا ٹن دے دیا۔

اب میں کہہ سکتا ہوں کہ ہمارے کام کا اچھا نتیجہ نکلنے لگا ہے۔ اور وہ لوگ جو پہلے بیماری کی وجہ سے کمزور دکھائی دیتے تھے۔ اب تندرست ہو گئے ہیں۔ لیکن ابھی ہمیں بہت سے کام کرنے ہیں اور انصار المہاجرین برابر کام کر رہی ہے۔

میرا خیال ہے کہ اگر یہی صورت دوسرے شہروں میں بھی جہاں مہاجرین کی عارضی آبادیاں ہیں۔ شروع کر لی جاتے تو اچھا ہے۔"

صحت اور صفائی کے بعد مہاجرین کے روزگار اور وسائلِ معاشں کا سوال بڑی اہمیت رکھتا ہے مرد تو محنت مزدوری کر کے اپنی روزی کما لیتے ہیں مگر عورتوں کے لئے اس مسئلے کا حل ذرا غور طلب ہے آپ کو یاد ہو گا کہ یکم فروری کو وزیر مہاجرین آنریبل خواجہ شہاب الدین نے ایک کانفرنس میں فیصلہ کیا کہ کراچی

میں آنے والے مہاجرین کے لئے دستکاری اور صنعت کے مرکز اور ان کے لاوارث بچوں کے لئے یتیم خانے کھولے جائیں گے۔ ظاہر ہے کہ اس اسکیم کے ماتحت ہر ایک مہاجر کو اپنی روزی خود پیدا کرنے کا موقع مل جائے گا۔ بیگم مختار احمد عرشی نے اس قسم کی ایک اسکیم کچھ عرصہ پہلے لاہور میں چلائی تھی۔ اب کراچی میں مہاجر بہنوں کے لیئے وہ اسی قسم کا ایک کارخانہ قائم کر رہی ہیں۔ اس سے اندازہ لگائیے کہ وہ عنقریب عملی جامہ پہن لینے کے بعد کس قدر مفید رہے گا۔

مہاجر عورتوں کے لئے صنعتی مرکز

اگست ۱۹۴۷ء کی قیامتِ صغریٰ کے بعد مہاجرین بوڑھے، بچے اور عورتیں قافلہ در قافلہ پاکستان میں داخل ہوئے۔ تو سب سے مشکل مسئلہ ان مہاجر عورتوں کا تھا جن کا سب کچھ ہندوستان میں لٹ چکا تھا نہ اُن کا کوئی کمانے والا تھا اور نہ ہی ان کو باعزت روزی کمانے کا کوئی دھندا آتا تھا۔ ان میں نوعمر، بوڑھی جوان، صحیح الجسم اور اپاہج سب ہی قسم کی عورتیں تھیں۔ ان کی زندگی سدھارنے کے واسطے جس قدر حل سوچے اور تلاش کئے گئے ان میں سب سے زیادہ مفید حل لاہور میں "سر گنگا رام ریفیوجی ہوم" کا قیام تھا۔ اس مرکز میں بلالحاظِ عمر ہر مہاجر عورت شریک ہو سکتی تھی ان میں سے اکثر سوت کاتنے کے لئے چرخے پر لگا دی جاتی تھیں اور بہت سی مستورات دھاگے کے گولے مشینوں پر بناتی تھیں۔ ہر عورت کی تقریباً ۲۵ روپے سے لے کر ۷۰ روپے تک ماہانہ آمدنی ہوتی تھی، جس سے وہ بخوبی اور باعزت طریقے پر اپنا اور اپنے بچوں کا نہ صرف پیٹ ہی پال سکتی تھی بلکہ دوسری ضروریاتِ زندگی کی بھی کفیل ہو سکتی تھی۔ یہ صورت اب تک قائم ہے۔ اس مرکز کا اندرونی انتظام اراکین مرکز میں سے منتخب شدہ مستورات کے ہاتھ میں ہوتا ہے اس لئے پردہ دار عورتیں بھی مرکز میں کام سیکھ کر خود روزی پیدا کر سکتی ہیں۔ اس سے نہ صرف مہاجر عورتوں کا بھلا ہوا بلکہ مرکز کی آمدنی نے مہاجرین فنڈ میں کافی اضافہ کیا اور حکومت کو بھی ہزاروں روپے سالانہ کی بچت ہوئی۔ اسی قسم کی سکیم کراچی میں رائج کی جا رہی ہے۔ یہاں نہ صرف غریب مہاجر عورتیں سُوت کاتنا اور مشینوں پر گولے بنانا سیکھیں گی بلکہ متموّل مہاجر اور انصار عورتوں کو بھی اس میں شریک ہونے کا موقع دیا جائے گا۔ قائدِ اعظمؒ کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ پاکستان کو ذہنی استحکام دینے کے بعد اس کو ایک اعلےٰ درجے کا صنعتی ملک بنایا جائے۔ دُوسری جنگِ عظیم سے پیشتر ہم دیکھتے تھے کہ جاپان نے صنعت و حرفت میں حیرت انگیز ترقی کر کے یورپ اور امریکہ کو انگشت بدنداں کر دیا۔ ہمارے ملک میں جاپانی مال کی قیمت بہت زیادہ چنگی ادا کرنے کے بعد بھی اس قدر کم ہوتی تھی کہ ملکی صنعت

اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔ اس حیران کن ترقی کا راز جاپان کی عورتوں کی صنعتی ترقی میں مضمر تھا۔ نہ صرف جاپان کی غریب اور متوسط الحال عورتیں بلکہ امیر گھرانوں کی معزز عورتیں کسی نہ کسی صنعت میں ید طولیٰ رکھتی تھیں۔ ان کے لیئے ہر صنعت گھریلو صنعت تھی۔ سوئی پیچکوں سے لے کر اعلیٰ درجے کے فاؤنٹین پن تک بآسانی گھر پر بنا لیتی تھیں۔ کراچی میں اس وقت تقریباً پانچ لاکھ مہاجرین آباد ہیں۔ ان میں سے کم از کم ڈھائی تین لاکھ مہاجر عورتیں ہونگی مہاجر بہنوں نے جہاں تک مجھے معلوم ہے ابھی تک کراچی میں اس قسم کے بڑے پیمانے پر کوئی دستکاری یا کاروبار شروع نہیں کیا۔ مجھے امید ہے کہ جب سوت کا یہ کارخانہ کراچی میں عنقریب ہی جاری ہو جائے گا تو کم از کم تین چار سو مہاجر بہنیں اس میں کام کر سکیں گی۔ اور خود اپنی محنت سے اپنا اور اپنے بال بچوں کا پیٹ پال سکیں گی۔ یہ تجربہ لاہور میں میری نگرانی میں کامیاب ثابت ہو چکا ہے۔ اور خدا کی بارگاہ سے امید ہے۔ کہ کراچی میں بھی ویسا ہی کامیاب ثابت ہوگا۔ مجھے یہ بھی امید ہے کہ دوسری بہنیں جو دستکاری اور صنعت و حرفت کے کام جانتی ہیں۔ اسی قسم کے مرکز کراچی میں قائم کر کے مہاجر بہنوں کی امداد کر سکیں گی ؛

مہاجرین کی کہانی

تصویروں کی زبانی

۱۴ اگست ۱۹۴۷ء سے پہلے ہی مہاجرین کے قافلے ریلوں، بیل گاڑیوں اور دوسری سواریوں کے ذریعے پاکستان پہنچنے لگے۔ لاکھوں مہاجر پاپیادہ جان بچا کر پاکستان پہونچے۔
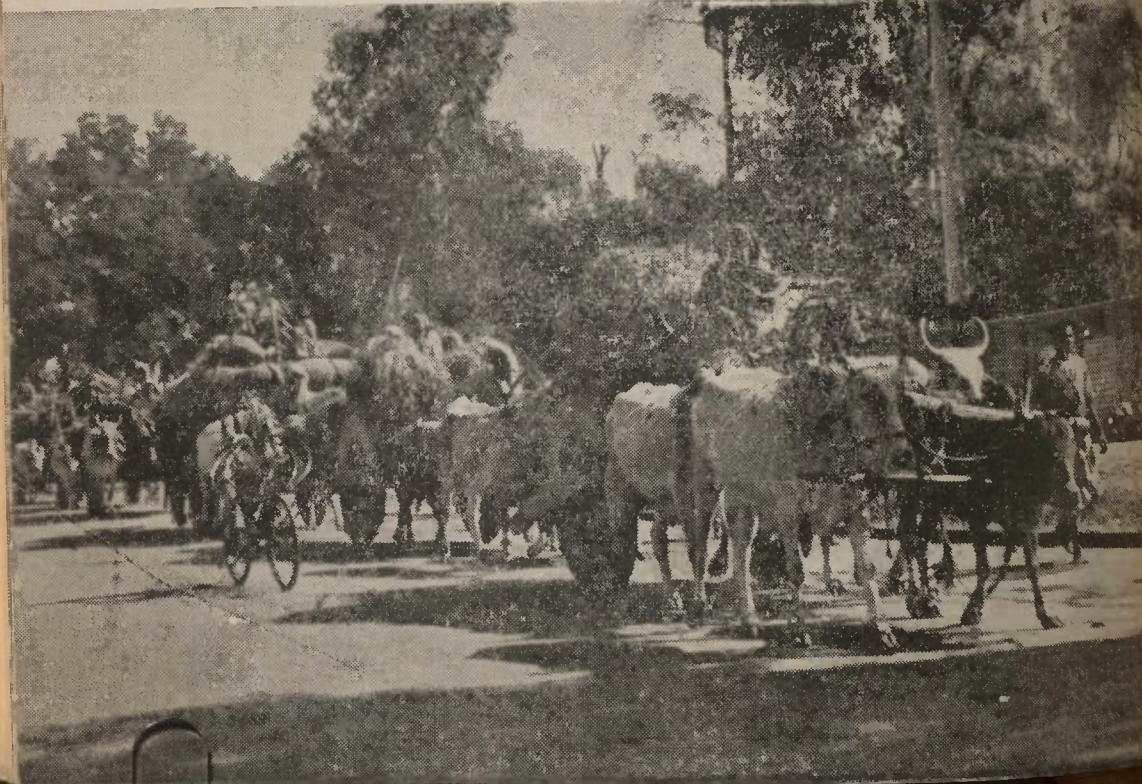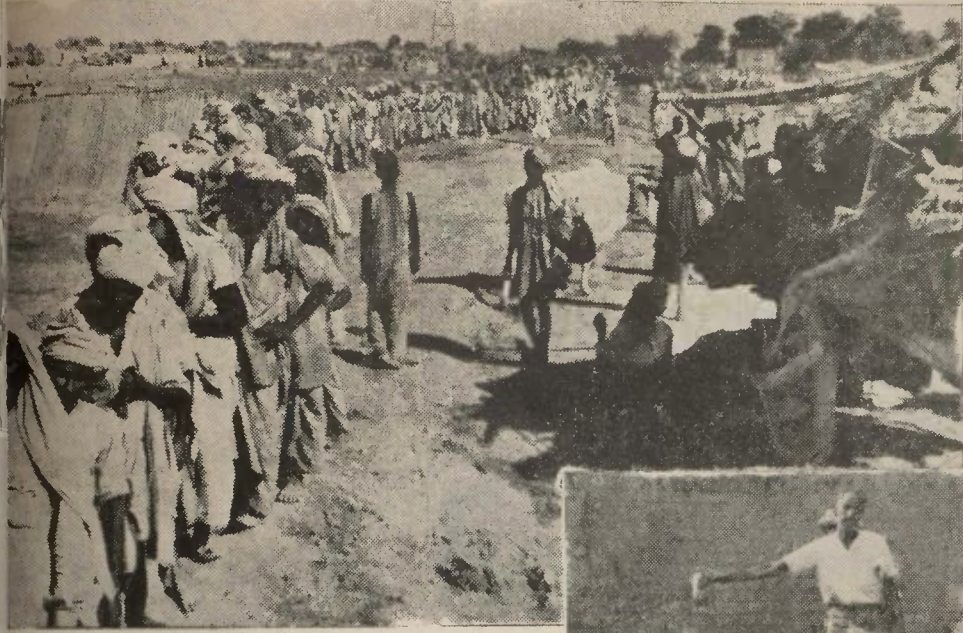
مہاجرین کو پاکستان کی سرحد میں داخل
ہوتے ہی سب سے پہلے کھانا دیا جاتا تھا۔
کئی دن کے بھوکے پیاسے مہاجر
معمولی غذا ہی کو نعمت سمجھتے تھے۔

مہاجرین کے لٹے ہوئے قافلے جب پاکستان
پہنچتے تو ڈاکٹرز زخمیوں کی دیکھ بھال کے لئے
تیار ملتے۔ جن کے عزیز و اقارب بچھڑ جاتے
وہ ان کا نام اور پتہ ایک دیوار پر لکھ دیتے۔
راشن ملتے ہی عورتیں کھانا پکانے میں مصروف
ہو جاتیں
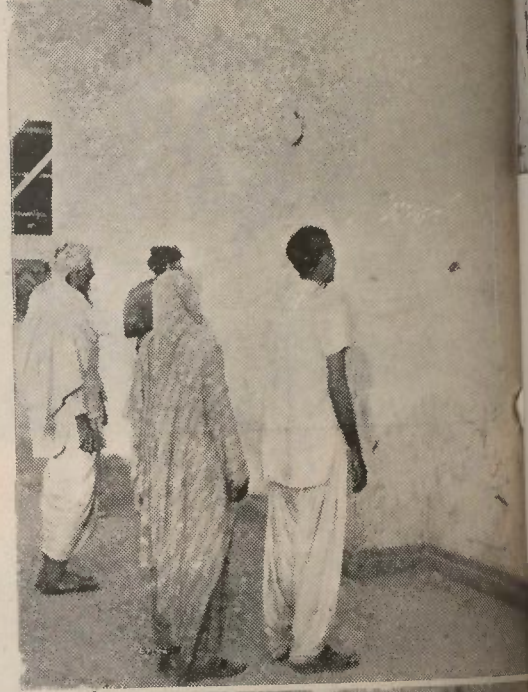
کیمپوں میں پہنچتے ہی زخمیوں کی مرہم پٹی
کی جاتی تھی

سردی سے بچنے کیلئے گرم کپڑے تقسیم ہوتے تھے۔

بچوں کی خوراک اور دیکھ بھال کا خاص طور سے
انتظام تھا۔ لاوارث بچوں کو الگ کیمپ میں رکھا جاتا تھا

اس تاریک دور میں زخمی دلوں پر مرہم لگانے کے لئے قائد اعظم نے کیمپوں کا دورہ کیا۔

محترمہ فاطمہ جناح آج بھی یہ خدمت اسی انہماک سے انجام دے رہی ہیں۔

الحاج خواجہ ناظم الدین گورنر جنرل پاکستان نے قائد اعظم کے نقش قدم
پر چلتے ہوئے مہاجرین کی ہمت بندھوائی

گورنر جنرل
اور
وزیر اعظم
قائد اعظمؒ
کے
مزار پر

"اگر آج مغربی پاکستان کی
صنعت و حرفت اور تجارت
پر ہم مسلمانوں کا قبضہ دیکھ رہے ہیں
تو یہ مہاجرین کی بدولت ہے"۔
(وزیر اعظم)
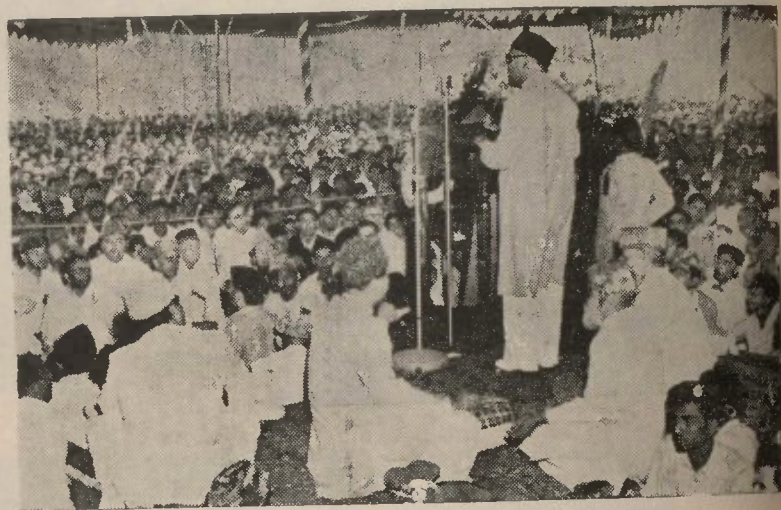
آنریبل خواجہ شہاب الدّین
وزیرِ مہاجرین

"پاکستان کی دفاع کے بعد مہاجرین کی آباد کاری سب سے زیادہ اہمیّت رکھتی ہے۔"

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی
نائب
وزیر مہاجرین

اندرون سندھ میں آبادکاری کے کام کی نگرانی کرتے رہے ۔
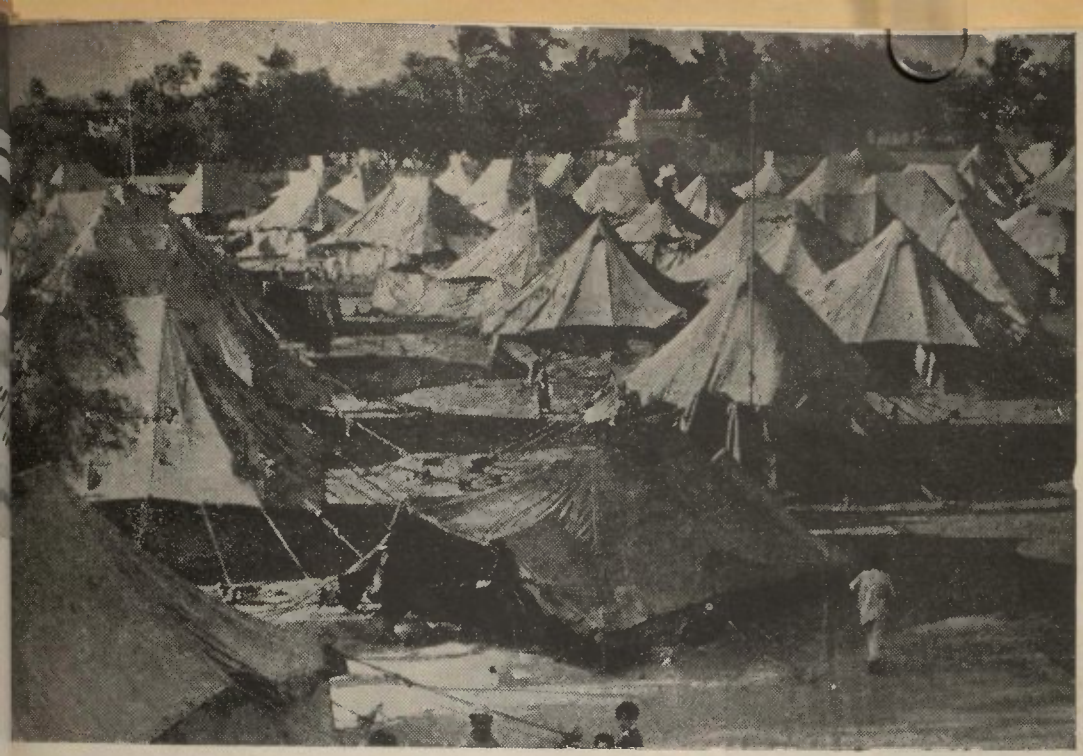
کیمپوں کی زندگی کو خوشگوار بنانے
کے لئے بچّوں کا تفریحی پروگرام
اور
تقسیم انعامات

مہاجرین
کی
آبادکاری
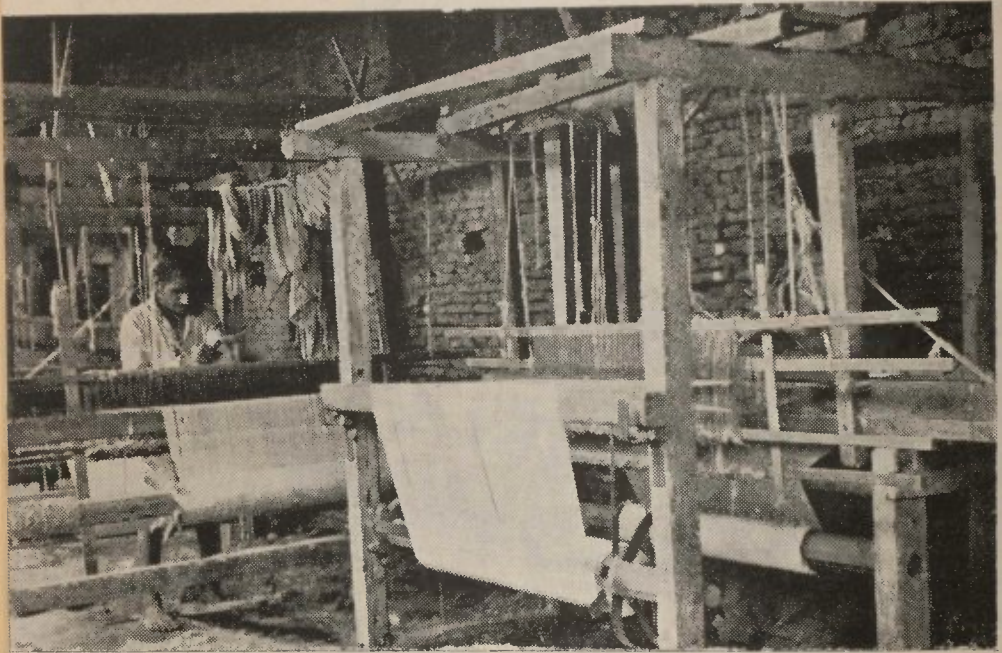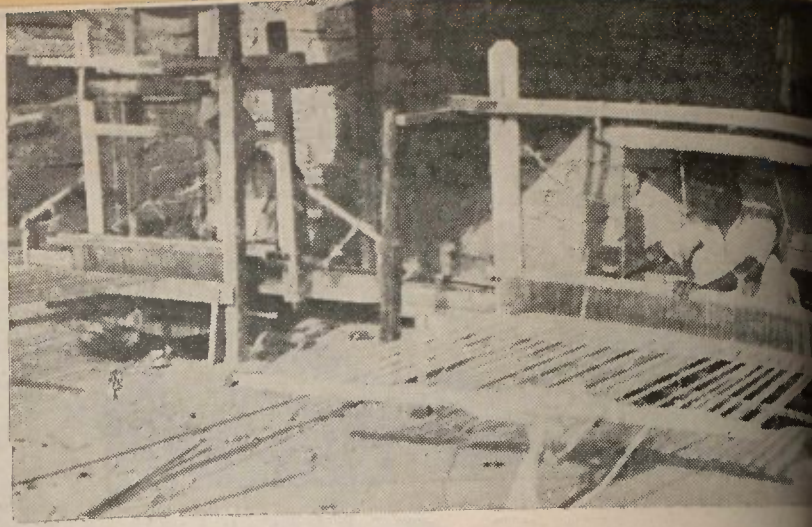
موقعہ ملتے ہی مہاجرین
نے پارچہ بافی کی صنعت
شروع کردی۔
چھوٹے بچے تک
اس میں شریک ہیں۔
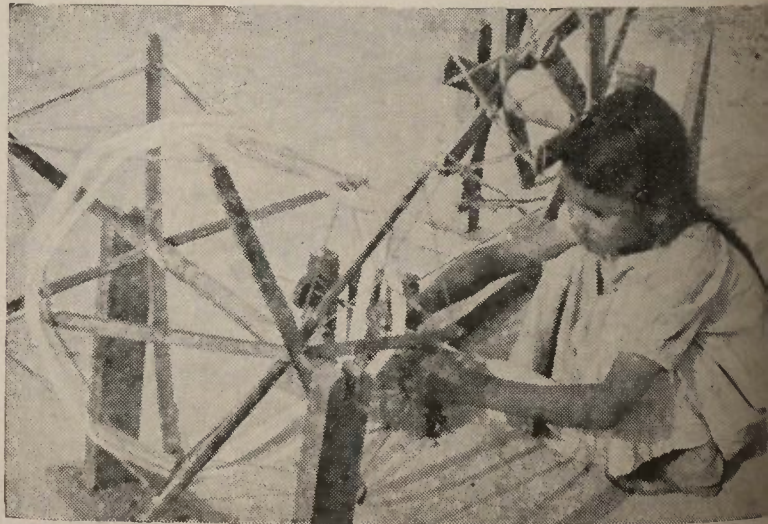
دستکاروں
کی
آباد کاری

ہمارے صنّاع
دستکار اور کاریگر
مہاجر پاکستان
کی سب سے بڑی
دولت ہیں۔

پاکستان

کی

معاشرتی زندگی میں مہاجرین کا حصہ

آباد کاری

اکثر شہروں اور قصبوں
میں نادار مہاجر عورتوں
کے لئے محنت مزدوری
کرنے کے مراکز قائم ہوگئے
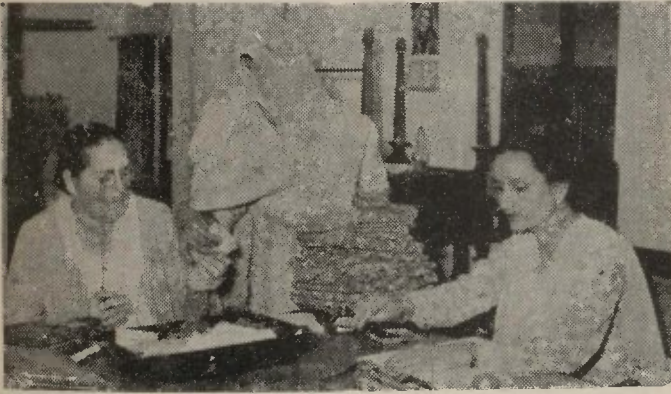
ان مرکزوں کا انتظام
ہماری خواتین نے خود
کیا اور حکومت کی طرف
سے انہیں امداد ملی۔
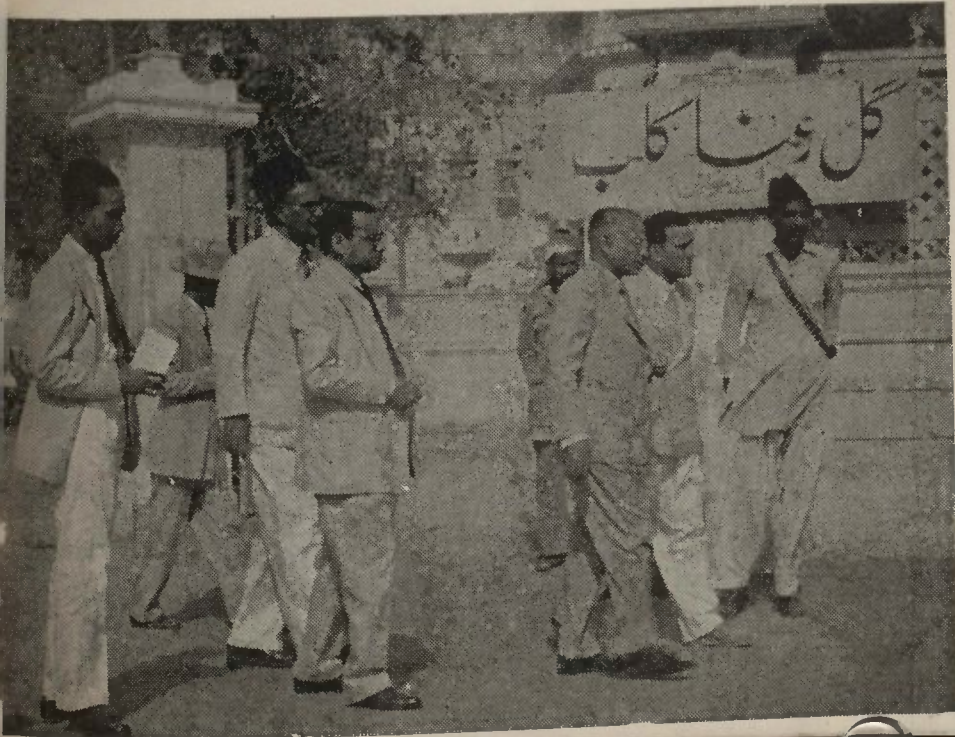
خالی وقت میں
دستکاری کی تعلیم

بچّوں کی تعلیم سے
غفلت نہیں برتی گئی
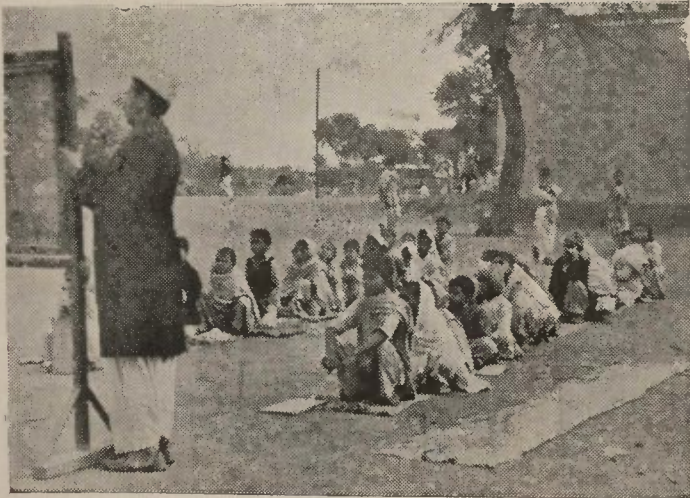
اگر کہیں جگہ نہ ملی
تو باہر میدان میں مدرسہ
کھُل گیا

ہم سے بھی پرانے مہاجروں کا شہر

سندھ میں پانچ ہزار سال پرانے شہر
موہنجوداڑو کے کھنڈر (صفحہ ۱۷۳ دیکھئے)

۲۴ فروری ۱۹۴۹ء
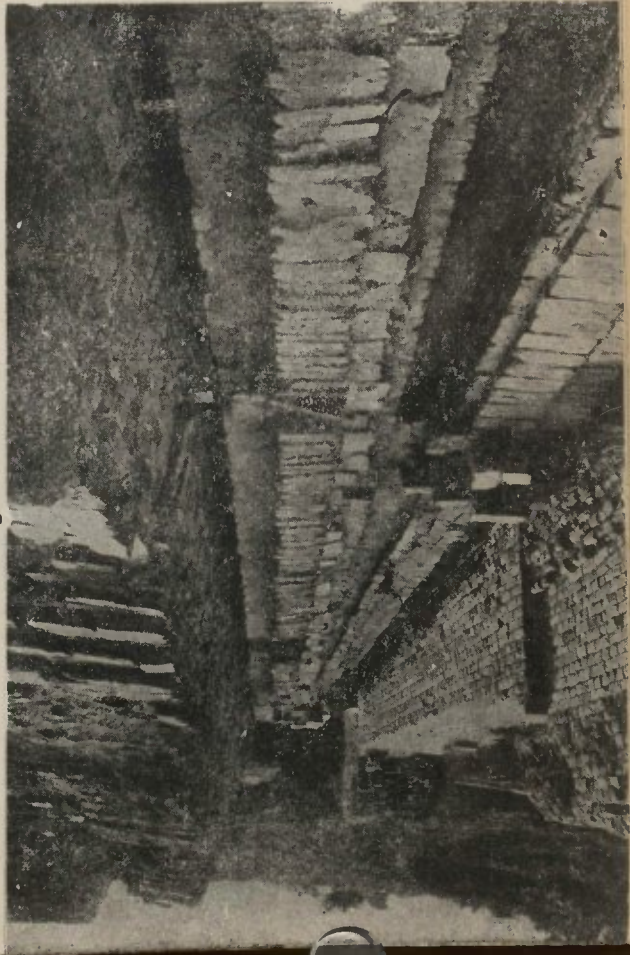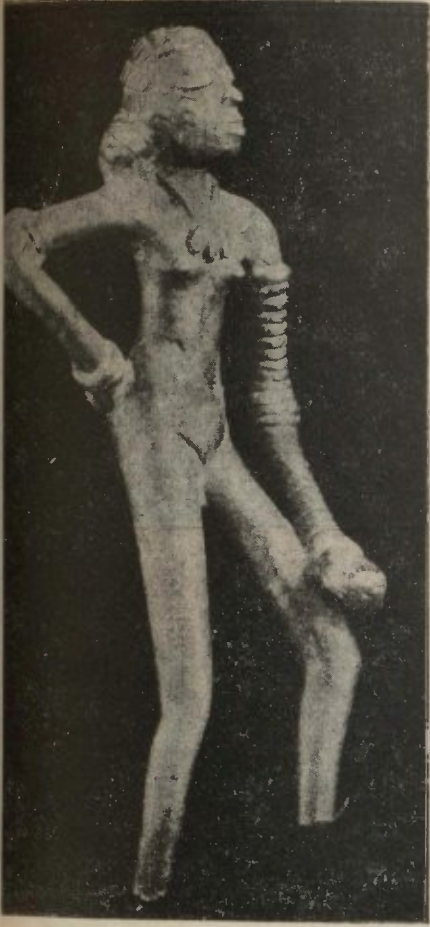
وزیرِ اعظم اور مہاجرین

پچھلے ہفتہ کراچی میں آلِ پاکستان مسلم لیگ کونسل کے اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے آنریبل مسٹر لیاقت علی خاں نے مہاجرین کا ذکر جن الفاظ میں کیا ہے اُسے سب مہاجرین کو غور سے سُننا چاہیئے مسلم لیگ کونسل کے اجلاس میں پاکستان کے ہر علاقے اور صوبے سے ممبر شریک ہونے کے لئے آئے تھے اور ان سب ممبروں کو مہاجرین کی تکلیفوں اور پریشانیوں کا خیال تھا۔ چنانچہ لیگ کونسل کی تجویزوں اور بحثوں میں بار بار مہاجرین کا ذکر آیا۔ مسٹر لیاقت علی خاں نے فرمایا تھا۔

"۱۵ اگست جس دن آزادی کا جھنڈا لہرایا گیا۔ نہ دفتروں میں میز نہ کرسی نہ قلم نہ دوات نہ کاغذ۔ اس حالت میں پاکستان عالمِ وجود میں آیا۔

"۱۵ اگست سے پہلے ہی ہزارہا مہاجرین لاہور پہنچ گئے تھے۔ ان تمام مصائب کے باوجود مسلم قوم نے ثابت کر دیا کہ وہ آزاد حکمران ہونے کی مستحق ہے۔ لاکھوں کی تعداد میں مہاجرین کا تانتا بندھنا شروع ہو گیا۔ ہزارہا عورتیں اغوا کی گئیں۔ لاکھوں بچے شہید کئے گئے۔ مہاجر مردوں پر ایک چادر لئے، اُوپر آسمان اور نیچے زمین ملا آرہا تھا۔ اندازہ لگایئے کہ کیا کیا دقتیں حکومت کو پیش آئیں۔ اندازہ لگایئے کہ مہاجرین کے لئے ہمارے پاس کیا بند و بست تھا۔ دنیا کا کونسا ملک ہے جو ان کا انتظام کر سکتا۔ لاکھوں مسلمان مشرقی پنجاب میں رہ گئے تھے۔ ان کی حفاظت کے لئے فوج بھیجنے کی ضرورت تھی۔ مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کے لئے کھانے کا بھی انتظام کرنا تھا۔ میں یہ واقعات دوہرا کر آپ کے جذبات میں ہیجان نہیں پیدا کرنا چاہتا۔ میں صرف عام حالت (جنرل پکچر) دکھلانا چاہتا ہوں کہ پاکستان کس طرح عالمِ وجود میں آیا۔ اس وقت تک ۷۰ لاکھ مہاجرین آئے ہیں۔ اور جو گئے ان کی تعداد ۵۰ لاکھ ہے۔ اور یہ سب ۵ مہینے میں آئے کیمپوں میں ۱۰ لاکھ تک مہاجر ایک وقت میں رہے۔ جو کچھ بھی حکومت سے ہو سکا کھانا کپڑا اور دوائیں مہیا کی گئیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ہر ایک کو آسانی اور آرام پہنچایا گیا۔ مالی حالت دیکھئے اور پھر خرچ کا اندازہ کیجئے۔ ایک لاکھ

مہاجرین کو کیمپ میں رکھنے کا ایک کروڑ روپیہ خرچ آیا۔ پھر ٹرینوں میں ان کا جانا، ان کو رکھنا، ملک بھر میں پریشانی تھی اور تباہ حال تھے۔ انتظام کیسے رکھا جاتا۔ جو لوگ ہمارے بدخواہ تھے کہتے تھے کہ پاکستان چند ہفتوں میں ختم ہو جائے گا۔ مجھے اُن سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ مگر بہت سے مسلمان ایسے بھی تھے جو پاکستان کے لئے جان تک دینے کے لئے طیار تھے۔ ان کے ارادوں میں بھی تزلزل پیدا ہو گیا تھا۔ اتنا بڑا مصیبت کہ دنیا کی کونسی حکومت سنبھال سکتی تھی۔ مگر میرے دل میں ایک لمحہ کے لئے بھی یہ شبہ نہیں آیا کہ پاکستان قائم نہ رہے گا۔ میرا یہ ایمان ہے کہ ہم پاکستان کے مستحق نہ تھے۔ ہمارے اعمال ہی ایسے نہ تھے۔ یہ نعمت اللہ نے ہم کو دی ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ وہ ہم سے اس کو نہ چھینے گا جب تک کہ ہم خود ہی اپنی بداعمالیوں سے اس کے نااہل ثابت نہ ہو جائیں۔ لاہور میں لوگ موٹروں میں پٹرول ڈالے بستر باندھے تیار بیٹھے تھے کہ اب حملہ ہؤا اور وہ بھاگے۔ مگر بھاگنے کا کوئی سوال ہی نہیں تھا سوائے اس کے کہ سمندر میں ڈوب جائیں۔ یاد رہے پاکستان کی تباہی میں ہر ایک کی تباہی ہے۔ یہ ہمارا عزم تھا جس میں خدا نے ہم کو کامیاب کیا۔ قائدِ اعظمؒ نے فرمایا تھا کہ پاکستان کی حفاظت لاہور سے کی جا سکتی ہے۔ میں وہاں گیا میں بارڈر پر جایا کرتا تھا۔ یہ تمام جذبہ ایثار و استقلال کا نتیجہ ہے۔ مہاجرین بھوکے ننگے کمزور بڈھے۔ سڑکوں پر پیدل چل کر یہ پوچھتے تھے کہ کیا پاکستان آ گیا۔ مگر جواب ملتا تھا ابھی نہیں۔ وُہ پھر آس لگائے ہوئے چلتے۔ اور سرزمین پاکستان میں پہنچ کر اطمینان کا سانس لیتے اور خدا کا شکر ادا کرتے تھے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کی وجہ سے پاکستان بنا ہے۔ اور یہ سب استقلال جذبہ اور ایثار کا نتیجہ ہے یہ میرا کام نہیں۔ یہ میری حکومت کے وزراء کا کام نہیں۔ یہ محض قوم کا استقلال ہے کہ آج ہم سربلند کر کے دنیا میں جا سکتے ہیں۔"

مسٹر لیاقت علی خاں کو مہاجرین کی طاقت اور ہمت پر اعتماد ہے۔ اس کا مظاہرہ تمام سندھ میں جہاں جہاں مہاجرین موجود ہیں ہو رہا ہے ہمارے ایک مہاجر بھائی نے مشکلوں کے باوجود اُن پر یوں قابو پایا ہے۔

گوڑیانی کے باہمت مہاجر

اب آپ میری بھی پریشانی سُنیئے۔ ماہ فروری ۴۸ء میں [illegible]ریانی کے سب مہاجر ملتان کیمپ سے آ کر شاہ پور چاکر ضلع نواب شاہ میں آباد ہو گئے۔ میرا کنبہ بھی گاؤں کیساتھ شاہ پور چاکر میں آباد ہو گیا۔ یہاں آ کر میں نے پٹوار خانہ دریافت کیا۔ اور پٹواریوں کے پاس آنا جانا شروع کر دیا۔ کبھی کبھی نواب شاہ

جاکر براج مختیارکار صاحب کے دفتر میں بھی چکر لگاتا رہا۔ اسی طرح سے کافی دن گزر گئے۔

ایک دن ایک پٹے دار نے مجھے سکھوں کی زمینیں دیکھنے کے لئے دو سندھیوں کے ساتھ بھیج دیا میں نے اپنے دو اور دوستوں کو بھی ساتھ لیا۔ اور سندھیوں کی بیل گاڑی میں سوار ہو کر چل دیا۔ ہم تقریباً دو میل کے فاصلے پر پہنچے تھے کہ ایک چھوٹا سا دیہاتی قسم کا گاؤں نظر آیا۔ گاڑی والے نے گاڑی ٹھہرائی۔ خود بھی اتر گیا۔ اور ہمیں بھی اترنے کو کہا۔ پھر اس نے اپنے اطاق میں جو کہ دیہاتی قسم کی بیٹھک تھی ہمیں بٹھا دیا۔ اس کے بعد وہ نبگل نبگل چلایا۔ آواز سنتے ہی ایک آدمی آیا۔ اور اس نے سلام کیا۔ ہمارے دوست سندھی نے کہا نبگل یہ میزبان ہیں۔ ان کو پانی دھانی کو پوچھنا۔ میں بیل باندھ کر ابھی آرہا ہوں۔ جب وہ واپس آیا تو ہم سب جنگل کی طرف چل دیئے۔ تقریباً ایک میل چلے ہوں گے۔ کہ نبگل نے ہمیں سکھوں کی زمین بتانا شروع کی۔ جب ہم تمام زمین دیکھ چکے تو شاہ پور جاکر واپس آگئے۔ دوسرے روز میں براج مختیارکار صاحب نواب شاہ کے دفتر میں گیا۔ وہاں پر معلوم ہوا کہ زمین چونکہ ایک مرتبہ مہاجرین کو تقسیم ہو چکی ہے۔ اور اب یہ دوبارہ ریونیو افسر صاحب کراچی کے حکم سے دی جائے گی۔ لہٰذا میں اسی شام کی گاڑی سے کراچی کو روانہ ہو گیا۔ اور پھر کراچی سے زمین حاصل کرنے کا حکم نامہ لے کر کلکٹر صاحب نواب شاہ کے دفتر میں گیا۔ یہاں ضروری کارروائیوں کے بعد مجھے ۱۳ جولائی کو ۲ کنبوں کے لئے ۳۲۵ ایکڑ زمین کا حکم نامہ مل گیا۔ زمین حاصل ہونے کے بعد میں وڈیرہ شیر دل کے پاس گیا۔ اور اپنا تمام قصہ سنایا۔ اور بتایا کہ نہ میرے پاس بیل ہیں نہ بیج ہے۔ شیر دل اور علی مردان نے میری ہمت بڑھائی اور کہا تم فکر نہ کرو۔ دوسرے دن شیر دل نے اپنے پاس سے مجھے بیلوں کے دو جوڑے۔ مکئی۔ جوار۔ باجرہ کا بیج دے دیا۔ اور اپنے ہاڑی بھی میرے ساتھ کر دیئے۔ اس کے بعد پانی کے لئے میں آبدار مسٹر قادر بخش کے پاس گیا وہ مجھے ایس۔ ڈی۔ او صاحب شاہ پور جاکر مسٹر صدر الدین سلطان کے پاس لے گئے۔ میں نے عرض کی کہ صاحب ہمیں زمین چار پانیوں پر اور وہ بھی ہر ایک کی پونچھڑی پر ملی ہے۔ سلطان صاحب نے کہا کہ آپ گھبرائیں نہیں میں انشاء اللہ آپ کو تکلیف نہ ہونے دوں گا۔ اور ایسا ہی ہوا۔ خدا کے فضل و کرم سے ہماری زمین پر مکئی جوار باجرہ تقریباً ۲۰۰ من پیدا ہوا جس سے ہمارے حوصلے اور بھی بڑھ گئے۔"

مہاجرین نے سندھ کی سرزمین کو جس طرح اپنا وطن بنایا ہے اس کی ایک اور مثال شیر خاں سے سنیئے:۔

ضلع سکھر کے مہاجرین

میں نے سب سے پہلے سکھر کی تحصیل کا دورہ کیا۔ اور میں چشم دید واقعات بیان کرتا ہوں۔ کہ

موضع جات ماتسم۔ مجوب۔ جہاں خاں اور بیجانچی میں مہاجرین نے اپنے ہاتھ سے سینکڑوں ایکڑ زمین میں ہل چلایا۔ اور حکومت سے تقاوی کا بیج لیا۔ اور اس زمین میں بویا۔

یہ بہادر لوگ ضلع گوڑگانوہ اور ریاست الور کے ہیں۔ موضع قاسم میں تو مہاجرین نے خود اپنے ہاتھ سے ایک کنواں کھودا اور اس سے سبزی کی کاشت شروع کی۔ ان کی دیکھا دیکھی موضع تھمی اور موضع ماڑی کے مہاجرین نے بھی کام شروع کر دیا۔ اور حکومت سے تقاوی کا بیج لیا۔ اور زمین میں بویا جہاں انہوں نے اپنے ہاتھ سے ہل چلایا تھا۔

اس کے بعد میں نے ٹنڈو بارو پور کی تحصیل کا دورہ کیا اور دیکھا کہ سینکڑوں ایکڑ زمین میں مہاجرین نے اپنے ہاتھ سے ہل چلایا مثلاً بھکاری گوٹھالہ۔ گوٹھ آشرم۔ پرمانند باغ کے علاقوں میں گیہوں اور چنے کی فصلیں لہلہا رہی ہیں۔ اور مہاجرین ان کی نگہداشت میں مصروف ہیں۔ موضع خان پور میں تقریباً تین ہزار مہاجر آباد ہیں۔ چنانچہ انہوں نے اعلیٰ پیمانے پر دکانیں بھی کھول رکھی ہیں اور لوگ اپنے کاروبار میں مشغول ہیں۔ ایک چھوٹا سا قصبہ گوٹھ آرام میں مہاجرین نے ایک مسجد بنائی ہے۔ اور ایک مہاجر بھائی جو سیّد ہیں قرآن کریم کا درس دیتے ہیں۔ میں ان بچوں سے ملا جو یہاں تعلیم پاتے ہیں۔ موضع خان پور میں تقریباً ۶۰ جوان نیشنل گارڈ کی تعلیم لیتے ہیں اور ملٹری کے پنشن یافتہ لوگ ان کو ملٹری کی تربیت دیتے ہیں۔

اس کے بعد میں نے موضع جات سرور کوٹ اور کرن کا دورہ کیا۔ اور میری خوشی کی کوئی حد نہ رہی جب کہ میں نے دیکھا کہ مہاجرین نے اپنے ہاتھوں سے نہ صرف زمین کی آبادکاری ہی کی۔ بلکہ ۶۰۔۷۰ جھونپڑیاں جو نہایت خوبصورت معلوم ہوتی تھیں ان کی دیوار ۴ فٹ اونچی تو مٹی کی تھی اور باقی کام تقریباً دو فٹ اوپر سرکنڈے اور گھاس پھوس کا تھا۔ دیکھنے میں اتنی خوبصورت اور آرام دہ معلوم ہوتی تھیں کہ دل بے ساختہ بنانے والوں کی تعریف کرتا تھا۔ یہ لوگ گوڑگانوہ۔ بھرت پور اور الور ریاست کے ہیں۔ یہ اپنے ہاتھ سے نہایت اعلیٰ قسم کے سرکنڈے کی چکیں بنا سکتے ہیں اور رسّی بٹ سکتے ہیں۔ چنانچہ ہر جھونپڑی میں دو تین چٹائیاں تھیں جو انہوں نے خود بنائیں اور رسّی بٹ کر اُن کو بُنا۔

تحصیل گڑھی لسین کے دورہ میں میں نے یہ دیکھا کہ مہاجرین نے موضع جات ماڑو بلا۔ مانک آباد دکن۔ علی خاں اور واصل میں سینکڑوں ایکڑ زمین پر خود ہل چلایا۔ اور گیہوں اور چنا بویا اور جس جگہ بیل نہیں تھے وہاں سندھی ہاریوں سے کرایہ دے کر بیل لئے اور زمین کی آبادی کی۔ ان بہادر لوگوں سے دوسرے مہاجرین بھائی سبق لیں۔ اور اپنا وقت ضائع نہ کریں اور یہ مت سمجھیں کہ پنجاب میں ان کو اس سے زیادہ مل جائے گا۔ بلکہ وہاں شاید مایوس ہونا پڑے۔ اس واسطے ہر مہاجر بھائی کا فرض ہے

کہ وُہ اپنے کام میں مشغول ہو جائے اور اپنا اور حکومت کا ہاتھ بٹائے کیونکہ خدا ان کی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد خود کرتے ہیں۔

سندھ کے ایک اور ضلع میں مہاجرین نے اپنی مدد خود آپ کی ہے۔ غلام فرید بھٹی اس کا حال سناتے ہیں

سندھ کے نئے باشندے

گھوٹکی تعلقہ میں راموں والی گاؤں کے مہاجرین نے اپنی محنت اور ثابت قدمی سے بظاہر ویران زمین کو سرسبز و شاداب کر دکھانے کی ایک ایسی مثال قائم کی ہے جس کی نظیر بہت کم ملے گی۔ دن رات کی مسلسل کوششوں اور پیہم محنتوں سے آج ان کی کھیتیاں لہرا رہی ہیں۔ اور یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ قتل و غارت گری کی پُر مصائب کیفیتوں کے بعد آج وہ پھر فخر کے ساتھ ان سبزہ زار کھیتوں کو دیکھ دیکھ کر جی رہے ہیں جو عنقریب اپنے سینے سے اناج اگلوا کر انہیں انعامِ الٰہی سے مالا مال کر کے ان کی مدت سے خالی جھولیوں کو بھر دیں گی۔

سرزمین سندھ میں پیاز کی کاشت کا خاصا جوہر موجود ہے۔ چنانچہ سکھ والا گاؤں کے عقلمند مہاجرین نے اپنی قسمت آزمائی کا سنگِ بنیاد پیاز کی پنیریاں لگا کر رکھا ہے جو یقین ہے کہ ان کے لئے باعثِ رحمت ہوگا۔ اجڑے ہوئے کنوئیں اور برباد شدہ زمینیں ان کی چند روزہ محنت سے از سر نو درست ہو کر مہاجرین کاشتکاروں کی زندہ دلی اور عالی حوصلگی کا ثبوت دے رہے ہیں۔ اور اللہ کے وعدہ کے مطابق ان کی محنت کا پھل جلد ہی انہیں ملے گا۔

جن جن مہاجرین کو کاشتکاری کے لئے بیلوں کی ضرورت تھی حکومت نے انہیں مہیا کر دیئے اور ہندوستان سے ہجرت کے بعد پہلی مرتبہ انہوں نے اپنے ہاتھوں سے ہل چلایا۔ تو ان کی خوشی کا ٹھکانہ نہ تھا۔ میں نے بعض گاؤں میں جب ایسے نظارے دیکھے تو میرے دل پر اس کا بہت گہرا اثر ہوا۔ اور مہاجرین کی مشقتوں اور اٹل ارادوں پر بے اختیار داد دینے کو جی چاہا۔

بنوں عاقل تعلقہ کے سانگی گاؤں میں بعض کاریگر مہاجرین بھی آباد ہیں۔ مناسب اوزار نہ ہوتے ہوئے بھی انہوں نے ایسی کرسیاں اور میزیں تیار کر ڈالیں کہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے۔ ان میں کچھ کاریگر مہاجر ایسے بھی موجود ہیں جنہوں نے اپنے ہاتھوں سے بنائی ہوئی لکڑی کی سالن ڈالنے والی ڈوئیاں دکھائیں جو نزاکت، پختگی اور خوبصورتی کے لحاظ سے ولایتی مشینوں کی طیار کی ہوئی چیزوں کے مقابلے میں ایک

کرشمہ معلوم ہوتی ہیں۔
گھوٹکی کے اسکول میں مہاجرین بچوں کی جماعت میں ایک گھنٹہ کے قریب مجھے ٹھہرنے کا اتفاق ہوا۔ مہاجر بچوں کی فلاح وبہبود کا جو قدرتی جذبہ ہر دل میں ہونا چاہیئے اس سے بھی غافل نہیں۔ چنانچہ مجھے کئی مہاجر بچوں سے کئی قسم کے سوالات دریافت کرنے کا اتفاق ہوا۔ اور مہاجر بچوں کی ناداری۔ کم لباسی اور کتابوں اور کاغذ پنسل کی کمی کے باوجود میں نے دیکھا کہ ان کے دل ودماغ ان کی بات چیت اور ان کے اسلوبِ ادائگی میں ذرّہ بھر فرق نہیں آیا۔ ہر سوال کا جواب اور ہر بات کا تذکرہ انہوں نے اس انداز سے کیا کہ اس کا اثر آج تک میرے دل پر قائم ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہی مہاجر بچے جو آج قوم کی توجہ کے مستحق ہیں کل پاکستان کی سربلندی اور اس کے وقار کے تحفّظ کے لیئے ایک لوہے کی دیوار ثابت ہوں گے۔"

مہاجرین نے اپنی ثابت قدمی سے ثابت کر دیا کہ پاکستان کے لیئے ان کا وجود ایک بوجھ نہیں بلکہ برکت ہے۔ مسٹر لیاقت علی خاں نے اپنی تقریر کے آخیر میں فرمایا تھا۔
"یہی وہ لوگ ہیں کہ جنہوں نے پاکستان بنایا" پاکستان کو یقیناً اپنے مہاجرین کی ہمت اور صبر پہ ناز ہے۔

۲، مارچ ۱۹۴۹ء

پاکستان کی خوشحالی میں مہاجرین کا حصّہ

اس ہفتے پاکستان کی پارلیمنٹ کے سامنے وزیرِ خزانہ آنریبل مسٹر غلام محمد نے پاکستان کا دوسرا سالانہ بجٹ پیش کرتے ہوئے کہا کہ گزشتہ سال کا بجٹ جس وقت پارلیمنٹ کے سامنے رکھا گیا تھا اس وقت پاکستان ستر لاکھ مہاجرین کو بسانے کے سوال پر غور کر رہا تھا۔ اور ایک نئے ملک کے لئے یہ ایسا زبردست بوجھ تھا کہ اس کے نیچے سب دبے جا رہے تھے مگر پاکستان کے خزانے سال بھر تک اس بوجھ کو برداشت کرتے رہے اور خدا کا شکر ہے کہ اس سال پاکستان کی مالی حالت پہلے سے بہتر ہے۔ ہماری تجارتی اور کاروباری ساکھ تمام دُنیا میں قائم ہو چکی ہے اور پاکستان کی مالی حالت پر سب نے اطمینان کا اظہار کیا ہے۔ مگر ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ ایک سال پہلے ہماری کیا حالت تھی۔ اس کا حال مِس مسرت تیموری سے سنیئے:۔

اگست ۱۹۴۷ء

میں اگست ۱۹۴۷ء میں کراچی آگئی تھی۔ شروع شروع میں کراچی آنے کی خوشی تو بہت ہوئی لیکن جس طرف نگاہ ڈالو اُداسی اور ویرانی سی نظر آتی تھی۔ شہر ایسا سنسان معلوم ہوتا تھا کہ طبیعت بالکل نہ لگتی تھی نئے نئے لوگ نئی نئی صورتیں نئی جگہ ادھر اودھر سے آدمی کم۔ اردو سمجھنے والے لوگ برائے نام ہی تھے۔ ضروریاتِ زندگی خرید و فروخت تک میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ یہاں تک کہ عید کے دن سویوں کے لئے کیوڑے کی ضرورت ہوئی تو شروع شروع میں وہ بھی نہ ملا۔

سب رشتے دار دہلی ہی میں رہ گئے تھے۔ ان کی یاد ستاتی تھی۔ لیکن ستمبر میں دہلی پر قیامت آن ٹوٹی۔ مسلمان گھر سے بے گھر ہو کر اپنا سب کچھ لٹا کر پناہ لینے پاکستان آنے شروع ہوئے۔ ہم لوگ پریشان تھے۔

کہ الٰہی! عزیزوں اور رشتے داروں کا کیا حال ہوا ہوگا جس دن کراچی میں دہلی کے فسادوں کی خبر آئی۔ دل دھک سے رہ گیا۔ دہلی والوں کی تکالیف سے جو رنج وافسوس ہمیں ہوا ہے۔ وہ خدا ہی جانتا ہے۔ جو کچھ دور بیٹھے ہم سے ہو سکتا تھا۔ وہ ان بے چاروں کی مدد کے لئے کیا۔ گھر گھر عورتوں نے ساری ساری رات بیٹھ کر کھانے اور روٹیاں پکائیں اور پرانے قلعے کے پناہ گزینوں کے لئے بھیجیں تھوڑے سے ہی عرصے میں کراچی آباد ہو گئی۔ یوں سمجھیئے کہ دہلی یہیں الٹ آئی۔ چند رشتے دار دہلی کی نذر ہوئے اور باقی اپنا مال واسباب لٹوا کر اپنی جانیں بچا بچا کر پاکستان آن پہنچے۔ دل کی گھبراہٹ، اور طبیعت کی پریشانی سب دور ہو گئی۔ اور یہاں کے صحرا تک دہلی کی گلیوں سے پیارے ہو گئے۔ وہ دہلی جہاں صدیاں گزاری تھیں اب یاد بھی نہیں آتی۔ آزادی کی فضا میں سانس لینا ہزار تکالیف سہنے کے باوجود بہتر معلوم ہوتا ہے۔

خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ وہ مصیبت کا زمانہ گزر گیا اور خدا نے مسلمانوں پر اپنی رحمت کی۔ اس زمانے میں اور اب میں زمین آسمان کا فرق نظر آتا ہے۔ کراچی جو کبھی جنگل معلوم ہوتا تھا اب وہ دہلی سے زیادہ خوبصورت اور دلچسپ نظر آتا ہے۔ ہر طرف ترقی اور بہتری کے آثار نمایاں ہیں۔ اور خدا لگتی بات تو یہ ہے کہ جو اطمینان اور خوشی میں یہاں پاتی ہوں وہ کبھی دہلی میں بھی محسوس نہ ہوئی تھی۔ اور میرا خیال ہے کہ جیسی خوشحالی کراچی میں ہے وہی حال پاکستان کے تمام شہروں کا بھی ہوگا۔

---*---

ہماری مالی حالت کو بہتر بنانے میں ہر پاکستانی کی محنت اور کوشش کو دخل ہے کیونکہ جب تک قوم کے سب افراد مل کر ملک کی حالت بہتر نہ بنائیں، کوئی حکومت تنہا یہ کام نہیں کر سکتی ہمارے بہت سے مہاجرین نے حکومت سے مدد کی درخواست کرنے کے بجائے اپنے قدموں پر خود کھڑے ہونے کی کوشش کی ہے۔ ان میں میمن قوم کے مہاجر خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ پانچ سو سال پہلے یہ لوگ سندھ میں ٹھٹھے کے قریب بستے تھے اور انہیں مومن کا خطاب ملا تھا جو بعد میں بگڑ کر میمن بن گیا۔ سندھ کے یہ لوگ کاٹھیاواڑ اور کچھ کے علاقوں میں پھیلے اور اب پانچ سو سال بعد وطن میں مہاجر بنکر آئے اس قوم کے ایک باہمت شخص نے کراچی میں یوں کاروبار شروع کیا۔

ہمت والا مہاجر

ہماری بستی بانٹوا میں تھی جو جوناگڑھ کے قریب کاٹھیاواڑ میں ہے۔ جب وہاں فسادات ہوتے تب

یں وہاں پر نہ تھا۔ میرے اہل وعیال اور رشتہ داروں کے ساتھ کراچی آ گئے۔ پانچ مہینے پیشتر جب میں یہاں آیا تو میرے پاس صرف پانچ سو روپے کی پونجی تھی۔ میں نے ملازمت کرنے کے عوض تجارت کرنے کا فیصلہ کیا۔ اتنی چھوٹی سی رقم میں کونسی تجارت کرنی چاہیئے۔ اس کوشش میں میں شہر کے مختلف بازاروں میں پھرتا رہا۔ آخر کار مجھے یہاں کی کپڑے کی مارکیٹ کچھ اچھی دکھائی دی۔ مجھے کپڑے کا کچھ تجربہ نہ تھا۔ تاہم میں نے خدا کا نام لے کر اتنی چھوٹی سی رقم کے کچھ تھان خریدے اور انہیں اپنے کندھے پر ڈال کر بازار میں کھڑا ہو گیا۔ شام تک میرے سب تھان بک گئے۔ اور اس میں پانچ روپیہ منافع ہوا۔ میرے اکثر خریدار مہاجرین بھائی ہو گئے ہیں۔ اور میں انہیں بہت کم منافع سے مال بیچا کرتا ہوں اور ان سے وقتاً فوقتاً حال پوچھا کرتا ہوں۔ اس وجہ سے میرے پاس ہر وقت مہاجرین بھائیوں کا مجمع رہتا ہے۔ اس طرح میں کئی روز تک روزی کماتا رہا۔ اب کچھ مہینے ہوئے کندھے پر تھان ڈال کر بیچنے کی بجائے مارکیٹ کی سڑک پر بوریاں بچھا کر تھان اوپر رکھ کر بیچا کرتا ہوں۔ اس عرصے میں کپڑے کے بڑے بڑے تاجروں کے ساتھ میری اچھی جان پہچان ہو گئی ہے۔ اس لئے مجھے ان سے ہزار دو ہزار کا کپڑا ادھار مل جاتا ہے۔ اور خدا کا شکر ہے کہ میں اسس طرح روزی کما لیتا ہوں۔ اس طرح مارکیٹ کی سڑک پر بیٹھ کر سینکڑوں مہاجرین بھائی اپنی روزی کما لیتے ہیں۔

انہی کے ایک اور ساتھی نے بجائے حکومت کے کندھوں پر بوجھ بننے کے اپنی روزی ایک اور ڈھنگ سے کمائی۔ اس کی تفصیل یہ ہے :۔

مہاجرین نے ہمت نہیں ہاری

میں ریڈیو اور گراموفون ریکارڈوں کی تجارت کرتا تھا۔ جب ہمارے یہاں فسادات ہوئے۔ تو ہماری بستی کے تقریباً سارے مسلمانوں کی آبادی ہجرت کر کے یہاں آ گئی۔ اس لئے مجھے بھی اپنی دوکان چھوڑ کر یہاں آنا پڑا۔ میری دوکان میں اس وقت جو کچھ مال تھا اس کی قیمت بائیس ہزار ۲۲۰۰۰ روپے کی تھی۔ جسے بیچنے پر مجھے صرف چار ہزار روپے ملے اور یہ رقم کراچی میں دوکان اور گھر لینے پر خرچ ہو گئی۔ میں ریڈیو درست کرنے کا کام جانتا ہوں۔ میں نے ریڈیو درست کرنے کا کام چالو کر دیا۔ میرا کام چلنے لگا۔ چند مہینے کے بعد کچھ رقم جب جمع ہو چکی تو ریڈیو کے نئے سیٹ بیچنے چالو کر دیئے۔ اور اب خدا کے فضل سے کاروبار اچھا چلتا ہے۔ میرا تو یہ پختہ عقیدہ ہے کہ کوئی بھی انسان سچے دل سے

روزی کمانے کی کوشش کرے اللہ پاک اسے کسی نہ کسی طرح روزی کمانے کا راستہ دکھا دیتا ہے۔

مگر اس انقلاب میں بعض لوگوں نے یہ چاہا کہ جلدی سے امیر بن جائیں۔ دوسروں کا حق چھین لیں یا زیادہ منافع لے کر اپنی دولت بڑھا لیں۔ ایسے لوگ قوم اور ملک کے دشمن ہیں اور ان سے کسی کو ہمدردی نہیں ہو سکتی۔ مگر انہی کے ساتھ ساتھ وہ مہاجر بھی ہیں جو دن رات اپنی محنت اور پسینے سے پاکستان کو ایک کامیاب سلطنت اور شاندار ملک بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان دونوں قسم کے مہاجروں کا موازنہ حسن حبیب صاحب نے یوں کیا ہے۔

مہاجروں کی دو قسمیں

ایک روز میں کراچی میں جا رہا تھا کہ دفعتہً ایک موٹر سڑک پر رکی اور اس میں سے ایک جنٹلمین سرتاپا انگریزی لباس پہنے ہوئے مجھ سے ملنے کے لئے باہر نکلے۔ مجھے ان کو پہچاننے میں ذرا تامل ہوا لیکن پھر فوراً ہی خیال آ گیا کہ یہ تو آگرہ کے وہ درزی تھے جن سے میں اکثر کپڑے سلوایا کرتا تھا۔ اب انہوں نے اپنا یہ کام چھوڑ دیا تھا۔ اور اکسپورٹ امپورٹ کا لائسنس حاصل کرنے کی فکر میں لگے ہوئے تھے اور چاہتے تھے کہ میں اُن کے صاحبزادہ کو کسی یورپین اسکول میں داخل کرانے میں ان کی مدد کروں۔

ابھی میں حیدرآباد (سندھ) گیا تو اسی قسم کا ایک اور واقعہ نظر آیا۔ علی گڑھ اور میرٹھ کی نمائشوں کا مشہور کباب پراٹھے والا اب جنرل مرچنٹ بنا ہوا تھا۔ ایک دوکان اس نے چالیس ہزار روپے میں خریدی تھی۔ تجارت کا تجربہ تو تھا نہیں۔ پانچ ہزار روپے کا گھاٹا اٹھا کر اس دوکان سے اپنا پیچھا چھڑا لیا۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ ایک کام جاننے والے نے بہت خوشی سے وہ دوکان ساٹھ ہزار میں خرید لی۔

ان دونوں مثالوں سے بخوبی ظاہر ہوتا ہے کہ ہر شخص جہاں تک ممکن ہو جلد سے جلد مالدار بننے کی دھن میں لگا ہوا ہے۔ شہری علاقوں میں یہ آبادکاری کا ایک رُخ ہے۔ حالانکہ یہ اقتصادی ترقی کے ہر اصول کے خلاف ہے اس لئے اس کی ہمت افزائی نہ ہونی چاہیئے۔

دوسری طرف ابھی جب میں صوبہ سندھ میں دورہ کر رہا تھا تو مجھے اکثر ایسے مہاجر ملے جو بیچارے غریب تھے اور جن کے پاس سوائے ان کے گاڑھے پسینے کے اور کوئی سرمایہ نہیں تھا۔ لیکن ان میں حوصلہ تھا، سمجھ تھی اور کام کرنا چاہتے تھے۔ مہاجرین نے کہیں کہیں تو ایسے کاروبار شروع کر دیئے ہیں جو پہلے موجود نہ تھے۔ بہت سے کاروبار ایسے ہیں جن میں انہوں نے پہلے سے بہت زیادہ ترقی

دکھائی ہے۔ جُلاہے اور جُوتے بنانے والے تو قریب قریب سب کے سب محنتی ہوتے ہیں۔ اور اکثر جہاں وہ کام کر رہے ہیں وہاں کے رہنے والوں میں اپنی بنائی ہوئی چیزوں کے لئے اچھی خاصی مانگ پیدا کر لی ہے۔

اکثر تعلقوں کے چھوٹے چھوٹے قصبات میں نئے دستی کرگھوں کے کارخانے شروع کر دیئے گئے ہیں۔ اگر وہاں کے موجودہ مہاجرین میں ہوشیار دستکار نہیں ملے تو خاص طور پر مغربی پنجاب سے بلوائے گئے۔ ایک قصبہ میں مہاجر بڑھئی نے کرگھے تیار کرانے شروع کر دیئے ہیں، جو دوسرے تعلقوں کے اندر کثرت سے استعمال ہو رہے ہیں۔ مہاجر جلاہوں نے مقامی لوگوں کی پسند کا بہت اچھی طرح اندازہ لگا لیا ہے۔ اور ایسے نمونے کے کپڑے بنانے شروع کر دیئے ہیں جو سندھ کے رہنے والے خاص طور پر پسند کرتے ہیں۔ سندھ میں اب سے پہلے معمولی اور بھونڈے قسم کے جوتے بنائے جاتے تھے۔ اب مہاجر انگریزی جُوتے بنا رہے ہیں۔ وہ مضبوط بھی ہیں اور خوبصورت بھی۔ سندھی جوتے بنانے والوں نے بھی اب یہ کام سیکھنا شروع کر دیا ہے۔ اور اکثر جگہ سندھی اور غیر سندھی دونوں خوب جوتے کا کام کر رہے ہیں۔ اور فرمائش کے مُطابق جوتے بناتے ہیں۔

سیمنٹ کی ٹائلوں کے ایک کارخانے میں میں نے دیکھا کہ وہاں کے ایک بڑے مشہور کاریگر نے بہت اچھا واش بیسن اور باتھ ٹب بنا لیا ہے۔ یہ اس کارخانے کا اپنی قسم کا پہلا کام تھا۔ ہندو کاریگر ایسا کام نہیں کرتے تھے۔ پنکھوں کی ایک فیکٹری میں ایک مہاجر مستری نے ایک اچھی خاصی ایجاد کر لی۔ بجلی کے انجن سے دھاگے کی بنی ہوئی بابوں کو کھول کر ان کی پچھیاں بنائی جاتی ہیں۔ اور اسی انجن سے پنکھوں کی مشین چلائی جاتی ہے۔ یہ سب کام اس نے خود اپنے ہاتھ سے کیا تھا۔ میں نے اس سے پُوچھا کہ یہ کام تم نے کہاں سیکھا تو اس نے مجھے اپنے اوزاروں کا ایک چھوٹا سا تھیلا ایک کونے سے اُٹھا کر دکھایا اور ذرا فخر کے ساتھ کہنے لگا یہ ہے میرا ورکشاپ (کارخانہ)۔

مجھے ایسی بے شمار مثالیں معلوم ہیں جن سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ اگر مہاجرین کو کام کرنے کا موقعہ دیا جائے تو وہ بہت سمجھ بُوجھ سے کام کرتے ہیں۔ اب تک انہوں نے جو کچھ کیا ہے وُہ سب اپنی ہی سمجھ اور حوصلہ سے کیا ہے۔ ایسے لوگ پاکستان کا صحیح سرمایہ ہیں۔ ایک بڑی امید افزا بات یہ ہے کہ ہر مہاجر کو پاکستان پر پورا یقین ہے۔ اور یہ یقین باوجود ان تکلیفوں کے ہے جو انہوں نے بطور ایک مہاجر کے اٹھائی ہیں۔ یہ لوگ اپنے گھر سے اُجاڑے گئے۔ بڑے جانی اور مالی نقصانات انہوں نے اٹھائے لیکن یہ یقین اپنی جگہ پر اٹل ہے۔ اور یہی یقین ان کی اور ہماری کامیابی کا راز ہے۔

میں تو محنتی مہاجر کو اپنے ملک، اور قوم کا بہترین سرمایہ اور دولت سمجھتا ہوں۔

بے شک محنتی مہاجر پاکستان کا بہترین سرمایہ اور پاکستان کی سب سے بڑی دولت ہیں۔ ایسے ہی باہمت مہاجروں کے متعلق ہمارے وزیرِ اعظم مسٹر لیاقت علی خاں نے مسلم لیگ کونسل کے اجلاس میں فرمایا تھا:۔

"یہی وُہ باہمت لوگ ہیں جنہوں نے پاکستان بنایا ہے۔"

نئی اور پرانی باتیں

۱۰ مارچ ۱۹۴۹ء کو پاکستانی پارلیمنٹ میں مہاجرین کے متعلق ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے آنریبل خواجہ شہاب الدین نے فرمایا کہ ۳۱ جنوری ۱۹۴۹ء تک پاکستان میں ۶۳ لاکھ ۳۰ ہزار ۶۸۸ مہاجرین کو آباد کیا جا چکا ہے۔ اور اب صرف ۴۳ ہزار ۱۶۴ مہاجر کیمپوں میں باقی رہ گئے ہیں۔ اور یہ بھی اس وجہ سے کہ کراچی سے ابھی ۳۵ ہزار مہاجر سندھ کے اندرونی علاقوں میں بھیجنے باقی ہیں۔ دوسرے سندھ میں ربیع کی فصل بونے کے لئے بہت سے مہاجر دیر میں پہنچے تھے۔ اس لئے انہیں اُس وقت زمینوں پر آباد نہیں کیا جا سکا۔ ایک اور سوال کا جواب دیتے ہوئے وزیرِ مہاجرین نے کہا کہ اب تک حکومتِ پاکستان مہاجرین کی آبادکاری پر ۷ کروڑ ۸۳ لاکھ ۴۶ ہزار ۹۹۵ روپے خرچ کر چکی ہے۔ اور یہ صرف اندازہ ہے کیونکہ پورے اخراجات کی تفصیلات ابھی تک موصول نہیں ہوئیں۔

پاکستان ایک زراعتی ملک ہے اور ہمارے ملک میں مہاجرین میں زیادہ تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو یا تو براہِ راست خود کاشت کرتے ہیں یا کسی اور طریقے سے ان کا کاشتکاری اور زراعت سے تعلق ہے۔ ایک کاشت کار کے لئے دُنیا میں اس کی زمین سب سے زیادہ قیمتی چیز ہے مگر مہاجرین نے اپنے ان کھیتوں کو بھی پاکستان کی محبت پر قربان کر دیا جن سے ان کا رشتہ کئی نسلوں سے چلا آتا تھا۔ پروفیسر ڈاکٹر سعید الدین صوالح علمِ زراعت کے ماہر ہمارے مہاجر بھائیوں کو کاشتکاری کے متعلق چند ضروری باتیں بتائیں گے۔

مہاجرین اور زراعت

اس میں کچھ شک نہیں کہ آپ کو اپنے گھر اور پُرانی زمینیں جن پر آپ ہمیشہ کھیتی باڑی کرتے چلے

آپ نے چھوڑنی پڑیں اور پاکستان میں نئی جگہ سکونت اختیار کرنی پڑی۔ اس سلسلہ میں آپ کو ضروری سامان فراہم کرنے میں تکالیف اور پریشانیاں اٹھانی پڑیں۔ لیکن آپ پست ہمّت نہ ہوئے۔ کیونکہ یہ آپ کو معلوم تھا کہ سرکاری حکومت اب آپ کی ہے۔ اور اس کی ہمدردی یقینی طور پر آپ کی طرف ہے حکومت نے بھی ہر طریقہ سے آپ کو بسانے میں اور آپ کی ضروریات کو پورا کرنے میں اس بڑے انقلاب میں کافی مدد کی۔ اب آپ کا فرض ہے کہ پاکستان کو مضبوط بنانے میں آپ اپنے تجربہ سے نئی زمینوں کو سدھاریں اور پیداوار بڑھائیں۔ حقیقت میں پاکستان کی دولت کسان ہی بڑھاتا ہے۔ پاکستان کی زراعت کی ترقی کے معنے پاکستان کے دیہاتیوں کی حالت کا سدھارنا اور بہتر بنانا ہے۔ یہ سب سے مقدم کام ہے یہاں ہماری قریب قریب ساری دولت جمع ہے۔ دنیا میں سائنس والوں نے یہ تسلیم کیا ہے کہ کسان جو ہل سے کام کرتا ہے اس کا سالوں کا تجربہ بھی زراعت کی ترقی کے لیئے بہت مفید ثابت ہوتا ہے۔ اس لئے آپ ہرگز ہرگز اس پیشہ کو نہ چھوڑیں اور اپنی اراضی کو ترک نہ کریں۔ اس میں آپ کا ہی فائدہ ہے۔ پاکستان زراعتی ملک ہے قدرت نے پاکستان کو ایک بڑا حصہ زرخیز زمین کا دیا ہے۔ اچھی اچھی نہروں اور کنوؤں سے آبپاشی کے لئے پانی کا معقول انتظام ہے۔ آپ کو شاید معلوم ہوگا کہ سندھ میں لائڈ بیراج سے جو پانی استعمال ہوتا ہے وہ صرف ۸ فی صدی کام میں آتا ہے باقی کا پانی سب سمندر میں بیکار چلا جاتا ہے۔ اگر ہم صحیح طریقہ سے زمینوں اور پانی سے فائدہ اٹھائیں تو یقیناً ہماری پیداوار کافی بڑھ سکتی ہے اور کھیتی باڑی کرنے والوں کی آمدنی میں بھی کافی اضافہ ہو سکتا ہے۔

اس وقت ہم کو سندیافتہ نوجوانوں کی سخت ضرورت ہے۔ میرا کام گزشتہ سالوں میں یہ تھا کہ نوجوانوں کو زراعت کی تعلیم دے کر تیار کیا جائے تاکہ زراعت میں جو سائنس نے باتیں بتائی ہیں، اس کا فائدہ عام کسانوں تک جلد سے جلد پہنچایا جائے۔ بدقسمتی سے غیر حکومت کے زمانہ میں کچھ عرصہ تک گورنمنٹ کی فارم پہ کام ضرور ہوا جو نتیجہ اور تجربہ حاصل ہوئے وہ عام کسانوں تک نہیں پہنچائے گئے۔ ہماری حکومت اس کمی کو ضرور پورا کرے گی۔

آپ کو جو زمینیں دی گئی ہیں یہ وہ زمین ہے جس پر پہلے سے لوگ کاشت کرتے آئے ہیں۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ زمین زرخیز ہے اور اگر کہیں کہیں ٹکڑے خراب ہوں ان کو بہتر بنایا جا سکتا ہے یہ تو آپ کو اپنے تجربہ سے معلوم ہے کہ مختلف قسم کی زمینوں میں مختلف قسم کے غلے پیدا ہوتے ہیں، اسی طرح مختلف آب و ہوا خاص قسم کی پیداوار کے لئے موزوں یا ناموزوں ہوتی ہے۔

آپ کو یہ دیکھنا ہے کہ آپ کی زمینوں میں لوگ کیا بوتے تھے اور ان کو کیا کیا دقتیں پیش آئیں۔ آپ کا

فائدہ اسی میں ہے کہ ان تمام باتوں کا خیال کریں اور مل جل کر ایک دوسرے کے مشورہ سے پیداوار بڑھائیں۔ میں تو یہ کہوں گا کہ آپ ارد گرد کے کاشتکاروں کے چھوٹے چھوٹے کھیتوں کو ملا کر ایک بڑا کھیت بنائیں اور کئی آدمی مل کر کام کریں۔ ہر کام ہر شخص کے سپرد کیا جائے جس کو وہ اچھی طرح انجام دے سکتا ہے۔ ہر شخص ایک خاص کام کی قابلیت رکھتا ہے۔ ایسے ہی مویشیوں کی کھلائی اور رکھوالی مل جل کر کی جائے۔ اس سے خرچ میں کمی ہوگی۔ میرا مقصد یہ ہے کہ ساجھے کی کھیتی کے اصول پر کام کریں تو آپ کی آمدنی بڑھ سکتی ہے۔

پیداوار بڑھانے کے لئے کئی اور باتوں کا خیال کرنا ضروری ہے۔ سب سے پہلے جو بیج آپ بونے کے لئے حاصل کریں وہ اچھی قسم کا ہو۔ بیج اگر سرکاری محکمہ سے مل سکیں تو اچھا ہے۔ اچھے بیج حاصل کرنے سے ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ پودوں کو بیماریوں سے بچانا پھر غلّہ اچھی قسم کا حاصل کیا جا سکتا ہے۔ بیچنے پر جس کی قیمت زیادہ ملتی ہے۔ پھر پانی دینے کا معقول انتظام۔ پانی کی زیادتی اور کمی سے پودوں پر بہت اثر پڑتا ہے۔

اب سوال کھار کا ہے۔ یہ تو آپ کو معلوم ہے کہ فصل کاٹنے کے بعد زمین سے ایک کھار زیادہ نکل جاتی ہے باقی کھاد محفوظ رہتی ہیں۔ اسی وجہ سے کھار اور چونے کی کمی ہڈی گوبر وغیرہ کی کھاد دے کر کمی کو پورا کیا جاتا ہے۔ ہر فصل میں ایک خاص قسم کی کھار کا خرچ ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے بونے والی فصل کے لئے کھار کی کمی اور کیمیائی کھاد دے کر پوری کی جاتی ہے۔ کھار کی حفاظت کرنے کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ ایک کھیت میں باری باری سے مختلف فصلیں بوئی جائیں۔ اس کو "روٹیشن کراپ" کہتے ہیں۔ دوسرے ملکوں میں صحیح مقدار میں اور ہر فصل کے لئے ایک خاص قسم کی کھاد پھر باری باری سے فصلیں بونے کی وجہ یہ ہے کہ انگلینڈ میں ایک ایکڑ زمین سے سالانہ تین گنا غلّہ ہمارے ہاں سے زیادہ ہوتا ہے۔

ہمارے ملک میں بغیر بیلوں اور گایوں کے کھیتی باڑی کرنا غیر ممکن ہے۔ اچھے مویشی ہونے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ان کو مناسب چارہ ملے۔ آپ کو چاہیئے اپنی زمین کا کچھ حصہ چارہ بونے کے لئے ضرور رکھیں۔ یہ سستا بھی پڑتا ہے اور علاوہ اس کے اچھے مویشیوں کے رکھنے سے کئی ایک فائدے ہیں۔ آپ کو دودھ گھی آپ کے بچّوں کے لئے ملتا ہے پھر آپ کی پیداوار بڑھانے کے لئے گوبر کی کھاد جو سب سے اچھی کھاد سمجھی جاتی ہے آسانی سے مل سکتی ہے۔

کاشت کاری اور آبپاشی کی اہمیّت کی اہمیت کے ساتھ ہماری نئی نسلوں کو تعلیم کی ضرورت کا بھی احساس ہے کیونکہ جب تک کوئی ملک تعلیم کے زیور سے آراستہ نہ ہو۔ زندگی کے دوسرے

مرحلوں میں کامیابی حاصل نہیں کر سکتا۔ مہاجرین جب بے سر و سامانی کی حالت میں پاکستان آئے۔ ان کے لئے مدرسوں اور تعلیم گاہوں کا انتظام کرنا بہت مشکل تھا۔ اس کے باوجود حکومت اور غیر سرکاری ذریعوں سے تعلیمی ضرورت کو پورا کیا گیا۔ اس کا حال ایک ایسے مہاجر کی زبانی سنیئے جو تعلیم اور تعلیم کی اہمیت سے خوب واقف ہیں:۔

مہاجرین اور تعلیم

جن غیر معمولی حالات میں سرکاری مُلازمین دہلی سے کراچی پہنچے۔ ان کا ہم سب کو علم ہے۔ حکومت پاکستان نے دہلی میں صرف سرکاری ملازمین کے زیرِ تعلیم بچوں کے اعداد و شمار لئے تھے اور ان اعداد کے پیشِ نظر ایک افسر کو ان کے لئے ضروری انتظامات کرنے کی غرض سے کراچی بھیج دیا تھا۔ افسر مذکور نے کراچی کے اس وقت کے موجودہ اسکولوں کا جائزہ لیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ آٹھ پرائمری اسکول، دو مڈل اور دو ہائی اسکول کافی ہوں گے۔ چنانچہ انہوں نے اپنی اسکیم مرتب کر کے ان مجوزہ اسکولوں کی داغ بیل ڈال دی لیکن ابھی وہ ابتدائی انتظامات کی تکمیل بھی نہ کر پائے تھے کہ دہلی اور مشرقی پنجاب میں مسلمانوں پر آلام و مصائب کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ اور ان کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔ کہ یا تو وہ درندوں کا شکار بنیں اور یا جس طرح بھی بن پڑے، پاکستان کا رخ کریں۔ اب کیا تھا۔ ہر شخص اسی فکر میں تھا کہ کسی نہ کسی طرح لاہور یا کراچی میں پہنچ جائے۔ چنانچہ اکثر مہاجرین جُوں تُوں کر کے ان مقامات پر پہنچ گئے۔ کراچی آنے والوں میں سے بیشتر لوگ ایسے تھے جو کسی نہ کسی طرح سرکاری ملازمین کے ساتھ وابستہ تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ افسر تعلیمات کے تمام اندازے غلط ہو گئے۔ اسکیم بیکار ہو گئی اور انہیں پھر سے نیا انتظام کرنا پڑا۔

ہر شخص جانتا ہے کہ ایک معمولی گھر کا انتظام کس قدر وقت طلب چیز ہے۔ اور یہاں تو کئی تعلیم گاہوں کا انتظام کرنا تھا لہٰذا خدا پر بھروسا کرتے ہوئے پھر سے ساری اسکیم بنائی گئی۔ جگہ، اسٹاف، سامان اور دیگر ضروریات کی فراہمی ہر کام بجائے خود بہت اہم جگہیں جو ان مدرسوں کے لئے انتخاب کی گئیں۔ ان کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ اسٹاف کا انتخاب بھی، آپ جانتے ہیں، وقت چاہتا ہے۔ سامانِ مدارس کے لئے کراچی کے بازار بالکل بے مصرف ثابت ہوئے اور دیگر ضروریاتِ مدارس، خیر، ان کا تو قطعاً فقدان تھا سب سے بڑا مسئلہ نصابی کتابوں کا تھا۔ ہمارے بچے انگریزی اور حساب کے سوا تمام مضامین اُردو میں پڑھتے چلے آرہے تھے اور یہاں اُردو کی کتابیں عنقا تھیں۔

عمارت کے سلسلے میں بڑی ہمہ گیر دقتوں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ کوئی ایسی عمارت جس کے گرد چار دیواری

ہو یا یوں سمجھ لیجیے کہ مسلمان بچیوں کے مدرسے کے لئے عمارت کمیاب بلکہ نایاب تھی جیکب لائنز میں ایک عمارت کا مدرسے کے لئے انتخاب کیا گیا اور اس کے گرد قناتیں کھڑی کر کے بچیوں کا داخلہ شروع کیا گیا جب وہ عمارت بھی بچیوں کی روزافزوں تعداد کے لئے ناکافی ثابت ہوئی تو مجبوراً صحن میں خیمے لگوائے گئے۔ اسٹاف کا مسئلہ تو اخبارات میں اشتہارات دینے سے حل ہوگیا لیکن سامان یعنی ڈیسکوں وغیرہ کا مسئلہ بہت پریشان کن تھا۔ عربی کا ایک مقولہ ہے مَنْ جَدَّ وَجَدَ چنانچہ دن رات کی دوڑ دھوپ نے اس مسئلے کو بھی حل کر دیا۔ اور ملٹری سے کچھ سامان میسر آگیا۔ اللہ بھلا کرے ملٹری والوں کا کہ جنہوں نے اس آڑے وقت میں اپنے مہاجر بھائیوں کے بچوں کی اس اہم ضرورت کو پورا کر دیا۔

ہماری خوش قسمتی سے اسکولوں کے لئے اسٹاف بھی اچھا ہاتھ آگیا۔ نصابی کتابوں کا مسئلہ درپیش ہوا۔ تو اساتذہ نے حکومت کو یقین دلایا کہ سردست کتابوں کے بغیر کام چلالیں گے۔ چنانچہ اُن لوگوں نے کچھ کتابیں فراہم کیں۔ ہر استاد اپنے مضمون کی مختلف کتابوں کا مطالعہ کر کے نوٹ تیار کر لاتا اور ان نوٹوں کی مدد سے جماعت کو پڑھاتا۔ یہ سلسلہ بہت دنوں تک چلتا رہا۔

اس دوران میں طلبہ اور طالبات کی تعداد بڑھتی چلی گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت کو مزید پرائمری، مڈل اور ہائی اسکول کھولنے پڑے۔

خدا کا شکر ہے کہ لاہور اور مغربی پنجاب کے دوسرے شہروں میں مہاجرین کے بچوں کو اس قسم کی کچھ زیادہ دشواریاں پیش نہیں آئیں۔ ایک تو بنے بنائے اسکول مل گئے۔ سامان لگا لگایا مل گیا۔ اسٹاف کے مسئلے میں کوئی زیادہ دقت نہ تھی۔ کتابیں بھی آسانی سے فراہم ہوگئیں۔ پھر حکومت اور یونیورسٹی نے بھی ان بچوں کا خیر مقدم کیا۔ ان کے لئے وظائف کا انتظام کرنے کے علاوہ اور ہر طرح کی آسانیاں بہم پہنچائیں۔

اب میں ان کوششوں کا ذکر کروں گا جو اس ضمن میں انفرادی طور پر عمل میں آئیں۔

مہاجرین میں سے بعض مخیر لوگوں نے کراچی اور مغربی پنجاب کے شہروں اور قصبوں میں نجی مدارس قائم کئے انہیں بھی انہی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا جن کا ذکر میں سرکاری مدارس کے ضمن میں کر آیا ہوں لیکن چونکہ ان لوگوں کی نگاہ اپنی قوم کے مستقبل پر تھی اس لئے انہوں نے شب و روز کی محنت سے ان مشکلات پر بہت حد تک قابو پالیا۔ مختلف کیمپوں کے مہاجرین نے بھی اس اہم ضرورت کو محسوس کیا اور اپنی کوششوں سے کیمپوں کے اندر ابتدائی مدارس قائم کئے۔

مدارس اور اسکول قائم ہوئے تو پڑھنے والوں کو کتابوں کی ضرورت محسوس ہوئی۔ کتابیں دو طرح

مل سکتی ہیں۔ یا تو نئی کتابیں چھاپی جائیں یا پرانی کتابیں بازار میں بکنے کے لئے آئیں۔ پرانی کتابوں کا کاروبار غالباً دنیا میں اس وقت سے رائج ہے جب سے حضرتِ انسان کو پڑھنے لکھنے کی تمیز آئی دنیا کے ہر ایک بڑے شہر میں پرانی کتابوں کے نایاب ذخیرے بکنے کے لئے آتے ہیں۔ اور قدردان انہیں ہاتھوں ہاتھ شوق سے خریدتے ہیں۔ پیرس ہو یا لندن۔ بغداد ہو یا قاہرہ۔ ہر جگہ جامع مسجد کی سیڑھیوں جیسی رونق کے بازار پرانی کتابوں کی نایاب جنس بیچتے ہیں۔ الیاس مجیبی صاحب جب تک دلی زندہ تھی۔ ہر روز شام کو جامع مسجد کی سیڑھیوں پر ان جواہرات کی تلاش میں نکلتے تھے۔ اب کراچی آباد ہوئی تو انہیں سر چھپانے کے لئے مکان یا کسی کاروبار کی تلاش نہیں ہوئی۔ بلکہ یہاں بھی ان کی آنکھوں نے جامع مسجد کی سیڑھیاں ڈھونڈھ نکالیں۔ کس طرح؟ یہ خود انہی کی زبانی سنیئے:۔

مہاجرین اور پرانی کتابیں

دلّی سا شہر کہ "عالم میں انتخاب" جی ہاں وہی میر تقی میر کی دلی کہ "رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے" شاہجہان سے فن کار، غریب نواز شہر یار کے بسائے ہوئے دیار میں کیا نہیں تھا۔ اس کی رنگا رنگی، بوقلمونی کا بھلا کیا ٹھکانہ ؎

چپّے چپّے پہ ہیں یاں گوہرِ یکتا تہِ خاک

دفن ہوگا نہ کہیں اتنا خزانا ہرگز

دلّی کی تاریخی، روایتی عظمتوں اور ان کی پامالیوں کی داستان خاصی طویل، بڑی پیاری اور ساتھ ہی بہت دردناک بھی ہے۔ مگر صاحبو! جو ہونا تھا ہو گیا۔ گئے گزرے پہ رونے رلانے کی جگہ زندہ قوموں کا شیوہ یہ رہا ہے۔ اب مہاجرین پہ کام ہی کی باتیں سوچنی اور کرنی لازم آتا ہے۔ یوں تو دیئے سے دیا جلتا ہے۔ سرکاری سہارے ملنے بھی ضروری ہیں لیکن ملک کی حقیقی تعمیر زیادہ ملکیوں ہی کے بل بوتے پر ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں بات چھڑتی ہے تو ادبدا کر دلی کی بات زبان پر آہی جاتی ہے جو فائدے سے خالی نہیں۔ کراچی کی آبادکاری میں دلّی کی روایات سے بڑی مدد مل سکتی ہے۔ اور صاحب مہاجرین کے کرنے کو بہتیرے کام ہیں۔ ایک کام پرانی کتابوں کا ہے۔

بڑے اور پرانے شہروں کی یہ ریت ہے کہ وہاں کباڑی کاروبار بھی ہوتا ہے۔ دہلی اور لکھنؤ کے کباڑ خانے خاص کر مشہور ہیں۔ جہاں دور دور سے نوادرات میل کچیل میں اَٹے ہوئے آتے اور کوڑیوں کے مول بکتے رہے۔ لکھنؤ میں نخاس اور دلّی میں جامع مسجد کی سیڑھیوں کے آس پاس بڑے بڑے ذخیرے اور پرانے پرانے

ٹھیے رہتے ہیں۔

کباڑ خانوں میں لین دین کی حیثیت فن کی ہے، کباڑیوں کا تو یہ دھندا ہی ٹھہرا صبح سے شام تک بھانت بھانت کی چڑیا کو بھانپنا، مگر کباڑ خانوں کے گاہک بھی چھپے رستم ہوتے ہیں۔ چیز کوئی اور ہی لینی ہو مگر بھاؤ تاؤ کسی اور کا ہو رہا ہے۔ ساتھ ہی غلط انداز نگاہیں مطلوبہ چیز پر بھی لگی ہیں کہ ایسا نہ ہو کوئی اور سور ما مار لے جائے پھر چلتے چلتے گویا ضمنی طور پر اسے بھی اٹھا لیا اور بے غرضی کے تیوروں سے بولے۔ اچھا بولو یہ کتنے کو دیتے ہو، وغیرہ

دلی میں جامع مسجد کے کباڑیوں میں چکّر لگانے کی بیماری مجھ کو بھی رہی عجیب عجیب چیزیں دیکھنے میں آئیں۔ چیزیں ہی نہیں بعض مستری اور یہاں متی قسم کے بزرگ بھی دکھائی دیئے جو خود عجائب گھر میں رکھنے کے لائق تھے۔ کچھ ایسے بھی جو مُردوں کا دل تاکتے پھرتے ہیں، بھلے مانسوں پر یہ بات زیب نہیں دیتی۔ چیز اپنے ڈھب کی ہو اور مناسب داموں پر ملے تو کائیاں پن ٹھیک۔ ہاں مگر کباڑ خانوں میں صاحب لوگوں کی سی شاپنگ بھی بھتی ہے۔ نہ بن پڑتی ہے اور نہ ڈھنگ کی چیز ہی ملتی ہے۔ گدڑی کے لال گدڑی ہی میں گھس کر ملتے ہیں

کئی بار بڑی نادر چیزیں، تصویریں اور کتابیں ہاتھ لگیں — ایک بار ایک پھٹی پرانی کتاب میں دبا دبایا کسی کے دیوان کا ایک قلمی دو ورقہ ملا مُطلا، مذہب اور خوش نویسی کا بہترین نمونہ۔ ایشیاٹک سوسائٹی کی کتاب "تذکرۂ خوشنویساں" کے مطالعہ سے پتہ چلا۔ کاتب اکبرِ اعظم کا درباری خوش نویس تھا۔ اسی طرح اور کئی چیزیں اور کتابیں ملیں۔

مطلب یہ کہ پرانی کتابوں کا کام خاصا دلچسپ ہے اور نفع بخش بھی، پچھلے بھیانک بھونچال میں کتابوں کے اچھے اچھے اور قیمتی ذخیرے تباہ و تلف ہوئے یا بہتیرے مہاجرین اپنی کتابیں ساتھ نہ لا سکے۔ اب ضرورت کے وقت مشکل پیش آتی ہے اور ان کتابوں کی یاد ستاتی ہے۔ اگر پرانی کتابوں کا کام سلیقے سے کیا جائے تو یہاں بھی بہتوں کا بھلا ہی دکھائی دیتا ہے۔ کام کرنے والوں کو یقین رکھنا چاہیئے۔ گاہکوں کی کمی نہیں۔ خدا چاہے بہتات ہی ملے گی۔

کل کراچی میں مہاجرین سے متعلق ایک نہایت دلچسپ نمائش کا افتتاح ہوگا۔ اس نمائش میں جوتا بنانے والے کاریگر مہاجر اپنے ہنر اور کمال کا مظاہرہ دکھائیں گے بیسویں صدی میں ہر چیز مشینوں اور کلوں سے بنائی جاتی ہے لیکن ہمارے کاریگر اپنے کمال سے ثابت کر دیں گے کہ پاکستانی صناع ایک گھنٹے میں ایک جوتا کیسے تیار کر سکتے ہیں۔ اس دلچسپ نمائش کا حال آپ

انجمن جفت سازی پاکستان کے صدر ڈاکٹر اظہر علی خاں سے سُنیئے :-

مہاجرین اور جفت سازی

جُوتا لباس کا ایک ضروری حصّہ ہے اور تقریباً آپ سب لوگ اپنی اپنی پسند کا جوتا ضرور استعمال کرتے ہوں گے۔ آج کل جو جُوتا بھی نہیں پہن سکتے وہ آپ کے کچھ مہاجرین بھائی ہیں جن کے لئے کہا جا سکتا ہے کہ نہ سر پر ٹوپی نہ پیر میں جوتا۔ علاوہ خوبصورتی کے جس کا تعلق زیبائش سے ہے۔ جوتے میں ایک یہ بھی خصوصیت ہونی چاہیئے کہ وہ صحیح ناپ کا ہو اور آرام دِہ ہو۔ آپ میں اکثر لوگ ایسے ہوں گے جو نیا جوتا پہن کر کئی کئی روز لنگڑاتے رہے ہوں گے۔ ٹوپی، قمیص، کوٹ پتلون کے بنسبت استعمال کی سب سے زیادہ مار بھی جوتے پڑتی ہے۔ اس لئے جوتے کا مضبوط ہونا بھی ضروری ہے۔ اور بھی بہت سی خصوصیات ہیں۔ جن کی بنا پر صنعتِ جفت سازی بہت اہم اور مشکل صنعت ہے اور اس کے صنّاع بڑی کاوش اور ریاضت سے پیدا ہوتے ہیں۔ اس اہمیت کے باوجود آپ میں سے بہت کم لوگ ایسے ہوں گے جن کو یہ علم ہو کہ ہندوستان میں مروّجہ وضع کا جوتا کہاں اور کب بننا شروع ہوا۔ اب یہ کس طرح بنتا ہے۔ یہ صنعت کن لوگوں کے ہاتھ میں تھی۔ کتنے لوگ اس میں حصّہ لے رہے تھے اور پاکستان میں آج اس صنعت کی کیا حالت ہے۔ اور اس کا کیا مستقبل ہے وغیرہ وغیرہ میں مختصراً آپ کے سامنے اس کی روئداد پیش کرتا ہوں۔

مروّجہ وضع کے جوتے کی صنعت کی ابتدا آج سے تقریباً پچاس برس قبل آگرہ میں ہوئی۔ بہت چھوٹے پیمانے سے شروع ہو کر اس درجہ پر پہنچی کہ تقسیمِ ہند سے قبل صرف آگرہ اور گردو نواح میں روزانہ دس لاکھ روزانہ کا کاروبار تھا۔ چونکہ اس میں زیادہ تر گائے کی کھال کا چمڑا استعمال ہوتا تھا۔ اس لئے یہ صنعت اور اس کے متعلق کاروبار تقریباً ۹۵ فی صدی مسلمانوں کے ہاتھ میں تھا۔ صرف آگرہ میں تیس ہزار آدمی اس کاروبار سے منسلک تھے اور آگرہ ایشیا میں جفت سازی کا سب سے بڑا مرکز شمار کیا جاتا تھا۔ علاوہ آگرہ کے کان پور، دہلی بمبئی میں بھی یہ کاروبار مسلمانوں کا مخصوص حصہ رہا۔ تقسیمِ ہند کے بعد وہ شیرازہ درہم برہم ہو گیا اور آگرہ کے فسادات کے بعد تو تقریباً تمام کارخانہ دار اور ماہرینِ فن کاریگران ہجرت کر کے پاکستان آ گئے۔ اس وقت انجمن جفت سازان پاکستان کے اعداد و شمار کے مطابق تقریباً ۵۰۰۰ کاریگر پاکستان پہنچ چکے ہیں جو دو لاکھ ساٹھ ہزار ہر قسم کے جوتے تیار کر سکتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اس گھریلو صنعت کو ہندوستان میں اسی عروج پر پہنچایا تھا کہ بڑی بڑی مشینوں سے کام کرنے والی فیکٹریوں کے مقابلہ میں اچھا اور سستا جوتا بناتے اور سپلائی کرتے تھے۔ اس کثیر تعداد میں سے صرف دو ہزار کاریگر یہاں کام حاصل کر چکے ہیں اور باقی مہاجرین

کو سر چھپانے کی بھی جگہ میسر نہ ہوئی ہے اور وہ لوگ جو کام کر بھی رہے ہیں۔ انتہائی کس مپرسی کی حالت میں گولی مار قائدآباد اور اسی قسم کے مقامات پر کچی جھونپڑیوں میں پڑے ہوئے ہیں۔ اکثر لوگوں نے بوجہ مجبوری اپنی معاش کے اور اور ذرائع تلاش کر لئے ہیں۔ اس طرح اس فن کا اچھا خاصا ماہر طبقہ پاکستان میں اس صنعت کی خدمت سے محروم ہو گیا ہے۔

حکومت کی گوناگوں ذمہ داریوں اور دشواریوں کو محسوس کرتے ہوئے ان مہاجرین نے اب تک حکومت سے کوئی مطالبہ نہیں کیا۔ اور کوشش یہی کی اور کر رہے ہیں کہ خود اپنے پاؤں پر کھڑے ہوں اور اس اہم صنعت کو از سرِ نو پاکستان میں اسی پیمانہ پر قائم کریں جس طرح یہ ہندوستان میں تھی۔ مگر اس صنعتی تعمیر میں آپ سب کے تعاون کی ضرورت ہے۔ ہم کیا کر رہے ہے، کیا کرنا چاہتے ہیں۔ اور اگر ہمیں آپ کی اور حکومت کی امداد اور ہمدردی حاصل ہو تو ہم کیا کر سکتے ہیں۔ اس پر مزید روشنی ڈالنے کے لئے اور اس کا مظاہرہ کرنے کے لئے ہم نے ایک خاص پروگرام مرتب کیا ہے جو سب حضرات کے روبرو پیش کیا جائے گا۔ اس جلسہ میں پاکستان کے بنے ہوئے انواع و اقسام کے جوتوں کی نمائش ہوگی۔ اس میں تقریباً ڈیڑھ سو جوتے ہوں گے آپ دیکھیں گے کہ آپ کے مہاجر بھائی اس صنعت پر کس درجہ عبور رکھتے ہیں اور آپ کو یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ پاکستان میں دنیا میں بہتر سے بہتر جوتے سے بھی اچھا جوتا بن سکتا ہے اور بن رہا ہے۔ اس کے علاوہ ایک گھنٹہ میں شروع سے اخیر تک ایک جوتا تیار کر کے دکھایا جائے گا۔ صنعت جفت سازی سے متعلق حضرات اس صنعت کے مختلف موضوعوں پر تقریریں کریں گے اور آپ کی خدمت میں اپنی موجودہ دشواریوں اور ضروریات کو پیش کریں گے۔

پاکستان کے صناع اور کاریگر، پاکستان کے کاشتکار، پاکستان کے تاجر اور پاکستان کے طالبعلم یہ سب ہمارے ملک کی دولت ہیں جن کی حفاظت اور دیکھ بھال ہم سب کا فرض ہے تاکہ پاکستان کی خوشحالی اور فارغ البالی میں اضافہ ہو۔

خوشگوار خواب

(۱۷ مارچ سنہ ۴۹ء)

پچھلے ہفتے پاکستان اور ہندوستان کی حکومتوں کے افسروں کے درمیان نئی دہلی میں ایک اور کانفرنس ہوئی جس میں جائدادوں کے تبادلے اور خرید و فروخت کے متعلق چند اور باتوں کا فیصلہ ہو گیا۔ ان میں سے چند ضروری فیصلے یہ ہیں:۔

۱۔ وہ لوگ جو جائدادیں فروخت کرنے کے لئے ہندوستان یا پاکستان آنا جانا چاہتے ہیں انہیں دونوں حکومتوں کی طرف سے پرمٹ اور زیادہ آسانی سے مل سکیں گے۔

۲۔ امرتسر سے لاہور تک اور لاہور سے جالندھر تک آنے جانے کے لئے دونوں ڈپٹی ہائی کمشنر بسوں کا انتظام کریں گے۔

۳۔ جائدادوں کے تبادلے یا فروخت سے پہلے ہر شخص کو کسٹوڈین کے سامنے یہ ثبوت پیش کرنا ہوگا کہ اس کی جائداد کے خلاف کوئی ڈگری یا قرضہ تو نہیں۔ اس کے بعد یہ شخص جائداد کے تبادلے یا فروخت کے متعلق بات چیت کرے گا، اور رجسٹری کرانے سے پہلے اس کی اطلاع کسٹوڈین کو دے گا۔ پھر کسٹوڈین اسے رجسٹری کی اجازت دے گا۔

۴۔ فیصلہ ہوا ہے پاکستان میں اگر ضرورت ہو تو تمام جائدادوں کی رجسٹری لاہور اور کراچی میں ہو سکے گی۔ اور ہندوستان میں تمام جائدادوں کی رجسٹری دہلی اور جالندھر میں۔ تبادلے کی صورت میں اگر کسی جائداد کی رجسٹری ایک ملک میں ہو گئی تو دوسرے ملک میں مالکوں کی حاضری کے بغیر اس کی رجسٹری ہو جائیگی۔

۵۔ ہندوستانی اسٹامپ کے کاغذ کراچی اور لاہور کے ہائی کمشنر اور ڈپٹی ہائی کمشنر کے دفتر میں مل سکیں گے۔

۶۔ اگر کسی دیوانی مقدمہ کے مدعی اور مدعا علیہ دونوں ایک ملک چھوڑ کر دوسرے ملک میں چلے گئے ہیں

تو یہ متدمان کے ساتھ ہی دوسرے ملک میں منتقل ہو جائے گا۔ سوائے اس صورت میں جب کہ مقدمے کا تعلق کسی جائداد سے ہو۔

اس کے علاوہ چند اور باتوں کا بھی فیصلہ ہوا ہے جن کا اعلان اخبارات میں کیا جا چکا ہے۔

جائدادوں کی خرید و فروخت کے ساتھ ساتھ تمام پاکستان اور خصوصاً کراچی میں اس وقت نئے مکانات اور نئی بستیاں بسانے کے سوال پر پاکستان بہت سنجیدگی سے غور کر رہا ہے۔ کیونکہ ہماری بڑھتی ہوئی آبادی کے لئے موجودہ شہر کراچی کے مکانات کافی نہیں لیکن نئے مکانات بنانے سے پہلے ضروری ہے کہ مکانات اور بستیوں کا خاکہ پہلے طیار کر لیا جائے۔ تاکہ نئی عمارتیں شہر کے خوبصورت چہرہ پر بدنما داغ نہ بن جائیں۔ اس ضروری مسئلے کے متعلق صدیقی ماہرِ تعمیرات کے خیالات قابلِ غور ہیں

نئے مکانات اور مہاجرین

جہاں موقعہ پایا وہاں قبضہ جمایا۔ اور مکان کھڑا کر دیا۔ یہ روش انفرادی حیثیت سے بھی پُرخطر ہے۔ جماعتی اعتبار سے بھی نامناسب بلکہ مضر ہے۔ مثلاً کسی جگہ پر قبضہ جما کر مکان بنا ڈالا۔ یا دوکان کھڑی کر لی۔ اس پر حسبِ حیثیت دام لگائے۔ انہیں خبر نہیں سرکاری منصوبوں میں وہ جگہ کسی اور ہی مقصد کے لئے مخصوص ہے۔ بس تو دیر سویر وہ بنا بنایا مکان یا دوکان زد میں آ سکتے ہیں۔ اور چونکہ جماعت کا مفاد فرد کے مفاد سے مقدم ہوتا ہے۔ اس لئے اس ناگہانی یا خلافِ توقع نقصان کی تلافی کا بھی کوئی امکان نہیں۔

کراچی کی نئی آبادکاری اور مہاجرین کی بستیاں بسانے میں سب سے پہلے خاکہ طیار کرنا لازمی ہے۔ ضرورت ہے کہ جلد سے جلد سرکاری اور غیر سرکاری ماہرین کا بورڈ سر جوڑ کر بیٹھے۔ دیانت۔ ذہانت یعنی بے لاگ بن کر سوجھ بوجھ سے کام لے۔ پہلے کراچی کے مختلف اور مناسب مقامات کا انتخاب کرے۔ پھر بستی کی پلاننگ کے اصول سامنے رکھے جائیں۔ گلیوں اور راستوں کی نشان دہی اور حفظانِ صحت کا انتظام مکمل ہو۔ کام چلانے کو آب رسانی میں بورنگ سے بھی مدد مل سکتی ہے۔ بورنگ میں پانی کھاری ہی نکلے۔ پھر بھی اور ضروریات میں کام دے سکے گا۔

مختلف طبقوں اور حیثیتوں کے باشندوں کی آبادکاری کی رعایت بھی رکھنی ضروری ہے۔ بے میل آبادی کسی کے حق میں بھی مفید نہیں۔ بلکہ ملے جلے طبقوں کی ملی جلی آبادی سے طرح طرح کی سماجی خرابیاں پڑتی ہیں۔ آئے دن قسم قسم کی مشکلیں اور الجھنیں پیش آتی ہیں۔ ان باتوں کا تجربہ ہنگامی مجبوریوں کے بسبب سرکاری کوارٹروں کی غیر امتیازی تقسیم کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ یہ ایسی خرابی ہے کہ مُضر سے مُضر نتائج پیدا ہونے کا امکان اور خطرہ ہے۔ اس سے سماجی پیچیدگیاں بڑھنے کے ساتھ ہماری نئی پود یعنی بچوں کی اچھی تربیت میں بھی رکاوٹیں اور خرابیاں

پیدا ہوں گی۔

اس میں شک نہیں غریب آدمی تو سر چھپانے بھر کو ایک جھونپڑے پر ہی قناعت کر لیتا ہے۔ پھر بھی سگھڑاپا، سلیقہ امیروں ہی کی میراث و جاگیر تو نہیں ؎

قیس ہو کوہ کن ہو یا حالی　　عاشقی کچھ کسی کی ذات نہیں

سلیقے کی ایک جھونپڑی میں وہ مزا ہے جو بے تکے اور گندے محل میں کہاں دیکھا جاسکتا ہے۔ جگہ جگہ کیبنیں لگی ہیں۔ مگر افسوس ہر کیبن ہر دوکان کی وضع قطع الگ ہی ملے گی۔ چند کو چھوڑ کر صفائی، ستھرائی، سلیقہ ندارد۔

کھانے پینے کی دوکانوں میں سب سے زیادہ گندگی پائی جاتی ہے۔ حالانکہ سب سے زیادہ انہی میں صفائی ستھرائی کی ضرورت ہے۔ اس قسم کے جھونپڑا ہوٹلوں کی آمدنی خاصی ہوتی ہے۔ مگر یہ لوگ سمجھتے ہیں کام چل ہی رہا ہے صفائی وغیرہ پر دام نہیں لگاتے۔ یہ خود ان کے حق میں مضر ہے۔ تھوڑی سی توجہ اور سلیقہ برتنے سے ان کی آمدنی بھی بڑھ سکتی ہے۔ یہی رنگ غریبوں کے چھوٹے چھوٹے کچے مکانوں کا دیکھا جارہا ہے۔ کہ جس نے جہاں دیکھا اُلٹی سیدھی دیواریں کھڑی کرلیں۔ راستہ کی رعایت نہ ہوا کے نکاس کا لحاظ، نہ گندے پانی کا راستہ۔ ان تمام باتوں سے قوم کا ذہنی انتشار جھلکتا ہے۔ اور یہ ثابت ہوتا ہے کہ لوگ مل جُل کر اور صلاح مشورہ یا جماعتی یک جہتی سے کوئی کام نہیں کرسکتے۔ حالانکہ جماعتی یک جہتی ہی وُہ دولت ہے جس کی برکت سے پاکستان کا خیال ناقابلِ انکار حقیقت بن کر سب کے سامنے ہے۔ مہاجرین میں وہ لوگ بھی ہیں جو ذاتی مکانوں کی تعمیر پر حسب حیثیت روپیہ لگا سکتے ہیں۔ ان میں سے بہتوں نے تو کرایے کے مکانات حاصل کرنے میں ہزاروں، لاکھوں بہائے ہیں۔ یہ لوگ مکانوں کی تعمیر میں ایسی بنیادی غلطیاں کرتے ہیں۔ جن پر آگے چل کر وُہ بھی پچھتائیں گے۔ اور ان کی اولاد بھی افسوس کرے گی۔ نئے مکان اور خاص کر مہاجرین کو نئی بستیوں کی تعمیر میں کن باتوں کا لحاظ رکھنا ضروری ہے اجمالی طور پر ہی بتایا جاسکتا ہے۔ تفصیل کے لئے اس فن کے ماہروں سے رجوع کرنا یا ان کی مدد حاصل کرنا ہوگا۔

کراچی میں پہلے سے یہ چلن ہے کہ مکان ہوا کا رُخ دیکھ کر بناتے ہیں۔ بے شک یہ ضروری ہے مگر افسوس کہ پڑوسیوں کا خیال نہیں رکھتے۔ مثلاً اپنے مکان کے کمرے تو صاف ستھرے ہوا کے رُخ پر ہوتے ہیں۔ باورچی خانہ یا کیاریوں کے لئے کھاد یا کوڑا کرکٹ ڈالنے کو ایسی جگہ کا انتخاب کیا جاتا ہے جو پڑوس کے مکان کا فرنٹ ہوتا ہے یا نشست نشین۔ اس سے پڑوسیوں کو تکلیف ہوتی ہے۔ ہوا کے ساتھ بدبو کی لپٹیں بے روک ٹوک چلی آتی ہیں، یا باورچی خانہ کا دھواں بھر بھر آتا ہے۔ اور بھلے مانسوں کا بیٹھنا دشوار ہوتا ہے۔ یہ اس قسم کی اُلجھنیں ہیں کہ جماعتی یک جہتی ہی سے حل ہوسکتی ہیں۔ اس لئے ضرورت ہے کہ جو بھی نئی بستی بسائی ہو اس کی ایک باضابطہ انجمن

بنائی جائے اور انجمن کے ارکان دیانت برتیں کراچی کی نئی آبادکاری کا کام بیشک ہے بہت ضروری اور فوری توجہ کا محتاج کہ جب تک رہنے سہنے ہی کا ٹھکانہ نہ ہو تو دوسرے کام بھلا کیونکر ہو سکتے ہیں۔ مگر یہ بھی نہ بھولنا چاہیئے کہ اس مہم کے سر کرنے میں مہاجرین اور گورنمنٹ دونوں کو قسم قسم کی مشکلات اور پیچیدگیوں کا سامنا ہے۔ یاد رہے :-

ع بستی بسانا کھیل نہیں۔ بستے بستے بستی ہے

نئے مکانات۔ گھر اور بستیاں بس جائیں تب بھی انسان کی زندگی صرف گارے اور چونے کے مکانات کی تنگ حدود میں نہیں رہ سکتی۔ ہماری رُوحانی غذا کے لئے ہر شہر اور ہر بستی میں کتب خانے اور ریڈنگ روم کی ضرورت ہے۔ اس ضرورت سے کیسے انکار ہو سکتا ہے۔ ابوالحسن صاحب سیف شادانی نے کراچی میں آکر سب سے پہلے اس ضرورت کا احساس یُوں کیا :-

پاکستان میں دارالمطالعے کی اہمیت

میں مہاجر ہوں اور چند مہینے ہوئے کراچی آیا ہوں۔ مجھے یہاں کسی چیز کی تکلیف نہیں۔ سوائے اس کے کہ پڑھنے کے لئے مجھے اچھی کتابیں نہیں ملتیں۔ اور نہ کوئی ایسا ریڈنگ رُوم مجھے معلوم ہے کہ جہاں مختلف اخبارات کا مطالعہ کر سکوں۔ حکومتِ پاکستان نے اپنی مختصر سی زندگی میں تنظیم و اصلاح کا پروگرام قائم کیا ہے۔ اور خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ آج ہمارا ملک بحالت مجموعی ثقافت و تہذیب میں کسی دوسرے ایشیائی ملک سے پیچھے نہیں۔

ثقافت اور تہذیب قومی کردار پر منحصر ہے۔ اور قومی کردار کی تعمیر دو چیزوں سے ہوتی ہے۔ ایک تعلیم دوسری تربیت گاہیں اور دارالمطالعہ۔ تعلیم کی طرف ہماری حکومت توجہ کر چکی ہے اور نصاب کی حسب ضرورت ترمیم عمل میں لانے کے لئے قدم اٹھایا جا چکا ہے۔ انشاءاللہ بہت جلد اس میدان میں بھی موثر اصلاح ہو جائے گی۔ صدیوں کی غلامی کے بعد جو ذہنیت تشکیل پا چکی ہے۔ وہ مٹتے مٹتے مٹے گی۔ دارالمطالعہ اور کتب خانے پچھلی ذہنیت کی اصلاح میں بہت زیادہ مُمد و معاون ہو سکتے ہیں۔ اس لئے ان کی افادیت پر زیادہ زور دینا تحصیلِ حاصل ہوگا۔

اربابِ ذوق اور وسیع النظر حضرات اس سے خوب واقف ہیں تعلیم گاہوں میں درسی کتابوں سے نوخیز دماغوں کو علم کی روشنی حاصل ہوتی ہے۔ دارالمطالعوں میں وُسعت اور نقطۂ نظر میں پھیلاؤ اور دماغ کی تربیت اور نشوونما بھی ہوتی ہے۔ یہ بھی تعلیم کا ضروری جزو ہے۔ بات یہ ہے کہ دنیا روز افزوں ترقی کر رہی ہے اور مقررہ نصاب کے دائرے میں اتنی وسعت کہاں ہو سکتی ہے کہ تازہ بہ تازہ۔ اور جدید ترین تحقیقات اور معلومات کا فوراً اضافہ ہوتا رہے۔ البتہ دارالمطالعہ سے نت نئی معلومات میں اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ ہر شخص اس بات پر قادر

نہیں ہوتا کہ مختلف اخبارات اور رسائل یا مختلف موضوعات پر کتابیں خرید سکے۔ اس مجبوری کا حل دارالمطالعہ ہی ہوسکتا ہے۔

مہاجرین کے لئے خصوصاً اس قسم کے کتب خانوں کی بے حد ضرورت ہے کیونکہ ہم اپنا سرمایہ لٹا کر یہاں آئے ہیں۔ مجھے یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ کراچی میں بہت عمدہ پیمانے پر ایک ادبی کتب خانہ اور ریڈنگ رُوم قائم کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہو گی کہ یہاں ایران، مصر، افغانستان، عراق اور دوسرے اسلامی ممالک کی جدید مطبوعات مہیا ہوں گی۔ ان ممالک کے ادبی اور تجارتی رسالے ایک جگہ جمع ہوں گے۔ اس طرح ہم اپنے ہمسایہ ملکوں سے ثقافتی تعلقات قائم رکھ سکیں گے۔ اور ان رسالوں کے ذریعہ ہم تک تجارتی معلومات بھی آسانی سے پہنچ جائے گی۔ اس قسم کے کتب خانے اور ریڈنگ رُوم ہمیں دوسرے شہروں میں بھی قائم کرنے پڑیں گے۔

ہماری زندگی کی رونق اور چہل پہل کا دار و مدار بچوں کی خوشی اور مسرت پر ہے۔ مہاجر بچوں کی خوشی پاکستان کی خوشی ہے۔ ان کی صحت اور تندرستی پاکستان کی آئندہ نسلوں کی صحت اور تندرستی کی ضمانت ہے۔ کراچی کے ایک کیمپ میں مہاجر بچوں کو حال میں انعامات تقسیم کئے گئے تھے۔ اس دلچسپ تقریب کا حال عبدالواحد صاحب سندھی سے سُنیئے:۔

مہاجر بچوں کو تقسیمِ انعامات

تحفے یا انعام کی چیز خواہ کتنی ہی کم قیمت ہو وصول کرنے والے کی نگاہ میں اس کی بڑی قدر و منزلت ہوتی ہے۔ اس کی خوشی کا صحیح اندازہ لگانا مشکل ہوتا ہے۔ اِس ضمن میں امیر، غریب، عورت، مرد اور بچے، بوڑھے سب برابر ہوتے ہیں۔

جب میں نے سنا کہ کلیٹن روڈ کالونی کے آخری سرے پر قائم کئے ہوئے حاجی کیمپ نمبر ۲ میں مہاجرین کے بچوں کو تحفے اور انعامات تقسیم کئے جائیں گے تو میں مسٹر آفتاب احمد فوٹو گرافر کو ساتھ لے کر وہاں پہنچ گیا۔ کسی نیک دل اور فیاض خاتون نے اپنا نام ظاہر کئے بغیر مہاجرین کے لئے ایک معقول رقم پیش کی تھی۔ اسی رقم میں سے دوسو روپیہ کے کھلونے اور عام ضرورت کی مفید چیزیں خریدی گئی تھیں۔ کیمپ میں کام کرنے والی چند رضا کار خواتین نے اس کا انتظام کیا تھا۔ چیزیں خریدنے میں اس بات کا خاص خیال رکھا تھا کہ وہ تعداد میں بہت زیادہ ہوں تاکہ کیمپ کا کوئی چھوٹا یا بچہ ان سے محروم رہنے نہ پائے۔ چنانچہ سب چیزوں کو باہر نکال کر سجایا گیا تو بڑی بڑی تین میزیں پوری طرح بھر گئیں۔ ان پر تل دھرنے کی جگہ باقی نہ رہی۔ کھلونوں میں کئی

قسم کی سیٹیاں۔ ڈگڈگیاں۔ گاڑیاں۔ باجے۔ گیند بلّے۔ گڈّے۔ گڑیاں۔ غبارے اور مفید چیزوں میں تیل کی شیشیاں صابون کی ٹکیاں۔ کنگھے کنگھیاں۔ گلے کے ہار۔ بُندے۔ چوڑیاں۔ چھلے۔ ازار بند اور نہ جانے کیا کیا کچھ شامل تھا چونکہ یہ انتظام عورتوں کے ہاتھ میں تھا۔ اس لئے بہت سلیقے کے ساتھ بچوں کی دلی خواہشات اور وقتی ضروریات کا لحاظ رکھا گیا تھا۔ معلوم ہوا کہ انہی رضا کار خواتین نے تین چار روز پہلے سارے کیمپ میں گھوم پھر کر بچوں اور بچیوں میں کاغذ کی پرچیاں تقسیم کر دی تھیں جن پر ان کے نام کے علاوہ تحفے کی نوعیت لکھ دی گئی تھی۔ تاکہ تقسیم کے وقت گڑبڑ نہ ہو۔

شام کا وقت تھا ڈوبتے سورج کی آخری شعاعیں کھلے میدان میں مہاجرین کے خیموں اور ٹاٹ کے پردوں کو آخری سلام کہہ کے مغرب کی طرف ہجرت کر رہی تھیں۔ کیمپ میں بلا معاوضہ طبی امداد دینے والے ڈاکٹر میکس میھر کی شریکِ حیات جن کو تحفے اور انعامات تقسیم کرنے کے لئے دعوت دی گئی تھی پہلے سے اس جگہ موجود تھیں۔ کیمپ کے تمام بچے اپنے پھٹے پرانے لیکن صاف ستھرے کپڑوں میں اس طرح مگن تھے۔ جیسے دو جہان کی دولت ملنے کی توقع میں وہ خوشی سے پھول رہے ہوں۔ ان میں سے اکثر کی مائیں برقعے اوڑھے ان کے ساتھ تھیں۔ کم سن بچوں کو آغوشِ مادر میں جگہ ملی ہوئی تھی۔ مائیں اس طرح خوش تھیں جیسے ان کے بچوں کی قسمت کا ستارہ یک بیک چمک اُٹھا ہو۔ اتنی گہما گہمی اور چہل پہل خوشی کے خاص تہواروں پر ہی دیکھنے میں آتی ہے۔ اپنے وطن سے نکلنے اور بے گھر ہونے کے بعد سے اس وقت تک شاید مسرت کا ایک لمحہ بھی انہیں نصیب نہیں ہوا تھا۔ اس لئے وہ سب کے سب مسرور نظر آرہے تھے۔ وہ عرصہ دراز کے بعد اپنی بے کیف و بے رنگ زندگی میں مسرّت کی ایک نئی لہر دوڑتی ہوئی محسوس کر رہے تھے۔ میں نے سوچا اگر تھوڑی سی رقم خرچ کر کے ایسے غم نصیب بچوں کو تھوڑی دیر کے لئے خوش کر دیا جائے تو بہت غنیمت ہے۔

سب سے پہلے کھیل کود کے مقابلے شروع ہوئے۔ ان کھیلوں میں لڑکے اور لڑکیوں نے الگ الگ حصہ لیا۔ دو سو گز لمبی دوڑ کا نظارہ سب سے زیادہ دلچسپ تھا بعض کم سن اور کمزور و نحیف بچے بھی کمرِ ہمت کس کر اس طرح مقابلہ کے لئے ڈٹ گئے جیسے اس وقت کی کامیابی پر ہی ان کی آئندہ زندگی کا دارو مدار ہے۔ ہر مقابلے میں پہلے، دوسرے، تیسرے نمبر پر آنے والوں کو ان کی کامیابی کی پرچیاں مل گئیں۔ جنہیں دکھا کر انہوں نے اپنا انعام حاصل کیا۔ تحفے اور انعامات تقسیم کرنے سے پہلے سب بچّوں اور بچیوں کو میزوں کے سامنے جمع کر کے بٹھا دیا۔ اور انہیں ہدایت کر دی گئی کہ تم صبر و استقلال سے کام لیتے ہوئے اپنی باری کا انتظار کرتے رہو۔ وہ سب بھی اپنی جگہ اتنے مطمئن تھے کہ بالکل خاموش بیٹھے رہے اور کسی قسم کی گڑبڑ نہیں کی۔ مجھے یقین ہے کہ بہت عرصہ کے بعد اس روز وہ بچے پورے سکون کے ساتھ سوئے ہوں گے۔ اور رات

بھرانہوں نے میٹھے میٹھے خواب دیکھے ہوں گے۔ یوں ہی بچّوں کی زندگی اگر وہ مصیبتوں اور پریشانیوں سے پاک ہو تو میٹھے خوابوں کی طرح خوشگوار ہوتی ہے۔

مسز میکس میر نے تحفے تقسیم کرتے وقت ہر بچّے سے ایسے خلوص کے ساتھ ہاتھ ملایا کہ وہ ایک غیر ملکی عورت سے مرعوب ہونے کے بجائے بہت جلد ان سے گھل مل گئے۔

یہ حقیقت ہے کہ بکیس مہاجرین کی دلجوئی کرنے اور ان کو ہر طرح کی امداد دینے کا جذبہ اس وقت ہر شخص کے دل میں موجود ہے۔ اور اسی لئے وہ لوگ بھی اپنے پچھلے غموں کو بھول کر اپنی زندگی کو نئے سرے سے سُدھار نے کے لئے پُوری طرح سے طیّار ہو گئے ہیں۔

پچھلے غموں کو بھلا کر آئندہ زندگی کے خوشگوار خواب دیکھنا ایک ایسا فعل ہے کہ اس میں سب پاکستانی شامل ہیں۔ کراچی میں آج رات اسی قسم کے ایک جشن کی طیّاریاں ہو رہی ہیں۔ یہ جشن ریڈ کراس سوسائٹی کا مینا بازار ہے جس کا پاکستانی بہنیں اور غیر ملکی سفارت خانوں کی خواتین مل کر کل کراچی میں افتتاح کریں گی۔ مینا بازار لگانے کی روایات اس برِّعظیم میں مغل بادشاہوں نے قائم کی تھیں۔ انہی روایات کو آج پاکستان زندہ کر رہا ہے۔ مگر اس تبدیلی کے ساتھ کہ پاکستانی مینا بازار میں امیر غریب چھوٹے بڑے ہر شخص کو آنے کی اجازت ہے۔ کل کراچی کے مینا بازار کا پروگرام مسز احمد کی زبانی سُنیئے:۔

مینا بازار

بارہا ایسا ہوا ہے کہ انسان نے رات کو ایک خوشگوار خواب دیکھا۔ اور صبح ہوتے ہی اس کی تعبیر مل گئی۔ میں خوابوں کی دنیا کا حال آپ کو سُناتی ہوں۔ کل دوپہر تک اس جگہ پہنچ جانا آپ کا کام ہے۔ میرا مطلب مینا بازار سے ہے۔ جو کل یعنی ۱۱ مارچ سے پارسی انسٹی ٹیوٹ میں شروع ہونے والا ہے۔ آپ سوچیں گے خوابوں کی اس دنیا میں صرف چار روز چہل پہل رہے گی۔ پہلے تین روز کوئی پابندی نہیں ہوگی۔ لیکن آخری روز صرف عورتوں کے لئے مخصوص ہوگا۔ تاکہ جو بہنیں پردے میں رہتی ہیں وہ اطمینان اور آزادی کے ساتھ وہاں پھر گھوم سکیں۔ اور خرید و فروخت میں اپنی مرضی کے مطابق حصہ لے سکیں۔ مینا بازار روزانہ دن کے بارہ بجے سے رات کے بارہ بجے تک لگا کرے گا۔

مغل بادشاہوں کی یادگار مینا بازار میں آپ ہر قسم کی تفریح حاصل کرنے کے علاوہ مختلف ملکوں کی خاص خاص

چیزیں خرید سکیں گے کہیں امریکہ کی آئس کریم آپ کے دل و دماغ کو طراوت بخشے گی۔ تو کہیں مصر کے خاص حلوے کام و دہن کے لئے لذت فراہم کریں گے کہیں اٹلی کی مصنوعات آپ کی نگاہوں کی زینت بنیں گی۔ تو کہیں فرانس کے اعلیٰ عطر کی مہک آپ کی رُوح تڑپا دے گی۔ عرب کا مشہور میوہ اُس دوکان پر ملے گا جس پر موٹے حروف میں "عراق" لکھا ہوگا۔ اور چائے اس دوکان پر جو ایک خوشنما کاٹج سے مشابہ ہو گی۔ یہاں بہت نفیس انگریزی کیک بسکٹ بھی مل سکیں گے۔ اپنے گھروں کی زیبائش کے لئے کٹ گلاس کا اعلےٰ سامان آپ کو بلجیم کی دوکان سے ملے گا۔ غرض یہ کہ آپ محسوس کریں گے کہ چراغ علاؤ الدین کے دیو نے دنیا بھر کا سامان کراچی شہر میں جمع کر دیا ہے۔ جسے خریدنے کے لئے آپ کو کہیں جانے کی ضرورت نہیں ہو گی۔ یہ سب دوکانیں مُختلف ملکوں کے سفارتی نمایندوں کی طرف سے لگیں گی۔ اور وُہ خود اس جگہ موجود ہوں گے۔ آپ انہیں ان کے قومی لباس سے پہچان سکیں گے۔ ان کے علاوہ اور بہت سی دوکانیں بھی ہوں گی۔ مُغل ریستوران میں مغلوں کے عہد کے وُہ لذیذ کھانے اور شربت میسر آسکیں گے۔ جن کا ذکر پرانی داستانوں میں ملے گا۔ یا خوابوں کی دُنیا میں۔

اس لیے میں نے اس بازار کو خوابوں کی دنیا سے تعبیر کیا ہے۔

اور سُنیئے۔ وہاں پاکستان کی گھریلو صنعتوں کی بھی ایک دُوکان ہو گی۔ آپ حیران رہ جائیں گے کہ ہمارے ملک میں ایسی عُمدہ چیزیں بھی بن سکتی ہیں۔ یہ صنعتیں کبھی ہمارے مُلک کے لئے باعثِ افتخار تھیں لیکن ہم ان کو بھُلا بیٹھے۔ ہمیں محترمہ بیگم لیاقت علی خاں کا شکریہ ادا کرنا چاہیئے کہ انہوں نے اس طرف توجہ دی۔ اور ان صنعتوں کو ایسی نئی زندگی بخشی کہ اب وُہ چیزیں دیکھنے اور دکھانے کے لائق ہیں۔

اس خرید و فروخت کے علاوہ آپ کی تفریح کے لئے ہر روز سینما کے ۴ شو ہوں گے۔ اور ہر شو میں ایک نیا فلم دکھایا جائے گا جو آپ نے شہر میں کبھی نہیں دیکھا ہو گا۔ پاکستان کی بّری اور بحری فوج اور گورنر جنرل کے باڈی گارڈ کی پریڈ اور ہوائی جہازوں کے کرتب ان فلموں کے علاوہ ہوں گے۔

بڑوں کی دلچسپی کے ساتھ ساتھ بچوں کی تفریح کے لئے روزانہ شام کو چار بجے سے آٹھ بجے تک ایک خاص پروگرام ہوا کرے گا جس میں بچوں کا سینما۔ جادُو کا تماشہ۔ گھوڑے کی سواری ہنڈولے کی سیر کئی قسم کے کھیل اور کھانے پینے کی چیزیں شامل ہوں گی۔ اس خاص جگہ کا نام گوشۂ طفلاں ہو گا۔ روزانہ شام کو آپ کے بچے وہاں پہنچ کر زندگی کا نیا لُطف محسوس کیا کریں گے۔

ہاں یہ اور بتا دُوں کہ اس مینا بازار کی کُل آمدنی پاکستان ریڈ کراس کو دی جائے گی تاکہ وُہ آپ کے روپیہ سے غریب بیماروں کا مُفت علاج کر سکے۔ آج کل ان غریب بیماروں میں سب سے زیادہ تعداد مہاجرین کی ہوتی ہے جو یُوں بھی آپ کی اِمداد کے مُستحق ہیں۔

پاکستان کی زندگی انصار اور مہاجرین کی مشترکہ کوششوں کا نتیجہ اپنے مقصد کی طرف بڑھی چلی جاتی ہے۔ ہماری آرزوؤں اور اُمیدوں کے چراغ نئے مکانات اور نئی بستیوں کی شکل میں ہمارے بلند ارادوں کے نمونے ہمارے کتب خانوں اور لائبریریوں کی صورت میں اور ہماری نئی معاشرت کی جھلک مینا بازار جیسی تقریبوں کے رنگ میں دنیا کے سامنے ثابت کر رہی ہے۔ کہ پاکستان ایک مسلّمہ حقیقت ہے اور یہ حقیقت ایشیاء کے نقشے پر آج تمام دُنیا سے پاکستان کی ہستی کا اعتراف کرا چکی ہے ؂

---

۲۲ مارچ ۱۹۴۹ء

نائب وزیرِ مہاجرین کا سندھ میں دورہ

سندھ میں بسنے والے مہاجرین کی کیفیت دیکھنے کے لئے نائب وزیرِ مہاجرین ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی سندھ کے اندرونی علاقوں کا دورہ کرنے کے لئے گئے تھے۔ آٹھ روز تک سندھ کے مختلف ضلعوں تعلقوں اور دیہات کا دورہ کرنے کے بعد ڈاکٹر صاحب پرسوں کراچی واپس آ گئے آج تیسرے پہر نائب وزیرِ مہاجرین سے میں نے اس دورہ کے بارہ میں انٹرویو کیا تھا۔ اس کا ریکارڈ آپ کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے

سندھ میں ڈاکٹر قریشی کا دورہ

آغا اشرف۔ قریشی صاحب آپ سندھ میں کہاں کہاں تشریف لے گئے۔

ڈاکٹر قریشی۔ میں ٹھٹہ۔ حیدر آباد۔ تھرپارکر اور نواب شاہ کے اضلاع میں گیا تھا۔

آغا اشرف۔ کیا یہ دورہ آپ نے ریل میں کیا تھا۔

ڈاکٹر قریشی۔ جی نہیں میں یہاں سے موٹر میں گیا تھا اور ہر جگہ موٹر میں ہی سفر کیا۔

آغا اشرف۔ آپ نے کتنے سو میل کا سفر طے کیا ہو گا۔

ڈاکٹر قریشی۔ موٹر کے میٹر سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہزار میل سے کچھ زیادہ سفر میں نے کیا۔ یہ اس کے علاوہ ہے جو میں نے پیدل سفر کیا بعض جگہ بعض دیہات کو دیکھنے کے لئے چونکہ موٹر کا راستہ نہیں تھا لہذا مجھے پیدل ہی جانا پڑا۔

آغا اشرف۔ آپ ان تمام مقامات پر مہاجرین سے تو ضرور ملے ہوں گے۔

ڈاکٹر قریشی۔ جی ہاں ہر جگہ مہاجرین سے ملا میری ہر جگہ یہی کوشش رہی کہ زیادہ مہاجرین سے ملوں۔

آغا اشرف۔ سندھ میں مہاجرین کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے۔

ڈاکٹر قریشی۔ سندھ میں مہاجرین کی تعداد بہت زیادہ ہے ان میں سے بہت سے آباد ہو گئے ہیں۔ اور کچھ آباد ہو رہے ہیں۔ اور کچھ کو آباد نہیں کیا جا سکا۔ اور ان لوگوں کی حالت ظاہر ہے کہ ایک دوسرے سے کسی قدر مختلف ہے۔

آغا اشرف۔ جو مہاجرین کہ آباد ہو گئے ہیں۔ کیا آپ نے ان کو کاشت کرتے دیکھا۔ یا اس قسم کے کوئی اور کاروبار کرتے دیکھا۔

ڈاکٹر قریشی۔ جی ہاں میں نے کاشت کرتے ہوئے دیکھا۔ مہاجرین کو بلکہ میں مہاجرین کے کھیتوں پر بھی گیا۔ اور ان کے کھیتوں کو بھی دیکھا۔ ایک آدھ گاؤں میں میں نے دیکھا کہ ان کی بھینسیں موجود ہیں۔ بکریاں ہیں۔ مرغیاں ہیں۔ ان دیہات میں میں نے مہاجرین کو بہت خوش پایا۔ اس لئے کہ انہیں از سرِ نو زندگی شروع کرنے کا موقعہ مل گیا ہے۔

آغا اشرف۔ مقامی لوگوں کا مہاجرین سے سلوک کس قسم کا ہے یہاں۔

ڈاکٹر قریشی۔ میرا خیال یہ ہے کہ بعض جگہ سلوک اچھا ہے بعض جگہ بہتر ہوتا جا رہا ہے اور بعض جگہ ابھی تک مغائرت موجود ہے۔

آغا اشرف۔ کیا یہ لوگ سندھ کو اپنا نیا وطن سمجھتے ہیں۔ یا یہ سمجھتے ہیں کہ چند دن کے لئے آئے ہیں اور پھر ہم واپس چلے جائیں گے۔

ڈاکٹر قریشی۔ نہیں مہاجرین میں تو میں نے ہر جگہ یہی جذبہ پایا کہ یہی ہمارا وطن ہے یہیں زندہ رہنا اور یہیں مرنا ہے۔

آغا اشرف۔ درست۔

ڈاکٹر قریشی۔ اور اسی وجہ سے ان میں عام طور پر یہ خواہش موجود ہے کہ جہاں تک ممکن ہو مقامی لوگ جو پہلے سے آباد ہیں ان کے ساتھ ان کے تعلقات بہتر سے بہتر ہوں۔

آغا اشرف۔ مہاجرین میں زیادہ تر تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو کاشتکار ہیں۔ جو کاشتکار نہیں ہیں وہ کیا کر رہے ہیں۔

ڈاکٹر قریشی۔ یہ لوگ زیادہ تر قصبوں اور شہروں میں ہیں۔ ان میں سے بیشتر تاجر ہیں۔ کچھ ایسے لوگ ہیں جو صنعت و حرفت جانتے ہیں۔ اور کچھ لوگ ایسے بھی ہیں کہ جو مزدوری کر رہے ہیں۔

آغا اشرف۔ مثلاً حیدر آباد شہر میں تو بہت سے ایسے لوگ ہوں گے جو تجارت کر رہے ہیں یا ان کی چھوٹی چھوٹی صنعتیں ہیں۔

ڈاکٹر قریشی۔ جی ہاں ایسے لوگ ہیں۔ چنانچہ یہ کوشش بھی کی جا رہی ہے کہ پارچہ بافی یعنی کپڑا بننے کے کام کو شروع کیا جائے۔ میں نے یہ بھی دیکھا کہ بعض کارخانے وہاں پر قائم کئے گئے ہیں۔

آغا اشرف۔ یہ مہاجرین نے خود قائم کئے ہیں۔

ڈاکٹر قریشی۔ مہاجرین نے خود قائم کئے۔ چنانچہ وہاں پر آپ کو معلوم ہوگا کہ ایک فیکٹری ہے (GLUE) بنانے کی جو بہت ہی اہم حرفت ہے۔ اور اسی طرح سے بعض اور کارخانہ ہیں۔ وہاں کا مشہور "انڈس گلاس ورکس" بھی مہاجرین کے پاس ہے۔

آغا اشرف۔ تو گویا جہاں کہیں مہاجرین بسے ہیں۔ ان میں یہ جذبہ موجود ہے۔ کہ ہم اپنے پاؤں پر خود کھڑے ہوں گے اور گورنمنٹ سے امداد چاہے ملے یا پوری طرح سے نہ مل سکے ہم خود محنت سے آباد کرنے کی کوشش اپنے آپ کر سکیں گے۔

ڈاکٹر قریشی۔ یہ جذبہ تو بہت ہی زیادہ ہے یعنی اس کی تو یہ کیفیت ہے کہ بہت سے ایسے مہاجر کہ جنہیں اب تک آباد نہیں کیا جا سکا اور جنہیں حکومت مدد پہنچا رہی ہے انہوں نے مجھ سے بار بار کہا کہ حکومت ہمیں کہاں تک مدد پہنچائے گی۔ ہمیں جلد سے جلد آباد کر دیا جائے تاکہ ہم اپنے پیروں پر کھڑے ہو سکیں۔

آغا اشرف۔ میرے خیال میں تو یہ ایک بہت نیک فال ہے جب لوگوں میں خود اس قسم کا احساس ہو جائے کہ ہم خود اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا چاہتے ہیں تو یقیناً ان کی آبادکاری ایک بہت آسان مسئلہ ہو جاتا ہے۔

ڈاکٹر قریشی۔ ہاں اس میں کوئی شبہ نہیں کہ میں نے ایسے مہاجر نہیں دیکھے کہ جن میں کام کرنے کا جذبہ نہ ہو۔ اس کے علاوہ ہر قسم کی فلاح اور ترقی کی خواہش ان کے دل میں موجود ہے۔

آغا اشرف۔ قریشی صاحب میرا خیال ہے کہ اب مہاجرین کو یہاں آئے ایک سال سے زیادہ عرصہ ہو گیا ہے۔ اور اب ایسا وقت آپہنچا ہے کہ انصار اور مہاجرین کی تفریق اڑا دینی چاہیئے۔ آپ کا کیا خیال ہے اس بارہ میں۔

ڈاکٹر قریشی۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ نہایت ضروری ہے۔ اور میں نے اپنے دورہ میں ہر جگہ مہاجرین اور انصار دونوں سے کہا کہ اس بات کو بھول جانا چاہیئے کہ یہ لوگ انصار ہیں اور یہ مہاجر۔ بلکہ ہر شخص کو یہ سمجھنا چاہیئے کہ یہ لوگ سندھ کے باشندہ ہیں اور پاکستان کے شہری ہیں مسلمان ہونے کی حیثیت سے ان میں کسی قسم کی تفریق نہیں ہے۔ ایک دوسرے کے بھائی ہیں ایک مملکت کے شہری ہونے کی حیثیت سے بھی کسی قسم کی تفریق ان میں باقی نہیں رہتی۔ اور میں نے یہ دیکھا کہ جب کبھی میں نے اس امر پر زور دیا تو لوگوں نے عام طور پر اس کی تائید کی۔

آغا اشرف۔ یہ لوگ اس بات کا اندازہ لگا چکے ہیں کہ اب ہمیں یہیں رہنا ہے۔ اور یہیں زندگی بسر کرنی ہے۔

ڈاکٹر قریشی۔ بالکل ہر طرح سے۔ چنانچہ اب جو انہوں نے مطالبات پیش کئے ہیں وہ ایسے لوگ کبھی نہیں کر سکتے جنہیں وہاں پر رہنا نہ ہو۔

آغا اشرف۔ مثلاً
ڈاکٹر قریشی۔ مثلاً انہوں نے یہ کہا کہ ہمارے قصبوں میں صفائی کا انتظام بہتر ہونا چاہیئے۔ مثلاً انہوں نے یہ کہا کہ ہماری تعلیم کے لئے مدارس ہونے چاہئیں۔ بہت سی جگہ مجھ سے یہ مطالبہ کیا گیا کہ لڑکوں کے لئے مدارس تو موجود ہیں لیکن لڑکیوں کے لئے اب تک مدرسہ نہیں ہے۔ اس کے علاوہ شفاخانے ہونے چاہئیں۔ اور ان سب سے زیادہ یہ کہ کاشت کے علاوہ فلاح پیدا کرنے کے جو ذرائع ہو سکتے ہیں، ان پر زور دیا جائے مثلاً یہ کہ ایسی چھوٹی چھوٹی صنعتیں جو کاشتکار اور ان کے خاندان اپنے فاضل وقت میں اختیار کر سکتے ہیں ان کا بھی مطالبہ مجھ سے کیا گیا۔
آغا اشرف۔ ان قصبوں میں سکول تو غالباً اب تک قائم نہ کئے جا سکے ہوں گے لیکن خود استاد اپنی اپنی جگہ پر کچھ مدرسہ کھول رہے ہوں گے۔
ڈاکٹر قریشی۔ نہیں صورت یہ ہے کہ بعض جگہ تو سکول ہیں۔ اور بعض جگہ نہیں ہیں وہاں پر مہاجرین میں سے اکثر ایسے جمع ہو گئے ہیں کہ جو بچوں کے لئے اپنے اپنے مدرسہ خود کھول دیں۔

مہاجرین کی تعلیم سے دلچسپی کو ڈاکٹر قریشی صاحب نے پاکستان کے لئے نیک فال بتایا ہے کیونکہ ہماری آئندہ ترقی کا دارومدار ان نئی نسلوں پر ہے جو آج اسکولوں میں تعلیم حاصل کر رہی ہیں۔ ان آئندہ نسلوں کو تعلیم دینے کے لئے مہاجرین نے جو کوششیں خود کی ہیں یہ بھی قابلِ تحسین ہیں۔ ایک چھوٹی سی مہاجر بچی اپنے مکتب کا حال آپ کو سُنانی ہے۔

مُہاجر بچّوں کی تعلیم

ہمیں ہجرت کر کے یہاں آئے ہوئے ایک سال سے زیادہ عرصہ ہو گیا ہے۔ شروع شروع میں ہماری تعلیم کا کچھ انتظام نہ تھا۔ مگر کئی مہینے ہوئے ہمارے ہی گاؤں کی ایک دیہ خاتون نے اپنی کوششوں سے کراچی میں لڑکیوں کے دو مدرسے قائم کئے ہیں۔ ایک نانک واڑہ میں ہے دوسرا کھارادر میں۔ ان دونوں مدرسوں میں بہت لڑکیاں تعلیم پاتی ہیں۔ ان کو قرآن شریف اور دینیات کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اور گجراتی، اردو، انگریزی بھی سکھایا جاتا ہے پڑھنے والی لڑکیوں میں اکثر مہاجر ہیں۔ اُستانیاں بھی مہاجر ہیں۔ مدرسوں کی دیکھ بھال ہمارے وطن کے پرانے مولوی صاحب کرتے ہیں جو لڑکیاں مدرسہ سے دُور رہتی ہیں ان کو مدرسہ میں لانے کے لئے موٹر بس بھی ہے۔

ہمارے مدرسہ کا نام "رونقِ اسلام" ہے اور دوسرے کا نام "بنت الاسلام" ہے۔ "بنت الاسلام" مدرسہ کی افتتاح محترمہ فاطمہ جناح نے کی تھی۔ اُس وقت وہاں بڑا جلسہ ہوا تھا۔ میں نے اُس جلسہ میں ایک نظم پڑھی تھی۔ اُس نظم کے کچھ اشعار مجھے اب بھی یاد ہیں۔

ستاروں میں چمک۔ تیری گُلوں میں تازگی تیری ۔۔۔ جہاں میں ہر طرف پھیلی ہوئی ہے روشنی تیری

مکاں تیرے مکیں تیرے یہ سب آبادیاں تیری ۔۔۔ حجر تیرے شجر تیرے یہ جنگل وادیاں تیری

ریاست بیکانیر کے مہاجر بھی دوسری ریاستوں کے مہاجرین کی طرح سر چھپانے کے لئے پاکستان آئے تھے۔ ایک بیکانیری مہاجر ان کی آبادکاری کا حال آپ کو سُنا رہے ہیں۔

بیکانیر کے مہاجرین

ہندوستان کے علاقہ میں فسادات ہونے کے باعث جس طرح دوسرے لوگ پاکستان آئے اسی طرح سے مسلمانانِ ریاست بیکانیر بھی اپنی امن وامان سے زندگی گزارنے کے خیال سے براستہ جودھپور ریلوے اوّل ہی اوّل حیدرآباد سندھ میں آئے۔ ان کے آنے پر حکومت کی طرف سے ان کے ٹھہرنے کا وراشن کا نہایت معقول طریق پر انتظام کیا گیا۔

ان لوگوں میں جو لوگ پیشہ ور مثلاً لوہار، نیلگر، منیار، سبزی فروش، قصاب، قلعی گر، پٹوہ وغیرہ وغیرہ تھے وہ لوگ اپنے پیشہ سے کمانے لگ گئے۔ اور جو لوگ آسودہ حالت میں آئے تھے انہوں نے اپنا تجارتی کاروبار۔ پرچون کی دکان۔ لکڑی کوئلہ کی دوکان۔ دودھ دہی کی دوکان۔ ہوٹل۔ راشن کی دوکان۔ پان بیڑی کی دوکان وغیرہ وغیرہ شروع کر دیا۔ جو لوگ مزدوری پیشہ تھے یا معمارگری جانتے تھے۔ وہ اپنی مزدوری سے اپنی گذر اوقات کرنے لگ گئے۔

پہلے حکومتِ پاکستان کی طرف سے زمین زرعی کے متعلق کوئی اعلان کہ بیکانیر کے باشندگان کو زمین زرعی دی جاتے یا کیا نہیں فرمایا گیا تھا۔ مگر بعد میں حکومت نے ریاست بیکانیر۔ الور۔ بھرت پور وغیرہ ریاست کے باشندگان کو بھی زمینیں زرعی دیئے جانے کا اعلان فرما دیا۔ چنانچہ جو لوگ کاشتکار طبقہ کے تھے وہ کل باہر دیہات میں جا کر آباد ہو چکے ہیں۔ اور اُن سب کو رہنے کو مکانات اور کاشت کے لئے زمینیں حکومت کی طرف سے مل چکی ہیں۔ یہاں تک کہ ایک دو دو فصلیں بھی لے چکے ہیں۔ اور نہایت آسودگی و ہنسی خوشی سے اپنی زندگی

بسر کر رہے ہیں۔

مرنا جینا انسان کی زندگی کے ساتھ لگا رہتا ہے۔ کراچی میں اکثر لوگوں کو شکایت تھی کہ اگر خدا نخواستہ کوئی مر جائے تو نئے شہر میں کفن دفن کا بندوبست تک نہیں ہو سکتا۔ اس تکلیف کا احساس میمن قوم کے تاجروں کو سب سے پہلے ہوا۔ اور انہوں نے تجہیز و تکفین کے لئے ایک مستقل جماعت قائم کر دی ان نیک بندوں کو اس کا احسان تو خدا ہی دے گا۔ آپ انجمن کا حال کریم صاحب سے سُن لیجئے۔

انجمن تجہیز و تکفین

جب کراچی میں لاکھوں کی تعداد میں مہاجرین آئے تو ان کو بہت سی مشکلوں سے دوچار ہونا پڑا۔ رہائش کے مکانوں کی دشواری۔ روزی کمانے کی فکر۔ بچوں کی تعلیم کا انتظام مختصر یہ کہ بہت سی مشکلات سر پر سوار تھیں۔ اس کے علاوہ خدا نخواستہ کسی کے یہاں کسی کا انتقال ہو گیا۔ تو اس کے کفن دفن کے انتظام میں بہت تکالیف سے دوچار ہونا پڑتا تھا۔ کئی گھنٹوں تک کفن دفن کا انتظام نہ ہو سکتا تھا۔ اور اس کے لئے بڑی پریشانی ہوتی تھی۔ اور کافی روپیہ خرچ کرنا پڑتا تھا۔ اس کارِ خیر کو انجام دینے کے لئے دو جماعتیں کراچی میں قائم ہوئیں۔ جس میں سے ایک کا نام۔ بانٹوا انجمن حمایت اسلام ہے اور اُس کا دفتر کھوڑی باغیچہ کے پاس ہے۔ اور دوسری جماعت کا نام کراچی میمن انجمن ہے۔ اور اس کا دفتر کچی قبر کے پاس ہے۔ ان دونوں انجمنوں میں کفن دفن کرنے کا معقول انتظام کیا گیا ہے قبرستان میں جانے کے لئے موٹر لاریاں بھی رکھی گئی ہیں۔ صاحبِ مال سے مناسب رقم لی جاتی ہے اور لاوارثوں غریبوں اور محتاجوں کے لئے کفن دفن کا انتظام راہِ اللہ کر دیا جاتا ہے۔ ہر مسلمان جو کہیں کا بھی رہنے والا ہو۔ ان جماعتوں سے خدمت لے سکتا ہے۔ اس کارِ خیر کو چلانے کے لئے مہاجرین تجارت پیشہ بھائیوں سے وقتاً فوقتاً چندہ ملتا رہتا ہے۔ اور یہ دونوں انجمنیں مہاجرین تجارت پیشہ طبقہ نے قائم کی ہیں۔ اور وُہ ہی اس کا کام چلا رہے ہیں۔ اس حقیقت سے آپ کو بخوبی معلوم ہو جائے گا کہ ہمارے مہاجرین میں تجارت کرنے والے سوداگر تجارت کرکے پیسہ کمانے کے ساتھ ساتھ پاکستان کے دارالسلطنت کے باشندوں کی خدمت کا کچھ نہ کچھ کام بھی انجام دے رہے ہیں۔

جس طرح مرنا جینا انسان کی زندگی کے ساتھ لگا رہتا ہے یہی حال اخبار نویسوں کا ہے کہ یہ ہماری زندگی کا جزو ہیں۔ اور مرنے کے بعد بھی ان سے نجات آسانی سے نہیں ملتی۔ مہاجرین میں اخبار نویسوں

اور ادیبوں کی بھی ایک بہت بڑی تعداد پاکستان آئی ہے۔ ان کی آباد کاری اور بحالی کی داستان ایک ایسے بزرگ سے سنیئے کہ جو خود نصف صدی سے اس میدان میں کام کر رہے ہیں۔ ملا واحدی صاحب!

مہاجر ادیب

میں ۱۹۴۷ء کا پورا ستمبر اور وہ تہائی اکتوبر گزار کر محشرستانِ دہلی سے چلا تھا۔ ۲۱ اکتوبر کو راولپنڈی پہنچا۔ اور راولپنڈی سے براہ لاہور کراچی آیا۔ میرا بڑا لڑکا سرکاری ملازم ہے۔ پاکستان بننے کے بعد اس کا تقرر کراچی میں ہوا تھا۔

سب سے پہلا مرحلہ جس سے یہاں سابقہ پڑا مکان کا مرحلہ تھا۔ مکان کے سلسلے میں مجھے بھی وہی تجربے ہوئے جن سے آپ کم و بیش واقف ہیں۔ آپ ممکن ہیں ہارے نہ ہوں میں نے سولہ سترہ دن کوشش کر کے ہار مان لی۔ اور فیصلہ کیا کہ شہر سے باہر رہوں گا۔ اور جنگل میں بیٹھ کر رسالہ نکالوں گا۔ رسالہ نکالنے کی اجازت کراچی میں اتنی آسانی اور اتنی پھرتی سے مل گئی کہ دلی میں کبھی کسی اخبار یا رسالہ کو نہیں ملی ہو گی۔ گیارہ بجے درخواست دی۔ اور اسی دن ۳ بجے اجازت نامہ میرے پاس تھا۔

رسالہ کے اجرا میں کاغذ وغیرہ کی رکاوٹ بھی نہیں پڑی۔ دہلی میں ٹھہرتا تو رسالہ خدا معلوم کب تک معطل اور ملتوی رہتا۔ کراچی میں پہلا پرچہ ۶ جنوری ۱۹۴۸ء کو شائع ہو گیا۔ اور اَلحَمدُ لِلّٰہ ہر مہینے شائع ہوتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ جما ہوا کاروبار ایک دفعہ ہل جاتا ہے تو دوبارہ مشکل سے جما کرتا ہے خصوصاً جب اس کاروبار کے خریدار خود اپنی اپنی جگہ سے ہل گئے ہوں۔ اگر وہ جگہ پر ہیں بھی تو سہمے سہمے ہیں۔ اور پاکستان کا اخبار رسالہ خریدتے ڈرتے ہیں۔

دُوسرا بڑا فائدہ کراچی آجانے سے یہ پایا کہ بچوں کی تعلیم جاری ہے۔ کالج والوں کو تو ضرور دھچکا لگا۔ تاہم سکول والے بچوں کا سال ضائع نہیں گیا۔ دلی میں کم از کم ایک سال قطعی ضائع جاتا۔ کالج والے بچے بھی بفضلہ بیکار نہیں ہیں۔ نوکری کر رہے ہیں یا میرا ہاتھ بٹا رہے ہیں۔

دلی چھٹنے کا یقیناً صدمہ ہے۔ مگر دلی چھوڑنے کا پچھتاوا نہیں۔ چھوڑنے کے سوائے چارہ نہ تھا۔ زندگی یہاں کچھ سے کچھ ہو گئی۔ لیکن وہاں شاید اور بدتر ہو جاتی۔ کھٹمل اگر نہ کاٹیں تو کراچی بُرا شہر نہیں ہے۔ جامع مسجد۔ لال قلعہ۔ اور بائیس خواجاؤں کی یاد ستاتی ہے تو اس تصور سے دل کو بہلا لیتا ہوں کہ دیارِ حبیب دلی کی نسبت کراچی سے قریب ہے۔

دلی کو اب اُردو کا مرکز نہیں کہا جا سکتا۔ لکھنؤ کی خصوصیات بھی چند دن کی مہمان ہیں۔ دلی اور لکھنؤ کا مرتبہ۔ اب کراچی۔ ڈھاکے اور لاہور کو حاصل ہے۔ ہندوستان کے اخبار نویس اور صحافی اور مُصنف بیشتر کراچی میں ہیں۔ نئے

ئے حضرات نے بھی یہاں آکر اس میدان میں قدم رکھا ہے۔ اور کراچی سے بے شمار اخبار اور رسالے نکلنے لگے ہیں اُردو لکھنے والے، اُردو پڑھنے والے اور اُردو بولنے والے کراچی میں اس قدر دکھائی دیتے ہیں۔ کہ کراچی سندھ کا شہر نہیں رہا۔ یُو پی کا شہر بن گیا ہے۔

دلّی کی تہذیب اور دلّی کی شستگی و شائستگی دلّی میں مغلوب ہو چکی۔ مگر کراچی میں اس کا دور دورہ ہے۔ وہ چیزیں جو کبھی دلّی سے بطور سوغات کراچی آتی ہوں گی۔ ممکن ہے آئندہ کراچی سے دلّی جایا کریں۔ لباس۔ غذا اور زبان پر کراچی کی ہوا۔ کراچی کے پانی اور کراچی کے قدیم باشندوں کی محبت کا اثر ہونا بھی لازمی ہے۔ تاہم دلّی پن جتنا بھی باقی رہے گا اب کراچی میں دلّی سے زیادہ رہے گا۔

سچّے واقعات

(۳۱ مارچ ۴۹ء)

کل لاہور میں پاکستان کے گورنر جنرل خواجہ ناظم الدین ایک جلسے سے باہر تشریف لا رہے تھے۔ کہ موٹر میں بیٹھتے وقت ایک ضعیف مہاجرہ عورت نے گورنر جنرل کا راستہ روک کر کوئی بات کہنی چاہی۔ گورنر جنرل فوراً رُک گئے اور نہایت غور سے پانچ منٹ تک اِس مہاجر عورت کی مُصیبت کی داستان سنتے رہے۔ اور اس کا حال سُننے کے بعد گورنر جنرل نے فوراً احکامات جاری کئے۔ اور مہاجر عورت اُنہیں دُعائیں دیتی ہوئی رخصت ہو گئی۔

غریب مہاجر عورت کی اِس طرح داستان سُن کر ہمارے نیک دل گورنر جنرل نے تمام پاکستان کے لئے ایک قابلِ تقلید مثال قائم کی ہے تاکہ سرکاری محکموں کے دُوسرے افسر بھی اپنے گورنر جنرل کی طرح مہاجرین کے دُکھ درد کا حال غور سے سنیں۔ اور اس کا علاج جہاں تک ممکن ہو سکے جلد کریں۔ کل کراچی میں پاکستان سندھ مہاجرین کونسل کا اجلاس بہت سی ضروری باتوں کا فیصلہ کرنے کے لئے منعقد ہوا تھا۔ اس اجلاس کے ضروری فیصلوں کی تفصیل یہ ہے:۔

کل پاکستان سندھ مہاجرین کونسل کے اجلاس کی صدارت سندھ کے گورنر مسٹر دین محمد نے کی تھی۔ اور اجلاس میں آنریبل خواجہ شہاب الدین۔ آنریبل مسٹر یوسف ہارون وزیرِ اعظم سندھ۔ آنریبل سیّد میراں محمد شاہ وزیرِ مہاجرین سندھ اور سندھ اور پاکستان کے دُوسرے افسر شریک ہوئے تھے۔

مہاجرین کونسل نے فیصلہ کیا ہے کہ وُہ مہاجرین جو ہندوستان میں غیر منقولہ جائدادیں چھوڑ آئے ہیں انہیں سندھ میں گزارہ ملا کرے لیکن شرط یہ ہے کہ ان کی جائدادوں کی ہندوستان میں آمدنی اٹھارہ سو روپیہ سالانہ سے کم نہ ہو۔

دُوسرا مسئلہ مہاجرین کی تقاوی کے متعلق ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ تقاوی کی رقم انہیں نہیں ملے گی

لیکن یہ خیال غلط ہے۔ مہاجرین کونسل کا فیصلہ یہ ہے کہ جب تک مہاجرین پُوری طرح سے آباد نہ ہو جائیں ان کو نقادی کی رقم برابر ملتی رہے۔

حکومتِ سندھ نے وعدہ کیا ہے کہ سندھ میں جس قدر مہاجرین بسائے گئے ہیں ان کے متعلق مکمل اعداد و شمار بہت جلد حکومتِ پاکستان کے سامنے رکھ دیئے جائیں گے۔ اور مہاجرین کو بیل کاشتکاری کے لئے دیئے جائیں گے۔

یہ بھی طے پایا کہ کراچی اور سندھ میں حکومت کی طرف سے یتیم خانے کھولے جائیں تاکہ وُہ یتیم بچے جو اب تک کسی ادارے میں جگہ نہیں پا سکے انہیں حکومت اپنی نگرانی میں تربیت دے سکے۔

مہاجرین کی ہمارے ہمسایہ اسلامی ممالک جس فراخ دلی سے مدد کر رہے ہیں۔ اس کا حال آپ اکثر اس پروگرام میں سُنتے ہیں۔ اس ہفتے سعودی عربستان کے علاقے۔ روس تورا میں امریکن آئل کمپنی کے پاکستانی ملازمین نے تقریباً ...، روپیہ کشمیری مہاجرین کی مدد کے لئے وزیرِ مہاجرین کو بھیجا ہے جس کا پاکستانی مہاجرین شکریہ ادا کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ اسی ہفتہ کراچی ٹکسٹائل بروکرز ایسوسی ایشن کی طرف سے گوردھن داس مارکیٹ میں ایک دلچسپ جلسہ ہوا تھا۔ اس جلسہ کا تعلق چُونکہ مہاجرین سے ہے، اس لئے اس کا ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔

پاکستان کے تاجر

گوردھن داس مارکیٹ۔ کراچی شہر کے کاروباری علاقے میں سب سے زیادہ بارونق جگہ ہے۔ ۲۸ مارچ کو ساڑھے پانچ بجے اس بارونق کاروباری علاقہ کے سوداگر مارکیٹ کے چوراہے پر جمع ہو گئے۔ چوک میں ایک اُونچے پلیٹ فارم پر بہترین کرسیاں اور صوفا سیٹ رکھے گئے تھے۔ سر پر خوبصورت شامیانہ تھا۔ اور سامنے کئی سو سوداگر فرش پر بیٹھے تھے۔ خواجہ شہاب الدین صاحب کے آتے ہی جلسہ شروع ہو گیا۔ ایک صاحب نے تلاوتِ قرآن شریف کی۔ اس کے بعد ٹکسٹائل بروکرز ایسوسی ایشن کے صدر نے خواجہ صاحب کی خدمت میں ایک سپاسنامہ پڑھا اور انجمن کی طرف سے مہاجرین اور مجاہدینِ کشمیر کے لئے پینسٹھ ہزار روپیہ کا چیک پیش کیا۔

خواجہ صاحب نے جواب میں فرمایا کہ جب پاکستان بنا ہے تو ہمارے دشمن اپنی جگہ پر یہ سمجھے بیٹھے تھے کہ پاکستان بن گیا تو کیا ہوا۔ تجارتی اور کاروباری دنیا میں پاکستان زندہ نہیں رہ سکتا۔ مگر آپ جیسے باہمت پاکستانی تاجروں نے ثابت کر دیا کہ پاکستان تجارت اور کاروبار کے میدان میں کسی دوسرے ملک سے پیچھے نہیں چنانچہ اس وقت تمام دنیا کی منڈیوں میں پاکستان کے کاروبار کی ساکھ برابر بڑھتی چلی جا رہی ہے۔

خواجہ صاحب نے اپنی تقریر کے آخیر میں سوداگروں کو اور تاجروں کو نصیحت کرتے ہوتے فرمایا کہ ہمارے جیسوں کی کارروائی اکثر قرآن شریف کی تلاوت سے شروع ہوتی ہے۔ کیونکہ ہم اسے خیر و برکت کا مُوجب

سمجھتے ہیں۔ مگر صرف یہی کافی نہیں کہ ہم قرآن کی آیات سُنیں اور انہیں بھول جائیں۔ ہمارے کاروبار میں بھی ان احکام قرآنی کی جھلک نظر آنی چاہیئے۔ ہمیں اپنے معاملات اور تجارت میں بھی قرآن شریف کے احکام پر چلنا چاہیئے۔ کیوں کہ اسلام نے ہمیں پیدائش سے لے کر مرتے دم تک ہر منزل کا راستہ دکھایا ہے۔ اور بتایا ہے کہ ہمیں تجارت اور کاروبار کس طرح کرنے چاہئیں۔ دُوسروں کی مصیبت کے وقت مال کو زیادہ داموں پر بیچ کر فائدہ اٹھانا صرف اخلاقی جُرم نہیں بلکہ مذہب کی نگاہ میں بھی یہ ایک بہت گناہ ہے۔

کراچی میں مہاجر عورتوں کی آبادکاری اور بحالی کے لئے کراچی خواتین مسلم لیگ نے ایک صنعتی مرکز بندر روڈ ایکسٹینشن پر کھولا ہے۔ یہ دفتر گلِ رعنا کلب کی عمارت میں واقعہ ہے۔ جہاں سو سے زائد مہاجر عورتیں روزانہ اپنی روزی کمانے کے لئے جمع ہوتی ہیں ۲۹ مارچ ۱۹۴۹ء کو آنریبل خواجہ شہاب الدین اس مرکز کا معائنہ کرنے کے لئے تشریف لے گئے تھے اس کا حال سُنیئے:۔

پاکستانی بہنوں کی کوششیں

گلِ رعنا کلب کی عمارت میں کراچی خواتین مُسلم لیگ کی کارکن بہنیں خواجہ شہابُ الدین کے استقبال کے لئے جمع تھیں۔ ان بہنوں میں بیگم زاہد حسین بیگم وسیم بیگم رحمان اور بیگم شہابُ الدین کے نام خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ خواجہ صاحب کے ہمراہ نائب وزیر مہاجرین ڈاکٹر اِشتیاق حسین قریشی اور کراچی کے ناظم اور کراچی کے کلکٹر اور دُوسرے پاکستانی افسر بھی آئے تھے۔ ایک رپورٹ میں خواجہ صاحب کی خدمت میں خواتین مسلم لیگ کے کاموں کی تفصیل بیان کی گئی۔

اس کے بعد خواجہ صاحب نے کلب کا معائنہ کیا۔ کلب کے ہال کمرے اور دالانوں میں مہاجر عورتیں مشین سے بیٹھی کپڑے سی رہی تھیں۔ یہ مشینیں انہیں خواتین مسلم لیگ کی طرف سے ملتی ہیں۔ البتہ ہر عورت اپنی مشین کے لئے سو روپیہ جمع کرا دیتی ہے۔ اس کے بعد ہر روز اسے محنت کے صلے میں جو تین روپیہ مزدوری کے ملتے ہیں۔ ان میں سے ایک روپیہ روزانہ یہ عورتیں مشین کی قیمت کے حساب میں دیتی ہیں۔ اس طرح چھ مہینہ میں مشین کی مالک مہاجر عورتیں ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ کئی سو غریب مہاجر عورتوں کو خواتین مسلم لیگ کی طرف سے سینے کی مشینیں مل چکی ہیں۔ آج کل یہاں کشمیر کے مہاجرین اور مُجاہدین کے لئے کپڑے سِل رہے ہیں۔ دن بھر میں ایک عورت چھ جوڑے کپڑے سی لیتی ہے۔ کپڑے کاٹنے پر ایک درزی ملازم ہے۔ کٹائی کے بعد کپڑے عورتوں میں تقسیم

ہو جاتے ہیں۔ اور عورتیں سینے کے بعد انہیں جمع کر کے اپنی محنت وصُول کر لیتی ہیں۔ ہمارے سامنے بہت سی عورتوں نے لا لا کر کپڑے دیئے اور روپے وصول کر لئے۔ یہ سب عورتیں مہاجر ہیں۔ اور ان میں سے اکثر کے خاوند شہید ہو چکے ہیں۔ اور اب گھر کا سارا بوجھ انہیں کے سر ہے۔ ایک عورت اور اُس کی لڑکی اس لئے مزدوری کرنے آئی ہیں کہ اُس عورت کا لڑکا انجینیئرنگ کالج میں پڑھتا ہے۔ اور اُس کی فیس کے لئے روپیہ یہ ماں بیٹیاں مل کر اپنی محنت سے جمع کرتی ہیں۔ قربانی اور ایثار کی اس قسم کی مثالیں اکثر ملیں گی۔ خواجہ صاحب نے ان عورتوں کے کام کی بہت تعریف کی۔ اور وعدہ کیا کہ حکومت کی طرف سے انہیں ہر قسم کی امداد ملے گی۔

مہاجرین کی جفاکشی اور محنت کی مثالیں تلاش کرنے کی زیادہ ضرورت نہیں۔ ہر ہر قدم پر ہمیں محنتی اور جفاکش مہاجر ملیں گے۔ اخلاق حسین صاحب ایک واقعہ بیان کرتے ہیں جو افسانہ نہیں حقیقت ہے

ایک سچا واقعہ

بارہ ایک بجے رات کا عمل ہو گا۔ میں سینما سے نکلا اور رکشا کر کے گھر کی راہ لی۔ گھر میں نے غلط کہا۔ گھر تو عرصہ ہوا انسانی درندگی کا شکار ہو گیا۔ ہاں ٹھکانہ کہوں تو بیجا نہ ہو گا۔ اپنی تباہی کے بعد سے میں نئی تہذیب کی بھول بھلیاں میں تسکین ڈھونڈا کرتا ہوں۔

کرایہ کی بات چیت میں میں نے رکشا والے کے لہجے سے بھانپ لیا تھا۔ کہ وُہ مہاجر ہے۔ پہلے سوچا اُدھر ہو گا بھی میں کوئی خدائی فوجدار تو ہوں نہیں کہ ہر شخص کا حال پوچھتا پھروں۔ مگر جی نہ مانا۔ اور پُوچھ ہی لیا۔ کہو میاں تم کہاں سے آئے ہو۔ اس نے لاپرواہی سے جواب دیا۔ دلّی سے۔ وہاں کیا کرتے تھے اور تم پر کیا گزری۔ میں نے دُوسرا سوال کھینچ مارا۔

اس سوال سے وہ تیورا سا گیا۔ ہینڈل ہاتھوں سے چھوٹ گیا اور رکشا نیم دائرہ بناتی ہوئی فٹ پاتھ سے ٹکرائی۔ مگر اس نے سنبھل کر رکشا کو پھر راستہ پر لگایا۔ پھر مُڑ کر دیکھا۔ اور کہنے لگا۔ بابو جی۔ کیا بتاؤں کیا تھا کیا ہو گیا۔ اللہ جو چاہے کرے۔ بہتیرے جتن کرتا ہوں کہ گزری باتیں بھُول جاؤں۔ اب کُڑھنے سے کیا حاصل۔ مگر بعضے مہربان چھیڑ کر یاد دلا دیتے ہیں۔ اچھا آپ نے پوچھا ہی ہے تو سُن لیجئے۔ ہم دو بھائی مل کر آڑھت کا کاروبار کرتے تھے۔ چھوٹا بھائی بی اے تک۔ وُہ لکھنے پڑھنے کا کام کرتا۔ میں کم پڑھا ہوں۔ بیوپار میں کرتا تھا۔ ۸۔ ۹ سو کے قریب آمدنی تھی۔ مکان تھا نوکر چاکر تھے۔ ساز و سامان تھا موٹر تھی۔ حاکم حکام میں عزت تھی۔ غرض خدا کا

دیا سب کچھ تھا۔ بال بچوں کی طرف سے بھی سُکھ تھا۔ کیا خبر تھی کہ یہ بہار دو دن کی ہے۔ اور پھر اگھر دم بھر میں اُجڑ جائے گا۔ وُہ زندگی ایک سُہانا خواب تھی۔ آنکھ کھلی تو نہ کاروبار تھا۔ نہ گھر نہ گھر والے۔ میاں بس ہی ناس ہو گیا ہمارا شکر ہے مالک کا۔

وُہ ٹھنڈی سانس۔ لے کر چُپ ہو گیا۔ ایک ہاتھ اضطراری حرکت سے اٹھا۔ اور آنکھوں پر آستین کو رگڑتا ہوا پھر ہینڈل پر واپس آ گیا۔ اس نے گھُٹی گھُٹی سی آواز میں پھر کہنا شروع کیا۔ لاکھ کلیجہ پتھر کا کر لیا ہے۔ مگر وُہ خُونی ماجرا بیان نہیں کر سکتا۔ خیال سے کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ اُف میرے بچے تڑپ تڑپ کر پکارتے رہے اور میں کچھ نہ کر سکا۔ خیر وُہ سب اچھے تھے۔ اللہ کو پیارے ہوئے۔ میں اپنے گناہوں کی سزا بھگتنے کو اکیلا رہ گیا.... جو میرے مولا کی مرضی ...... جب میں کراچی پہنچا تو میرے پاس کل سات روپے تھے۔ حیران تھا کہ کیا کروں کسی پر بوجھ ڈالنا یا کسی کے آگے ہاتھ پھیلانا گوارہ نہ تھا۔ اس الجھن میں جیسے میری رُوح نے مجھ سے کہا، بپتا پڑی ہے۔ تو مردوں کی طرح سہو۔ صبر سے کام لو اور خدا کا نام لے کر اتنے ہی پیسوں سے کوئی دھندا شروع کر دو۔ حرکت میں برکت ہے۔ بس مجھ میں جان آ گئی۔ میں نے چائے بیچنے کا فیصلہ کر لیا۔ اسی دن سامان خریدا۔ پچھلے پہر اُٹھ کر چائے بنائی۔ اور اندھیرے منہ ہی پھیری کو نکل گیا۔ بارہ بجتے بجتے پتیلی خالی ہو گئی۔ لَوٹا۔ دُوسرا تاؤ بنایا۔ اور پھر نکلا۔ شام کو پتیلی میں بُوند نہ تھی۔ ساڑھے تین روپیہ منافع ملا۔ مایُوس گیا تھا۔ شکر کرتا ہوا آیا۔ بڑی ڈھارس ہوئی۔ دو مہینہ یہی سلسلہ رہا۔ بعض دن تو تین تین تاؤ بِک جاتے۔ پھرتے پھرتے تھک جاتا۔ چیختے چیختے گلا بیٹھ جاتا۔ مگر میں ٹھان چکا تھا کہ کام میں جتنا زیادہ مصروف رہوں گا۔ پچھلی باتیں اتنی ہی کم یاد آئیں گی۔

جہاں میں ٹھہرا تھا وہیں ایک بوڑھے مہاجر اور ان کا لڑکا بھی رہنے لگے تھے۔ دونوں محتاج۔ فاقوں کی نوبت۔ میاں ہمارے مذہب نے پاس پڑوس والوں کا بڑا حق جتایا ہے۔ میں ڈرا کہ میں پیٹ بھر روٹی کھاؤں۔ اور وُہ لوگ بھوکے سوئیں تو مالک کو بُرا لگے گا۔ اور وُہ زیادہ ناراض ہو جائے گا۔ وُہ اور گناہ تو بخش دیتا ہے مگر اس کے بندوں کا حق مارا جائے تو معاف نہیں کرتا۔ جھٹ ایک پتیلی اور لے آیا۔ اور اُن دونوں کو بھی اُسی کام میں لگا لیا۔ ہوتے ہوتے ہمارے پاس چار سو روپے ہو گئے۔ باؤجی روپیہ بیکار رکھ چھوڑنا بڑی غلطی ہے۔ اُسے تو اچھے کاموں میں لگاتے رہنا چاہیئے کہ اپنا بھی بھلا ہو اور دوسروں کا بھی۔ اس خیال سے ہم نے یہ رکشا لے لی۔ اب چائے بڑے میاں بیچنے لگے۔ اور رکشا چلانے کی ڈیوٹی ان کے لڑکے اور میں نے رات دن کی باری سے بانٹ لی۔ اس سے ذرا بھی فرصت ملتی ہے تو بڑے میاں کا ہاتھ بٹاتے ہیں کبھی کبھی رکشا کسی غریب کو کرایہ پر بھی دے دیتے ہیں کہ اس کا بھلا ہو جائے۔ اتنے دنوں میں اللہ نے ایسا کر دیا ہے کہ پھیری کے بجائے بیٹھ کر کوئی کام کریں۔ دوکان کی فکر ہے۔ خدا نے چاہا تو دوکان بھی مل جائے گی۔ مکان بھی ہو جائے گا۔ اطمینانی زندگی کا نقشہ بھی جمیگا

وُہ دن نہیں رہے تو یہ بھی نہ رہیں گے۔ قُدرت کے عجب کارخانہ ہیں۔" لیجئے آپ کا ہوٹل آگیا۔"
میں اس رکھشا والے کے ایمان، صبر و شکر، حوصلہ مندی اور اپنی مصیبت میں بھی دُوسروں کے حقوق کی نگہداشت پر عش عش کرتا اور اپنی تنگ دلی، بے عملی، سیر و تفریح میں سکُون کی تلاش اور خُدا اور اُس کے بندوں کی طرف سے غفلت پر نفرین کرتا ہُوا رکھشا سے اُتر آیا۔

کاش یہی توکّل، یہی جذبۂ عمل ہم سب میں ہوتا۔ مُلک کا سرمایہ یہی جفاکش، ہمت والے خدا ترس لوگ ہیں۔

ھجرت کے بعد کی جدّوجہد

۱۴ اگست کے بعد جس تباہی اور بربادی کا سامنا کرتے ہوئے لاکھوں مہاجرین پاکستان میں داخل ہوئے تھے۔ اس کا حال ہمارے وزیرِ اعظم مسٹر لیاقت علی خاں نے مسلم لیگ کونسل کے جلسے میں یُوں بیان کیا تھا۔

کمزور بڈھے مہاجرین سینکڑوں میل پیدل چل کر پاکستان کی طرف آتے تو راستہ میں جگہ جگہ دریافت کرتے۔ کیا پاکستان آگیا۔ لوگ کہتے ابھی نہیں تو پھر وُہ آس لگا کر چل دیتے۔ جب سرحد پر پہنچتے تو اطمینان کا سانس لیتے اور کہتے کہ خدایا تیرا شکر ہے۔ پاکستان تھا تو ہم بچ کر یہاں پہنچ گئے۔

مہاجرین کی جس حالت کا نقشہ ہمارے وزیرِ اعظم نے کھینچا ہے۔ اسے مبالغہ نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ اب تک ہمارے مہاجر جس حالت میں پاکستان پہنچ رہے ہیں۔ وُہ اس نقشے سے بہت ملتی جلتی ہے۔ ابھی ایک مہاجر لڑکی پاکستان آئی ہے۔ اس کی ہجرت اور پاکستان پہنچنے کی داستان وزیرِ اعظم کے بیان کی تصدیق ہے۔

ایک مہاجر لڑکی

حیدرآباد میں جب بھی پاکستان کا نام سُنتے تو ایسی مسرّت حاصل ہوتی تھی کہ جس کا بیان ممکن نہیں۔ خدا جانے اس لفظ میں کیا سحر تھا کہ سُنتے ہی نشے کی سی حالت طاری ہو جاتی تھی۔ بچہ بچہ پاکستان زندہ باد کے نعرے لگاتا اور پھُولا نہ سماتا۔ پاکستان کی سیر کے لئے دل تڑپتا۔ مگر مجبُوریاں مانع تھیں۔ آخر بربادی نے دلی آرزو کے پُورا ہونے کی شکل پیدا کی جان۔ مال۔ عزت۔ ایمان۔ جب خطرے میں نظر آیا تو چار و ناچار پاکستان کا رُخ کیا۔ حیدرآباد چھوڑتے ہوتے دل کو جو صدمہ ہوا۔ اس سے خدا ہی خوب واقف ہے۔ ذرہ ذرہ دامن کش تھا۔ ہر چیز زبانِ حال سے کہہ رہی تھی کہ صدیوں کا رشتہ آسانی سے نہ ٹوٹے گا۔ جانے کو تو جاؤ۔ مگر قدم قدم پر یادِ وطن ستائے گی۔ میری حالت بھی عجیب تھی چاہتی تھی کہ ہر چیز سے لپٹ لپٹ کر روؤں۔ لیکن یہ سوچ کر کہ کم سِن بچوں کا کیا حال ہوگا آنسو پیتی گئی۔ ہنس ہنس کر سب سے بات کرتی تھی۔ لیکن دل رو رہا تھا۔ اخیر وُہ گھڑی آئی کہ وطن کی سرزمین سے رخصت ہو گئی۔ دل میں

اور دس طرح کی اُلجھنیں اور پریشانیاں پیدا ہوگئیں۔ طرح طرح کے خیالات آتے رہے۔ توبہ استغفار کرتے بمبئی پہنچ گئے۔

بمبئی کی چہل پہل ایک آنکھ نہ بھائی۔ خدا خدا کرکے جہاز پر قدم رکھا۔ تو جان میں جان آئی۔ دُکھ درد کا بوجھ ہلکا ہوتا گیا۔ پاکستان کی قربت مغموم دل کو مسرُور کرتی گئی۔ یہاں تک کہ کراچی آیا تو مسرت کا یہ حال ہوا کہ امّی جان کی جدائی سے جو خلش تھی وہ بھی جاتی رہی۔ تنہا میں ہی مسرور نہ تھی۔ جہاز کے کل مسافروں کی مسرّت کا یہی حال تھا۔ بچے خوشی سے تالیاں بجانے لگے۔ میرا بھانجا اقبال پاکستان زندہ باد کے نعرے لگانے لگا۔ جہاز جیسے جیسے ساحل سے قریب ہونے لگا مسرّتوں کی کوئی انتہا نہ رہی۔ آخر کو وُہ مبارک گھڑی آئی کہ جہاز ساحلِ مُراد سے لگ گیا خوش و خرم شاداں و فرحاں ساحل پر آئے۔ سامان بھی سب جہاز سے آگیا۔ بھائی صاحب کو نگاہوں نے بہت تلاش کیا۔ مگر وہ غائب تھے۔ گھنٹہ بھر کے بعد آتے ہوئے نظر آئے۔ دو ماہ کی جُدائی ایسی معلوم ہوئی جیسے برسوں ہو گئے ہوں سامان جلدی جلدی گاڑیوں پر رکھا گیا۔ دو دن کے لئے ہوٹل میں قیام کیا۔ اور پھر قائد آباد میں آگئے۔ ایک کوارٹر میں ایک ماہ کے لئے جگہ ملی۔ چھوٹے بڑے سب ملا کر چودہ آدمی ہیں۔ عام حالات میں ایسا مکان عذابِ الٰہی معلوم ہوتا لیکن کراچی میں خدا کی سب سے بڑی نعمت پاس پڑوس کی مہاجر خواتین نے اخوتِ اسلامی کا بے مثل نمونہ پیش کیا۔ ایک بہن نے راشن کارڈ کے ملنے تک آٹا عنایت کیا۔ تو دُوسری بہن نے چاول عطا کئے لکڑیاں بھی محلّے سے مل گئیں ایک بہن نے سِل بٹہ دلوایا۔ دو بہنوں نے کھانا پکانے میں مدد دی "تم لوگ سفر سے آرہی ہو تھک گئی ہو گی"۔ یہ بے لوث ہمدردی حیاتِ ملت کی ضامن ہے۔ میں اپنی ہمسایہ بہنوں کی ہمدردی کا شکریہ ادا کرنے سے قاصر ہوں۔ خدا ہر مسلمان کے دل کو ایسا ہی بے لوث اور ہمدرد بنا دے۔ جیسا دل میری ان ہمسایہ مہاجر بہنوں نے پایا ہے۔ میری یہ بہنیں بھی گوناگوں مصیبتوں سے دوچار ہیں۔ پھر بھی خدا کا شکر ادا کرنے کے سوا شکایت کا ایک لفظ نہ سُنا۔ بچوں اور بڈھوں میں یہی تمنّا اور یہی آرزو پائی کہ پاکستان دن دُونی رات چوگنی ترقی کرے۔ میں اس نئی زندگی سے خوش اور بہت خوش ہوں۔ صرف تعلیم کی فکر ہے۔ کالج کھُلا تو ایف۔ ایس سی میں داخل ہو جاؤں گی۔ پھر میڈیکل کالج میں داخلہ کا خیال ہے۔ باعزت خدمت کا بہترین ذریعہ میرے نزدیک یہی ہے کہ انسان طبیب ڈاکٹر ہو۔

انقلابِ عظیم نے مجھ کو یہ سوچنے پر بھی مجبُور کیا ہے کہ میں اپنا بار خود اٹھاؤں۔ غریب بھائی اور بیوہ ماں پہ بار نہ بنوں۔ محلہ کی لڑکیوں کو پڑھا کر کچھ حاصل کروں۔ اور تھوڑا بہت سی کر۔ ٹائپ بھی میں نے حیدرآباد میں سیکھ لیا تھا۔ اگر کوئی ایسا موقعہ آیا تو گھر بیٹھے ٹائپ کا کام مل سکے۔ تو اس سے بھی فائدہ اُٹھاؤں گی۔ کوشش کرنا میرا کام ہے۔ اور کوشش کو کامیاب بنانا پیدا کرنے والے کا۔

کوشش کرنا ہر پاکستانی کا فرض ہے۔ اور یہ خوشی کا مقام ہے کہ اس قسم کی کوششوں میں ہمارے
مہاجر بہت آگے ہیں۔ جس طرح کسی شخص کے دوستوں سے مل کر اس کی طبیعت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے
یا اس کے لباس سے نفاست کا اظہار ہوتا ہے۔ اسی طرح انسان کے جوتوں کو دیکھ کر اس کے کیرکٹر
کے متعلق رائے قائم کی جاسکتی ہے۔ پاکستانی مہاجرین نے فیصلہ کیا ہے کہ پاکستان صرف اپنے
قدموں پر ہی کھڑا نہیں ہوگا۔ بلکہ اپنے جوتوں پر بھی کھڑا ہوگا۔ اور پاکستانیوں کے جوتوں سے ان کے
کیرکٹر کے اعلیٰ معیار کے متعلق دنیا رائے قائم کرسکے گی۔ چنانچہ مہاجر جفت سازوں کی انجمن نے یہ
جدوجہد شروع کردی ہے حسن حبیب سے جوتوں کی نمائش کا حال سنئے۔

پاکستانی جُفت سازوں کی جدّوجہد

جیسے ہی میں نمائش گاہ کے اندر پہنچا میں نے ایک پوسٹر پر لکھا دیکھا۔
"پاکستان میں ہم اپنے پاؤں پر کھڑے ہوچکے ہیں لیکن اب ہمیں اپنے جُوتوں پر بھی کھڑا ہونا چاہیئے"۔ نمائش گاہ میں مختلف
چیزوں کو دیکھنے کے بعد اس بات کا ثبوت مل گیا کہ ہم اپنے پاؤں پر کھڑے ہوسکنے کے لائق جُوتے بنا سکتے ہیں۔
یہاں ہر عمر کے لئے اور ہر وضع کے جُوتوں کے نمونے موجود تھے۔ مختلف چمڑوں مثلاً کروم۔ کڈ وغیرہ مختلف شکلوں
اور نمونوں کے مردانہ جُوتے بھی سامنے رکھے تھے۔ کراچی کے بعض فیشن ایبل حلقوں میں جیسے بھڑکدار جُوتے آج کل
پہنے جاتے ہیں۔ اُن کے بھی یہاں بہت سے نمُونے موجُود تھے۔ جس میں سانپ کے چمڑے کے جُوتے اور کٹ پیٹرن
کے جُوتے زیادہ ممتاز تھے۔

بچّوں کے جُوتے بہت ہی خوشنما تھے۔ ایک جُوتا تو اچھا خاصہ تماشا بنا ہوا تھا۔ اس کی نوک ایک چھوٹی سی بط
کی گردن معلوم ہوتی تھی۔

نمائش میں جتنے اچھے اور عمدہ جُوتے موجود تھے۔ اُن کو دیکھ کر کہیں عوام کو یہ خیال نہ ہو کہ ایسے اچھے جُوتے کسی جادُو کے
زور سے طیار ہو رہے ہیں۔ اس لئے نمائش کا انتظام کرنے والوں نے اس کا یہ بندوبست کیا کہ نمائش گاہ میں شوُروم کے
علاوہ ایک چھوٹی سی فیکٹری کا نمونہ بھی پیش کرنے کی کوشش کی۔ بالکل ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی کو اسکرین پر فلمیں دکھاتے
دکھاتے ایک دم فلم اسٹڈیو میں پہنچا کر یہ بتایا جائے کہ فلم کس طرح تیاّر ہوتے ہیں۔ چمڑے کی تیاری سے لے کر مکمل
جُوتا بنانے تک تقریباً دو درجن کاریگر برآمدوں میں چاروں طرف بیٹھے ہوئے اپنا اپنا کام کررہے تھے۔ یہ کاریگر
نمُونوں کا نشان لگاتے۔ ان کو کاٹتے۔ اوپر کے چمڑوں کو سیتے۔ ان کو فرمے چڑھاتے۔ ان میں کیلیں ٹھونکتے اور پھر تلے لگاتے
نظر آرہے تھے۔ حقیقتاً یہاں ایک گھریلو صنعت اپنے شباب کے عالم میں نظر آرہی تھی۔

اس سلسلے میں سب سے زیادہ قابل لحاظ بات آگرے کے ہوشیار کاریگروں کا ہندوستان کو چھوڑ دینا ہے۔ اور اب یہ تمام لوگ کراچی وحیدرآباد میں آکر آباد ہو گئے ہیں۔ اندازہ یہ ہے کہ آگرے کے ۷۵ فی صدی کاریگر پاکستان آچکے ہیں۔ اِس سلسلہ میں ہم کو یہ بات نہیں بھولنا چاہیئے کہ آگرہ جُوتہ سازی میں مشرق کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ لیکن ان تمام خصوصیات کے باوجود یہ صنعت وہاں ایک گھریلو صنعت ہی کی حیثیت سے زندہ تھی۔ آگرے کے جُوتے سارے ہندوستان میں بلکہ مشرقِ وُسطےٰ اور مشرقِ بعید تک جاتے تھے۔ خود سندھ اور کراچی میں جُوتے سازی کی کوئی صنعت نہیں تھی۔ اور ان مقامات پر آگرے ہی کے جُوتے آیا کرتے تھے۔

آگرے کے مہاجر جوتہ بنانے والے ایک نئی صنعت لے کر یہاں آئے ہیں۔ اور وُہ بہت جلد سندھ اور کراچی میں جہاں تک جُوتے سازی کا تعلق ہے۔ ایک نئے آگرے کی بُنیاد ڈال دیں گے۔

آگرہ میرا وطن ہے اگرچہ میں جُوتے بنانے والا نہیں ہوں لیکن مجھے اپنے وطن کے ان جُوتا بنانے والے مہاجر بھائیوں پر فخر ہے کیونکہ میرے خیال میں یہ دُنیا کے بہترین کاریگروں کی صف میں شمار کیئے جا سکتے ہیں۔ اور ان میں یہ صلاحیت ہے کہ وُہ پاکستان کو اس قابل بنا دیں کہ وُہ ایشیا اور مشرقِ وسطیٰ کے جُوتے کے بازاروں پر آسانی سے قبضہ کرلے۔

پاکستانی بہنوں نے مہاجرین کی آبادکاری کے لئے جو شاندار خدمات انجام دی ہیں۔ ان کا ذکر آپ اکثر سنتے ہیں۔ کراچی کی خواتین مسلم لیگ نے اس سلسلہ میں دُوسری پاکستانی بہنوں کے لئے ایک عمدہ مثال قائم کی ہے۔ اس کی تفصیل آپ کو مسز زاہد سُنائیں گی۔

کراچی خواتین مُسلم لیگ کی سرگرمیاں

خواتین مُسلم لیگ کراچی نے اپنے دفتر میں مہاجر عورتوں کے لئے ایک سلائی کا مرکز قائم کیا ہے۔ جس میں اس وقت ۹۰ خواتین مشین پر مہاجرین کشمیر کے لئے کپڑے سیتی ہیں۔ جن کی یومیہ اُجرت فی کس تین روپیہ ہوتی ہے۔ جو ہر شام کام ختم ہونے پر ادا کر دی جاتی ہے۔ جو عورتیں عمدہ قسم کی دستکاری جانتی ہیں۔ ان کے لئے کارکنان باہر سے بنائی، کڑھائی کا کام حاصل کر دیتی ہیں۔ بہت سی مہاجر خواتین خواہش مند ہیں کہ وُہ کسی آسانی اور سہولیت کی شرائط پر خود مشین خریدیں۔ لہذا خواتین مسلم لیگ نے محکمہ مہاجر آبادکاری سے ۱۰۰ مشینیں خریدیں اور پہلی قسط ستر روپیہ اور باقی تیس روپیہ ماہوار کی آسان قسطوں پر ضرورت مند مہاجر خواتین کو مہیا کیں۔ چھ ماہ میں قسطیں پُوری ہو جانے کے بعد مشین ان کی ملکیت ہو جاتی ہے۔ اور اس طرح وُہ گھروں میں بھی سلائی کا کام اُجرت پر کر کے اپنا اور بچّوں کا پیٹ پال سکیں گی۔

ہر خاتون کو دن میں چھ جوڑے سلائی کے لئے ملتے ہیں۔ اس کا خاص خیال رکھا جاتا ہے کہ ان کی صحت کیسی ہے۔ اور وہ کتنی محنت برداشت کر سکتی ہیں۔ ہر جمعہ کو ایک لیڈی ڈاکٹر ۴ بجے کام کرنے والی عورتوں کا ڈاکٹری معائنہ کرتی ہیں۔ اور ضروری ہدایت ان کی صحت کے متعلق دے جاتی ہیں گذشتہ ہفتہ خواجہ شہاب الدین صاحب نے اس ادارہ کا بمعہ نائب وزیر ڈاکٹر قریشی اور ہاشم رضا صاحب اور کلکٹر کراچی کے معائنہ فرمایا۔ خواجہ صاحب اس کام کو دیکھ کر بے حد متاثر ہوئے۔ آپ نے فرمایا کہ میں یہ دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ کہ کام کاج کے علاوہ مہاجر خواتین کی صحت اور صفائی کی طرف بھی کارکنان خواتین مسلم لیگ نے خاص توجہ دی ہے۔ آپ نے وعدہ فرمایا ہے کہ وہ حتی الامکان مہاجر خواتین کے لئے اس ادارے کی مدد فرمائیں گے۔ اور حکومت سے ادویات وغیرہ دلوائینگے تاکہ ڈاکٹری معائنہ کے بعد ان عورتوں کو دوا مفت دی جا سکے۔ کارکنان خواتین مسلم لیگ کام کرنے والی عورتوں کے بچوں کو دن میں دودھ دینے اور رکھنے کے لئے ایک کلینک دفتر میں کھول رہی ہیں۔ تاکہ کام کے دوران میں شیر خوار بچوں کا علیحدہ کمرہ میں دودھ اور سلانے کا انتظام ہو سکے۔ اور مائیں اطمینان اور بے فکری سے اپنے کام کو جاری رکھ سکیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے ان مہاجر جلاہوں کا بھی بہت خیال رکھا ہے جس کے لئے خواتین شکریے کی مستحق ہیں۔ یہ جولاہوں کے وہ خاندان ہیں جو اٹاوہ میں آباد تھے۔ اور اب کراچی آ گئے ہیں۔ کلیٹین روڈ پر ان جولاہوں کو حکومت نے کچھ زمین دے دی ہے جس پر انہوں نے جھونپڑیاں بنائی ہیں۔ ان کے یہ گھر نہایت صاف اور ستھرے ہیں۔ انہوں نے اسی حصہ میں اپنے بچوں کے لئے اسکول بھی بنایا ہے۔ ہر جھونپڑی میں کھڈیاں لگی ہوئی ہیں۔ اور ان کے گھر کی ہر عورت حتیٰ کہ بارہ بارہ سال کی لڑکیاں کھڈیوں پر کپڑا بنتی ہیں۔ اور فی کس دن میں عمدہ سوسی وغیرہ ۱۹ گز تک تیار کر لیتی ہیں۔ کچھ روز ہوئے بیگم لیاقت علی خان صاحب اور بیگم شہاب الدین صاحب نے خود جا کر ان جولاہوں کے کام کا معائنہ کیا۔ اور ان کی ہمت افزائی فرمائی یہ جولاہے عمدہ کاریگر ہیں۔ اگر ان کو باریک کتا ہوا سوت یا ریشم دیا جائے تو یہ لوگ بہترین قسم کا کپڑا بنا سکتے ہیں۔ ہم سب کو چاہیئے کہ ان لوگوں کی زیادہ سے زیادہ مدد کریں تاکہ یہ لوگ پاکستان کے واسطے مفید ثابت ہوں۔ اگر ہم لوگ ان کے ہاتھ کی بنی ہوئی چیزیں استعمال کرنا شروع کر دیں تو یقین ہے کہ ان غریبوں کا بھی پیٹ پل جائے گا اور پاکستان کو بھی فائدہ ہوگا۔ خداوند کریم ہم کو یہ توفیق دے کہ ہم پاکستان کی بنی ہوئی چیزوں کا استعمال کریں تاکہ پاکستان کسی کا دستِ نگر نہ رہے۔

پاکستان کو پاکستانی بہنوں پر ناز ہے۔ کہ یہ مصیبت کے وقت مہاجرین کی آبادکاری اور بحالی میں اس شدومد سے حصہ لے رہی ہیں۔

لندن کے مسلمانوں کی ہمدردی

اس ہفتے کراچی میں پاکستان مغربی پنجاب کی مہاجرین کونسل کے اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے وزیر اعظم آنریبل مسٹر لیاقت علی خاں نے مہاجرین کے متعلق جو لفظ ارشاد کیے ہیں۔ انہیں سنکر ہر ایک مہاجر کا فخر سے سر بلند ہو جاتا ہے۔ مسٹر لیاقت علی خاں نے فرمایا تھا۔

اگر آج ہم مغربی پاکستان میں تجارت۔ کاروبار صنعت و حرفت پر مسلمانوں کا قبضہ دیکھ رہے ہیں تو اس کی اصلی وجہ مہاجرین کی محنت و کوشش ہے۔

پاکستان بننے کے بعد واقعی مہاجرین نے زندگی کے ہر شعبہ میں اپنی محنت و کوشش سے ایک بلند جگہ پیدا کر لی ہے۔ اور اب مہاجرین پاکستان کے کندھوں پہ ایک بوجھ نہیں رہے۔ بلکہ پاکستان کی دولت اور سرمایہ بن گئے ہیں۔ مسٹر لیاقت علی خاں کے اس بیان سے تمام مہاجرین کی ہمتیں پہلے سے دوچند بلکہ دہ چند ہو گئی ہیں۔ اور مہاجرین کو اطمینان ہے کہ ہمارے وزیر اعظم نے ان کی خدمات اور قربانیوں کی جن شاندار لفظوں میں قدر کی ہے۔ اس سے ان کی آبادکاری کے مرحلے اور بھی جلد طے ہو جائیں گے۔

مسٹر لیاقت علی خاں ۱۹ اپریل کو دولتِ مشترکہ برطانیہ کے بلانے پر لندن روانہ ہو گئے۔ جہاں تمام وزیر اعظم مل کر بہت ضروری مشورہ کریں گے۔ لندن میں وزیر اعظم کی مصروفتیں بے حد ہوں گی۔ مگر ہمیں یقین ہے کہ جس طرح پچھلی بار لندن اور قاہرہ میں وزیر اعظم نے مہاجرین کو نہیں بھلایا تھا۔ اور ان کا ذکر تمام دنیا کے سامنے کیا تھا۔ اسی طرح اب کی دفعہ بھی مہاجرین کو یاد رکھیں گے۔

لندن کے بسنے والے مسلمانوں کو مہاجرین سے جو ہمدردی ہے۔ اس کا حال ہمیں ڈان اخبار کے لندن کے نمائندے مسٹر فرید جعفری نے یوں سنایا ہے۔

لندن کے مسلمان اور مہاجر

میں ۳۱ مارچ کو لندن سے آیا۔ ارادہ یہ کر کے آیا تھا کہ چند گھنٹوں کے بعد واپس چلا جاؤنگا۔ صبح ہوتے ہی

خیال بدلنا پڑا۔ کراچی کے چمکتے ہوئے سورج کی خیرہ کن روشنی میں آپ کے خیمے نظر پڑے۔ سڑکوں پر آپ کو چلتے پھرتے دیکھا۔ دکانوں پر آپ کو سوداگر اور خریدار دونوں حیثیتوں سے پایا۔ قائدِ اعظم مرحوم کے مزار پر آپ کو بیٹھے دیکھے۔ میں خود صوبہ متحدہ کا باشندہ ہوں۔ تین برس سے لندن میں آپ کی اور آپ کے نئے وطن کی خدمت میں مبتلا۔ وطن ہولی جو ہوائی جہاز مجھے واپس لیجانے والا تھا۔ وہ واپس گیا اور میں آپ کے ساتھ چند دن گزارنے کے لئے رک گیا۔ میں اس موقعہ پر آپ کی خدمت میں آپ کے لندنی بھائیوں کی طرف سے سلام عرض کرتا ہوں اور یقین دلاتا ہوں کہ انگلستان کے دس ہزار پاکستانی آپ کو بھولے نہیں ہیں۔ ان میں سے زیادہ تعداد خود مہاجر ہے۔ انگلستان کی سردی نے ان کے ہاتھ پیر ٹھٹھرا دیئے ہیں۔ مگر ان کے دل سرد نہیں ہوئے ہیں۔ اسلام کی حرارت اور وطن کی محبت نے ان کو آپ کی مدد کے لئے ہندوستان کے کربلائی واقعات کے خیال نے ہی سرگرم کار رکھا ہے۔

جس وقت لندن میں خبر پہنچی کہ دلی اُوجڑ گئی۔ مسلمان پھر لُٹ گئے۔ جس وقت ہم نے آپ سے آٹھ ہزار میل کی دوری پر یہ سُنا۔ پنجاب کی تقسیم ہو گئی۔ اور مشرقی پنجاب کے مسلمانوں کے بے سر و سامان قافلے بھی صحیح و سلامت پاکستان کی پناہ میں نہ پہنچ سکے۔ ہمارے دل ہل گئے۔ یقین مانئے کہ لندن کے پاکستانی سوداگر، ہندوستانی مسلمان۔ اور ان کی انجمنیں۔ اور ہمارے انگریز دوست اس وقت تک بے چین اور بے قرار رہے۔ جب تک کہ ان کے آنسوؤں سے لندن اور دوسرے شہروں کی مسجدیں بھیگ نہ گئیں۔

بے شمار جلسے کئے گئے۔ جلوس نکلے۔ اور ہر مسلمان نے آپ کے لئے اپنے پروردگار سے دعائیں مانگیں۔ برطانیہ کی مسلم لیگ نے چندے کے لئے اپیل کیا۔ لندن میں مشرقی پاکستان کی مسجد میں پہلا جلسہ ہوا۔ دس ہزار پونڈ (ایک لاکھ تیس ہزار روپیہ کے لگ بھگ) جمع ہوئے جو آپ کی مدد کے لئے قائدِ اعظم کی خدمت میں پہنچ گئے۔ اس کے بعد انگلستان۔ اسکاٹ لینڈ۔ ویلز اور آئر لینڈ کے دوسرے شہروں میں جہاں آپ کے بھائی یا تو کاروبار کر رہے ہیں یا تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ جلسے ہوئے۔ اور چندے جمع کئے گئے۔ انجمن جمعیت المسلمین کی طرف سے گرم کپڑے اور کمبل جمع کئے گئے۔ اور خریدے گئے۔ پہلے پندرہ روز کے اندر ہی ۳ ہزار کمبل پاکستان کے ہائی کمشنر کے ذریعے بھیجے گئے۔ یہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔ لندن کی پانچ مسجدیں اور دوسرے اضلاع کی مسلمان انجمنیں اس سلسلہ میں اب تک کام کر رہی ہیں۔

یہ تو مختصر کہانی ہے۔ اُن مسلمانوں کے تڑپتے دل کی جن کا حکومت سے تعلق نہیں ہے۔ حکومتِ پاکستان کے لندنی نمائندے حبیب ابراہیم رحمت اللہ اور ان کی بیگم کی مساعی بھی اس سلسلہ میں کم نہ رہیں۔ بیگم نے برطانوی وزیر اعظم مسٹر اٹیلی کی بیگم صاحبہ کی سرپرستی میں ایک نمائش سینٹ جیمز پیلس میں کی جس میں مسلمان اور انگریز عورتوں نے بڑا کام کیا۔ کئی ہفتوں کی محنت کے بعد پاکستانی آرٹ، کشیدہ کاری، پوشاک، اور سامان زیبائش و آرائش کی

بڑی کامیاب نمائش ہوئی۔ تین چار ہزار روپے جمع ہوئے۔ جو آپ کی خدمت میں بھیجے گئے۔ لندن کے ایک مشہور تھیئٹر میں بیگم رحمت اللہ نے ایک مجلسِ سرود منعقد کی جس میں ہر آرٹسٹ کی خدمت مفت حاصل ہوئی تھی دو گھنٹہ تک تماشہ ہوتا رہا مگر بھیگے آنسوؤں کی گود میں پانچ ہزار روپیہ کی رقم ملی۔ عالمِ اسلام کے سب سے بڑے اسلامی مرکز نے اب ایک کلچرل سنٹر پر بیگم رحمت اللہ نے ایک بڑی نمائش بھر کی۔ جو بہت کامیاب رہی۔ جس میں پھر تین چار ہزار روپیہ کی آمدنی ہوئی۔ ہائی کمشنر نے برطانوی ریڈ کراس کمیٹی کو مدد پر آمادہ کیا۔ چند اور انگریزی انجمنوں نے بھی تھوڑی بہت رقمیں جمع کیں۔ اور پاکستان بھیجیں۔ کچھ دن ہوئے سیو دی چلڈرن فنڈ نام کی ایک انجمن نے ایک جلسہ کیا۔ جس میں انہوں نے ہائی کمشنر کو پاکستانی بچوں کے لئے بیس ہزار روپیہ کے رنگ برنگے مالیت کے گرم کپڑے اور کمبل نذر کئے۔ انجمن نے وعدہ کیا کہ وہ اور بھی کپڑا جمع کرے گی۔ اور پاکستانی مہاجرین کو بھیجے گی۔

میرے بھائی ہمت نہ ہاریئے۔ ہمیں خدا کا شکر ادا کرنا چاہئے۔ کہ ہم زندہ ہیں۔ ہماری قوم زندہ ہے۔ اور ہماری سرزمین سے اسلام کی کرنیں پھر اُٹھ رہی ہیں۔ سارا عالمِ اسلام امید کی نگاہوں سے ہماری طرف دیکھ رہا ہے۔ جب تک ہم مسلمان ہیں دنیا کی کوئی طاقت ہمیں نہیں مٹا سکتی۔

نذرِ اقبال

۲۱- اپریل ۱۹۴۹ء

اس ہفتے مشرق و مغرب کے اکثر ملکوں میں پاکستانی یومِ اقبال منا رہے ہیں۔ اُسی اقبال کی یاد میں کہ جس نے پاکستان کا سب سے پہلے خواب دیکھا۔ پاکستان کی حقیقت بننے کے بعد ہم سب آج اقبال کی خدمت میں خراجِ عقیدت پیش کر رہے ہیں۔ اور اسی مناسبت سے مہاجرین کے پروگرام کو آج اقبال سے منسوب کیا جاتا ہے۔

پہلی آواز:۔ ۱۴- اگست ۱۹۴۷ء سے ہماری زندگی کا ایک نیا باب کھلا۔ ۲۰۰ برس سے محکومیت کی چکی کے پاٹوں میں پسنے والا مسلمان آج آزاد تھا۔ مگر افق پر چاروں طرف کالے کالے بادل چھا رہے تھے آزادی کے چراغ کو بجھانے کے لئے خوفناک آندھیاں چل رہی تھیں۔ ظلم و تشدد کی بجلیاں کوند رہی تھیں۔ اور ساری فضا انسانی درندگی کی ہولناک چنگھاڑوں اور مظلومیت کی سسکیوں سے گونج رہی تھیں۔ اس تیرہ و تاریک فضا میں مہاجرین کے قافلے پاکستان کی منزلِ مقصود کی طرف بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ بوڑھی عورتیں اور مرد۔ شیر خوار بچے باپردہ عورتیں۔ اور بھوک سے نڈھال جوان۔ پاکستان کی سمت ٹکٹکی باندھے دیکھ رہے تھے۔

دوسری آواز (عورت) کئی دن سے ہمارے گاؤں میں کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ آس پاس کے دیہات سے خوفناک خبریں چلی آتی تھیں۔ میں پاکستان جانے سے پہلے چند روز کے لئے اپنے گاؤں میں رشتہ داروں سے ملنے آئی تھی۔ ایکا ایکی خبر ملی کہ ہمارے گاؤں پر حملہ ہونے والا ہے۔ پہلے ہم سمجھتے تھے کہ ہم محفوظ ہیں۔ مگر جنگل کی آگ کونہ کونہ کی خبر لیتی ہے۔ جب خطرہ بالکل سر پر آن پہنچا۔ تو گھبرا کر ہم سب اپنے گاؤں سے نکل پڑے۔ عجب سراسیمگی کا عالم تھا۔ کسی کو کسی کا ہوش نہیں رہا۔ ہر طرف نفسی نفسی مچی ہوئی تھی البتہ اتنا

ہر شخص جانتا تھا کہ ہمیں صرف پاکستان میں پناہ مل سکتی ہے۔ چنانچہ پاکستان کی سیدھ میں ہم سب روانہ ہو گئے۔

تیسری آواز (عورت) اتنے میں زور کی بارش ہونے لگی۔ مگر ہم میں سے کسی کو بھیگنے کا احساس بھی نہیں ہوا ہم سب تھک کر چور چور ہو چکے تھے۔ صبح ہوتے ایک فوجی کیمپ نظر پڑا۔ تو جان میں جان پڑی۔ ہم سب اسی کیمپ کی حفاظت میں ٹھہر گئے۔ مگر وہاں رہنے کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ ہم سب زمین پر بیٹھ گئے۔ میرے قریب ہی ایک خاتون بیٹھی تھیں جو ہم سب کو ضبط و صبر کی تلقین کر رہی تھیں۔ ان فرشتہ خصال خاتون کی باتوں سے ہماری دنیا ہی بدل گئی۔ پہلے ہر شخص اپنی اپنی مصیبت کا رونا رو رہا تھا۔ مگر یہ باہمت عورت ان سب کو تسکین اور تسلی دے رہی تھیں۔ اور جب کبھی دوسروں کو تسلی دینے سے انہیں فرصت ملتی۔ تو یہ گنگنانے لگتیں۔ مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے پوچھ ہی لیا کہ آپ کیا گنگنا رہی ہیں۔ ہمیں بھی تو سنائیے۔ تاکہ ہمارا بھی تو غم غلط ہو۔ ہنس کر کہنے لگیں۔ میں خود تو کچھ نہیں کہتی۔ شاعرِ مشرق کے کلام سے لطف لیا کرتی ہوں۔ یہ اشعار میں کئی بار پڑھ چکی تھی۔ لیکن موجودہ حالات میں ان اشعار نے جو لطف دیا ہے۔ وہ بیان نہیں کر سکتی۔ بار بار پڑھتی ہوں مگر سیری نہیں ہوتی۔ لو تم بھی سنو:۔

گو سراپا کیفِ عشرت ہے شرابِ زندگی ۔۔۔ اشک بھی رکھتا ہے دامن میں سحابِ زندگی

موجِ غم پر رقص کرتا ہے حبابِ زندگی ۔۔۔ ہے الم کا سورہ بھی جزوِ کتابِ زندگی

ایک بھی پتی اگر کم ہو تو وہ گل ہی نہیں

جو خزاں نادیدہ ہو بلبل، وہ بلبل ہی نہیں

آرزو کے خون سے رنگیں ہے دل کی داستاں ۔۔۔ نغمۂ انسانیت کامل نہیں غیر از فغاں

دیدۂ بینا میں داغِ غم چراغِ سینہ ہے ۔۔۔ روح کو سامانِ زینت آہ کا آئینہ ہے

حادثاتِ غم سے ہے انساں کی فطرت کو کمال ۔۔۔ غازہ ہے آئینۂ دل کے لئے گردِ ملال

غم جوانی کو جگا دیتا ہے لطفِ خواب سے ۔۔۔ ساز یہ بیدار ہوتا ہے اسی مضراب سے

طائرِ دل کے لئے غم شہپرِ پرواز ہے ۔۔۔ راز ہے انساں کا دل غم انکشافِ راز ہے

غم نہیں غم روح کا اک نغمۂ خاموش ہے

جو سرودِ بربطِ ہستی سے ہم آغوش ہے

چوتھی آواز:۔ لاہور کیمپ میں پہنچ کر ہماری جان میں جان آئی۔ گھر جیسا آرام تو کہاں میسر آ سکتا تھا۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ اب ہم پاکستان میں ہیں۔ اور جان کا خوف نہیں تھا۔ اس پریشانی اور سراس کے بعد کیمپ کی زندگی

ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے جنت میں آ گئے۔ انسانی فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ یہ کبھی خاموش نہیں رہتی۔ اب ہمیں زندگی کی جدوجہد کے راستے تلاش کرنے پڑے۔ جو ملازمت کر سکتے تھے انہوں نے ملازمت کی تگ و دو کی۔ جو کاشتکاری کرنی جانتے تھے۔ انہیں زمینوں کی تلاش ہوئی۔ صناعوں اور دستکاروں نے اپنے لئے اور راستے ڈھونڈے۔ زندگی کی ہماہمی کیمپ میں پورے جوش سے نمایاں تھی۔ اور حیرت ہوتی تھی کہ تباہی و بربادی کے باوجود انسان فطرت کے تقاضے سے مجبور ہو کر کس طرح مستقبل کے لئے کوشاں رہتا ہے کیمپ میں ہر وقت یہی ذکر رہتا ہے۔ کہ اب کیا ہوگا۔ ایک دن اسی قسم کی باتیں ہو رہی تھیں کہ ایک صاحب نے شعر و شاعری کا ذکر چھیڑ دیا۔ اور کہنے لگے۔ کل میں نماز جمعہ پڑھنے شاہی مسجد گیا تھا۔ نماز کے بعد اقبال کے مزار پر پہنچا۔ تو ایک صاحب کو یہ اشعار پڑھتے سنا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے اقبال نے یہ اشعار اس ہنگامے کے لئے لکھے تھے۔ سب نے ایک زبان ہو کر پوچھا کونسے اشعار :-

ختم ہو جائے گا لیکن امتحاں کا دور بھی
ہیں پس نہ پردۂ گردوں ابھی دَور اور بھی

سینہ چاک اس گلستاں میں لالہ و گل ہیں تو کیا
نالہ و فریاد پر مجبور بلبل ہیں تو کیا

جھاڑیاں جن کے قفس میں قید ہے آہ خزاں
سبز کر دے گی انہیں بادِ بہار جاوداں

شامِ غم لیکن خبر دیتی ہے صبح عید کی
ظلمتِ شب میں نظر آئی کرن امید کی

پانچویں آواز:- مغربی پنجاب کے دیہات میں مہاجرین کے قافلے پہنچنے لگے۔ انصار نے مہاجرین کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ بے پناہ مہاجرین کو گھر اور مکان ملنے لگے۔ اداس چہروں پر خوشی اور مسرت چمکنے لگی۔ مکتبوں اور مدرسوں میں بچوں نے سبق پڑھنے شروع کئے۔ کھیتوں پر کاشتکاروں نے ہل چلائے۔ کارخانوں اور ملوں سے دھواں نکلنے لگا۔ زندگی کی رفتار میں تیزی آئی۔ مگر دل میں اس چوٹ کی سِسک اب تک موجود تھی۔ اور ہماری زبان پر اقبال کے یہ شعر تھے :-

جن کے ہنگاموں سے تھے آباد ویرانے کبھی
شہر ان کے مٹ گئے۔ آبادیاں بَن ہو گئیں

سطوتِ توحید قائم جن نمازوں سے ہوئی
وہ نمازیں ہند میں نذرِ برہمن ہو گئیں

دہر میں عیش دوام آئین کی پابندی سے ہے
موج کو آزادیاں سامان شیون ہو گئیں

خود تجلی کو تمنا جن کے نظاروں کی تھی
وہ نگاہیں ناامیدِ نورِ ایمن ہو گئیں

اُڑتی پھرتی ہیں ہزاروں بلبلیں گلزار میں
دل میں کیا آئی کہ پابندِ نشیمن ہو گئیں

وسعتِ گردوں میں تھی ان کی تڑپ نظارہ سوز
بجلیاں آسودۂ دامانِ خرمن ہو گئیں

اشکِ پیہم سے نگاہیں گل بداماں ہو گئیں دیدۂ خونبار ہو منت کشِ گلزار کیوں
شامِ غم لیکن خبر دیتی ہے صبحِ عید کی
ظلمتِ شب میں نظر آئی کرن امید کی

شاعرِ مشرق اقبال کی خدمت میں یہ ہدیۂ عقیدت مہاجرین کی طرف سے پیش کیا جا رہا تھا۔ اس پروگرام میں حصّہ لینے والی بہنیں اور بھائی تمام مہاجر تھے۔ اس ہفتے پاکستانیوں نے دنیا کے ہر حصّے میں ہفتۂ اقبال منایا ہے۔ اور ہر مہاجر کو فخر ہے کہ ہم نے بھی اس یادگار میں حصہ لیا۔

یہ لاہور ہے

(۲۸ اپریل ۴۹ء)

یہ لاہور شہر ہے مغربی پنجاب کا پایۂ تخت اور پاکستان کا دل۔ پاکستان بننے سے پہلے ہی اِس صُوبہ میں فساد کی آگ بھڑک اٹھی تھی۔ اور ۱۴ اگست کے بعد تو اس شہر کے در و دیوار نے وُہ نقشے دیکھے ہیں کہ ان کے تصوّر سے رُونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔

لاہور شہر سے چند میل کے فاصلے پر واہگہ کا علاقہ ہے جو پہلے گمنام تھا۔ مگر اب ہر مہاجر کی زبان پر اس کا نام ہے۔ یہی وُہ جگہ ہے کہ جہاں سے پاکستان کی سرحد شروع ہوتی ہے۔ مگر پاکستان کی سرحد میں داخل ہونے سے پہلے ۷ لاکھ مہاجرین کو کیسی خطرناک منزلیں طے کرنی پڑیں۔ اس کا حال اب تاریخ کا جُز بن گیا ہے۔ ۱۴ اگست کے بعد مہاجرین کے قافلے۔ مہاجرین کی اسپیشل گاڑیاں اور مہاجرین کے ہوائی جہاز لاہور پہنچ رہے تھے۔ اور لاہور شہر کی مہمان نواز سرزمین اِن مہاجرین کو اپنے دل میں جگہ دے رہی تھی۔ لاہور آنے والے مہاجرین بُھوک پیاس اور تھکن سے نڈھال تھے۔ کیونکہ بہت دُور سے چل کر یہاں آئے تھے۔ ایک مہاجر بھائی بیان کرتے تھے۔

یہ ۷ ستمبر ۱۹۴۷ء کی سہ پہر کا ذکر ہے۔ کرفیو لگے ۲۴ گھنٹے ہو چکے تھے۔ کہ یکایک برابر والے محلّے کِشن گنج میں جہاں مشترکہ آبادی تھی شور غل سُنا۔ اور لوگوں نے ایک دُوسرے پر پتھر برسانے شروع کئے۔ اور دُوسرے ہی لمحہ آگ برستی ہوئی معلوم ہوئی۔ نتیجہ کے طور پر متعدد جگہ آگ لگ گئی جو ہمارے مکان سے صاف نظر آرہی تھی۔ آگ پر پُوری طرح قابُو ہی نہ پایا جا سکا تھا۔ کہ گولیوں کی بُوچھاڑ کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اور ایک سلسلہ کہ اللہ کی پناہ۔ جو تھمنے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔ جب ہمارے مکان کے بالکل سامنے سے ہمیں بھی گولیوں کا نشانہ بنانے کی کوشش کی گئی تو میں نے خیال کیا کہ یہ صرف حفظِ ماتقدّم ہے۔ جی ہاں حفظِ ماتقدّم

پھر تھوڑی ہی دیر بھی گزرنے نہ پائی تھی کہ میری تمام خوش فہمیوں نے دم توڑ دیا۔ جب کہ ہمارے ہی مکان کو نذرِ آتش کر دیا گیا۔ جب آگ بجھانے کی کوشش کرتے تب ہی گولیوں کی بوچھاڑ ہوتی۔ اس پر بھی جب کسی نہ کسی طرح آگ پر قابو پا لیا۔ تو اشک آور گیس بھی چھوڑی گئی۔ بخیر خدا خدا کر کے صبح ہوئی۔ سو پرانے قلعے چلنے کی ٹھانی۔ جو اس وقت ریفیوجی کیمپ کی صورت اختیار کئے ہوئے تھا۔ مگر قلعہ تک پہنچنا بھی تو جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا۔ ملٹری ٹرک والے سے کہا گیا کہ بھئی ہمیں قلعہ تک پہنچا دو۔ تو ذاتِ شریف نے جواب دیا۔ چلئے مگر کیا یہ آپ کو معلوم ہے کہ آج کل پٹرول کے ایک گیلن کی قیمت دو سو روپیہ ہے دو سو۔ میرے خیال میں ٹرک والا بھی خیال کر چکا تھا کہ ان لوگوں کے جسم سے خون کا آخری قطرہ تک بھی نچوڑ لیا جائے۔ اس قدر رقم خرچ کر کے قلعہ پہنچنے پر قلعے کا اور ہی نقشہ نظر آیا۔ تمام قلعہ بے ترتیب جھونپڑوں اور چھپروں سے پُر تھا۔ یہاں امیر و غریب اپنا سر چھپائے بیٹھے تھے۔ وہ خواتین جن کی جھلک چشمِ فلک نے بھی نہ دیکھی تھی۔ آج بے پردہ ان جھونپڑیوں میں سر چھپانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ علاوہ ازیں نہ کھانے کا انتظام نہ پانی کا البتہ پاکستان بذریعہ ہوائی جہاز کھانا بھیجتا رہا۔ مگر تقریباً ایک لاکھ آدمیوں کے لیے ہوائی جہاز سے خوراک بھیجنا کون سا آسان کام تھا۔ ہم پاکستان کی مشکلات سے بھی واقف تھے اور جانتے تھے کہ پاکستان کو حیات و موت کی کشمکش میں مبتلا ہونے کے باوجود ہمارا خیال ہے۔ یہ خیال کر کے ہم خوشی سے پھولے نہ سماتے تھے۔ اور دعائیں مانگتے تھے کہ جلد از جلد اس گوشۂ عافیت میں پہنچ جائیں۔ قلعہ میں ہی ہمیں معلوم ہوا کہ ہماری دوکان و گودام جس میں ہزاروں روپیہ کا سامان تھا لوٹ لی گئی ہیں۔ اور صرف لوٹ ہی نہیں لی گئیں بلکہ آگ لگا کر مٹی کا ڈھیر بنا دی گئی ہیں۔ یہ خبر وحشت اثر سن کر ایک دھکا تو ضرور لگا۔ مگر نہ جانے کیوں پاکستان کی ایک ایسی دھن سوار تھی۔ کہ جسے صرف محسوس کیا جا سکتا تھا۔ اور بیان کرنا تو شاید اب بھی ممکن نہیں۔ اسی دوران میں قلعہ سے مہاجرین کی اسپیشل ٹرینیں چلنی شروع ہو گئیں۔ اور ان گاڑیوں میں مسافروں کے ساتھ اغیار نے جو جو سلوک کئے کسی سے مخفی نہیں۔ میں بھی ان چند سخت جانوں میں سے ہوں جو اس قسم کی گاڑی سے پاکستان پہنچے۔ وہ سفر جو صرف بارہ گھنٹہ کا تھا۔ ۲۷ گھنٹہ میں ختم ہوا۔ اور وہ بھی جانتے ہو کیسے۔ کہ نہ کھانے کو دانہ مل سکا اور نہ پینے کو پانی۔

۱۷ اکتوبر کی شام تھی۔ جب کہ ہماری گاڑی واگہ عبور کر کے پاکستان داخل ہوئی۔ اب میں اسی پاکستان میں تھا جسے بہت کچھ کھو کر پایا تھا۔ یہاں آ کر سب سے پہلے جو مسئلہ درپیش تھا وہ خود کمانے اور حکومت کے سر بوجھ نہ بننے کا تھا اس کیلئے کوشش کی گئی۔

مگر مجھے آج یہ کہتے ہوئے شرم محسوس ہوتی ہے۔ کہ مجھے اس دوران میں چند تلخ تجربے ہوئے ہیں کئی بار

سخت رنج پہنچے مگر میں یہ کہہ کر خاموش ہو جاتا۔ کہ زمانۂ انقلاب میں ایسی بے اعتدالیاں کہاں نہیں ہوتیں۔ خود غرض اور غدار کہاں نہیں پائے جاتے۔ اور اب مجھے یہ کہتے ہوئے مسرت ہوتی ہے کہ اس قدر جلدی حالات کافی تبدیل ہو چکے ہیں میں خدا کے فضل اور چند نیک پُرخلوص برادران کی مدد سے لاہور میں اپنی حیثیت کے مطابق تجارت کر رہا ہوں۔ اور میرا اکلوتا بچہ ایک اچھے عہدہ پر حکومتِ پاکستان کا ملازم ہے۔ میں آج یہ کہتے ہوئے فخر محسوس کرتا ہوں کہ میں اور میرا بیٹا ہر طرح اپنی حکومت کی خدمت کر رہے ہیں۔ اور اس حکومت کے لئے جس سے ہماری موت اور زندگی وابستہ ہے۔"

ہر مہاجر کے دل میں یہی جذبہ کار فرما تھا کہ ہم پاکستان کی خدمت کریں۔ اس پر بوجھ نہ بنیں۔ مہاجر آ رہے تھے۔ اور کیمپوں میں انہیں داخل کیا جا رہا تھا۔ مشرقی پنجاب اور مشرقی پنجاب کی ریاستوں کی داستان ان مہاجروں نے اپنے خون سے لکھی تھی ریاست کپورتھلہ کے ایک خاندان پر یہ مصیبت گزری:—

'ان ایام میں ایک چھکڑا گاڑی کپورتھلہ کے سٹیشن پر آئی۔ بذریعہ منادی ہر خاص و عام کو اطلاع دی گئی کہ جو لوگ پاکستان جانا چاہتے ہیں اس گاڑی میں سوار ہو جائیں۔ لوگ ہزاروں کی تعداد میں آن کی آن میں اس گاڑی میں سوار ہو گئے۔ اور میں بھی سوار ہو گیا۔ کپورتھلہ سے لاہور ۷ روز میں گاڑی پہنچی۔ راستہ میں جن مصائب کا مقابلہ کرنا پڑا وہ بیان سے باہر ہیں۔ صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ یہ ایام قیامت کا نمونہ تھے۔

میں جس وقت لاہور پہنچا ہوں تو میرے بدن پہ ۲ کپڑے تھے۔ اور ۳-۴ آنہ نقد تھے۔ سارا سامان وغیرہ لُٹ چکا تھا مگر ایک مسرت ضرور ساتھ تھی۔ یہ وہ مسرت تھی جو ایک پھانسی پائے ہوئے ملزم کو بری ہوتے وقت ہوتی۔ لاہور کے اسٹیشن کے باہر جب دیکھا تو پاکستان گورنمنٹ نے کھانے۔ سواری۔ رہائش کا کافی انتظام کیا ہوا تھا اور جب میری نظر انصار پر پڑی تو ان کے دلوں میں بھی ہمدردی۔ محبت۔ مہمان نوازی کا جذبہ پایا۔ انہوں نے مہاجروں کے لئے جابجا کھانے کا انتظام کر رکھا تھا۔ جو قابلِ تعریف تھا لیکن یہ جذبہ جُوں جُوں وقت گزرتا گیا کم ہوتا گیا۔ میں راستہ کی تکلیفوں اور سات روز کھانا نہ ملنے کی وجہ سے کمزور ہو چکا تھا اور کسی سے پہچانا نہ جاتا تھا اور حلیہ بگڑ چکا تھا۔ ایک رات مسجد میں کاٹی۔ دوسرے دن ایک عزیز کے گھر مقام کیا۔ تیسرے روز میرے بال بچے اہل و عیال جالندھر چھاؤنی کیمپ سے لاہور آ گئے۔ ان کے پاس سوائے ایک کپڑوں کے بکس کے اور کچھ نہ تھا۔ کپڑوں کو فروخت کر کے خورد و نوش کا سامان مہیا کیا۔ اس کے بعد روزگار کی تلاش میں نکلا۔ ۱۰-۱۲ روز کی مسلسل کوشش سے والٹن کیمپ میں محکمہ رجسٹریشن میں جونیئر کلرک نوکر ہو گیا۔ تنخواہ ملنی شروع ہوئی۔ تو صرف کھانے کا گزارہ ہوتا رہا۔ اور ضروریات روک لی گئیں اس کے بعد مکان کے الاٹمنٹ کا مسئلہ درپیش ہوا۔ بڑی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ آخر کار ایک جگہ نصیب ہوئی۔۔

شروع شروع جس وقت بندہ والٹن کیمپ میں ملازم ہوا۔ تو والٹن کیمپ میں ہیضہ کی وبا پھیلی ہوئی تھی۔ اس سے بہت جانیں تلف ہوئیں۔ روزانہ ہزاروں کی تعداد میں موتیں ہو جاتی تھیں۔ پناہ گزین والٹن کیمپ میں بڑی خستہ حالت میں داخل ہوتے تھے۔ گورنمنٹ پاکستان نے ان کے لیے کافی سہولتیں مہیا کر رکھی تھیں خوراک۔ رہائش۔ کپڑوں کا انتظام۔ بیماروں کے لئے ہسپتال۔ کمزوروں کے لئے روزانہ کافی مقدار میں دودھ ملتا تھا۔ البتہ صفائی وغیرہ سے گورنمنٹ مجبور تھی۔ ٹرانسپورٹ کا کافی انتظام تھا۔ ہزاروں کی تعداد میں روزانہ پناہ گزین کیمپ میں داخل ہوتے تھے۔ اور ہزاروں کی تعداد میں لوگ برائے آباد کاری باہر بھیج دیئے جاتے تھے۔ ۵½ ماہ کے بعد محکمہ رجسٹریشن تخفیف ہو گیا۔ میرے لڑکے نے سوڈا واٹر فیکٹری الاٹ کر رکھی تھی۔ میں بھی اس میں شامل ہو گیا۔ کوٹہ چینی اور گیس وغیرہ حاصل کرنے میں مشکلات پیش آئیں۔ بڑی محنت کی۔ کچھ فیکٹری چلی کچھ نہ چلی۔ اتنے میں کسی نے جھوٹی شکایت کر دی فیکٹری مہر بند کر دی گئی۔"

لاہور پہنچ کر ہر مہاجر کی زبان پر الاٹمنٹ کا لفظ تھا۔ اور حکومت نے بھی ہر ممکن طریقے سے ان کی مدد کا انتظام کیا تھا۔ چنانچہ شہر شہر بیت المال کھل گئے تھے۔ جہاں سے مہاجرین کی امداد یوں ہوتی تھی:۔

حکومت نے جب لاہور میں بیت المال کھولا۔ تو اس میں گرہستی کی قریب قریب ہر چیز تھی۔ برتن تھے، کپڑے تھے، صندوق تھے۔ لحاف اور رضائیاں تھیں کمبل تھے۔ شروع شروع میں رضائیاں اور کپڑے بیت المال سے تقسیم ہوتے رہے۔ جب میں عورتوں کے سیکشن کی انچارج ہوئی تو میں نے فیصلہ کیا کہ کپڑے اور رضائیاں بیت المال سے تقسیم نہ کئے جاویں کیونکہ مال صحیح حقدار کو اکثر صورتوں میں نہیں پہنچتا تھا۔ چنانچہ رات کے وقت کوئی دس بجے ہم رضائیاں، کمبل اور کپڑے ٹرک میں لاد کر بیت المال سے روانہ ہوتیں۔ ہم کس طرف جائیں گے۔ یہ کسی کو معلوم نہ ہوتا بلکہ اس کا فیصلہ ٹرک میں بیٹھ کر ہوتا۔ جہاں جہاں مہاجر اُترے ہوئے تھے ہم اس طرف جاتے۔ کسی جگہ رات کے گیارہ بجے پہنچتے کسی جگہ ایک بجے۔ سٹیشن سے باہر میدان میں بہت سی عورتیں ایک ایک چادر میں بچوں کو سمیٹے سردی میں ٹھٹھرتی ملیں۔ انہیں جگا جگا کر ہم لحاف اڑھاتی۔ کئی بار زچہ عورتوں کو کمبل اور لحاف دیئے جہاں جہاں بیمار اور زچہ عورتیں بغیر دوا کے پڑی ہوتیں۔ وہاں اگلے روز طبی امداد پہنچاتی۔ رات کو ایسی جگہوں کا نام درج کر لیا جاتا۔ مجھے یاد ہے ایک مرتبہ یونیورسٹی گراؤنڈ کی طرف چند بے سروسامان مہاجر ایک ٹوٹی ہوئی کھنڈر کوٹھڑی میں آگ جلائے بیٹھے تھے۔ عورتیں بچوں کو لے کر اونگھ رہی تھیں۔ مگر کڑاکے کی سردی میں نیند نہ آتی تھی۔ جب ہمارا ٹرک رُکا۔ اور ہم نے جا کر انہیں کپڑے اور رضائیاں دیں تو جو روشنی ان کی سہمی اور اُجڑی ہوئی آنکھوں میں چمک اُٹھی وہ مجھے اب تک یاد ہے۔

بیت المال میں میرے پاس کئی مہاجر مائیں ایسی بھی آئیں۔ جن کی بیٹیوں کی شادی تھی۔ میں نے انہیں جہیز

کے لئے برتن، ریشمی کپڑے۔ گرم چادر اور ساٹن کی رضائیاں بھی دیں۔

ایک عورت اپنے دو بچوں کے ساتھ میرے ہاں آئی۔ میں نے اُسے اپنے بچوں کے پُرانے کپڑے دے دیئے۔ کھانا بھی کھلا دیا۔ اور کہا جب کپڑے کی ضرورت ہو لے جایا کرو۔ بچوں کا باپ زخمی ہو کر ہسپتال میں پڑا ہوا تھا۔ لڑکا چوتھی جماعت میں پڑھتا تھا۔ میں نے عورت سے کہا کہ کسی کے ہاں ملازمت کر کے اپنے لڑکے کی پڑھائی جاری رکھنا۔ اسے اسکول سے مت اوٹھانا۔ بعض عورتوں میں سُوجھ بُوجھ ہوتی ہے۔ اُس عورت نے ایک کوٹھی میں ایک کمرہ لے لیا۔ دن بھر گھر کا کام کاج کرتی۔ جو تھوڑا بہت ملتا۔ اُس سے گزر کرتی۔ اور لڑکے کو سکول بھیجتی رہی۔ تیسرے چوتھے مہینے وہ میرے پاس آکر اپنے لڑکے اور اس کے برابر لڑکی کے کپڑے لے جاتی۔ اب اُس کا لڑکا پانچویں میں آیا ہے۔ آنکھوں میں ذہانت ہے۔ باپ ہسپتال میں مر چکا ہے۔ ایک لڑکی اُس عورت کی گود میں ہے۔ آدمی ہاتھ پاؤں ہلانا چاہے تو کیا نہیں ہو سکتا۔ سٹیٹ بنک میں کبھی جانا پڑے تو ایک لڑکا اور اس کی ہم عمر بہن بائیسکلوں کی رکھوالی کرتے نظر آتے ہیں۔ یہی وُہ بہن بھائی ہیں۔ دونوں کی آنکھوں میں ذہانت کی روشنی نظر آتی ہے۔ اب انہوں نے میرے مشورہ پر گتّے کے نمبر بنا کر سائیکل والوں کو دینے شروع کر دیئے ہیں۔ سامنے سڑک کے پار سائے میں اُن کی ماں چھوٹی بچی کو دُودھ پلاتی ہے۔ ابھی چند دن ہوئے آئے تھی کہ بیٹا پانچویں میں داخل ہوا ہے۔ کہیں سے پُرانی کتابیں دلوا دُوں۔ میں نے وعدہ کیا کہ اگر کتابیں نہ مل سکیں تو بازار سے دلوا دُوں گی"۔

مہاجر بچوں کی تعلیم کس قدر ضروری ہے۔ اِس کا احساس ایک اُستاد ہی کو سب سے زیادہ ہو سکتا ہے۔ مگر ایک مہاجر اس کی اہمیت کا احساس ہم سب کو کرانا چاہتے ہیں

"آپ لوگ اس کی اہمیت کا خود اندازہ کر سکتے ہیں۔ اگر اعداد و شمار کو دیکھیں تو اس گڑبڑ میں کم و بیش ۷۰ لاکھ مہاجر ہندوستان کے مختلف حصّوں سے پاکستان آئے۔ اگر ہم نہایت تنگ دلی سے بھی حساب لگائیں تو بھی ان مہاجرین میں کم از کم ۱۷ لاکھ بچے مختلف سن و سال کے ہوں گے جو ہندوستان سے اپنی درس گاہیں اس بے سروسامانی سے چھوڑ کر آئے کہ نہ کسی کے پاس کتاب تھی نہ سکول، سارٹیفکیٹ جس سے یہ پتہ چل سکے کہ وُہ کون سے درجہ میں تعلیم پاتے تھے اور ان کے دماغ کی یہ کیفیت کہ اس کو یکسوئی سے تعلیم پہ لگانا نہ صرف مشکل بلکہ محال تھا۔ تعلیم کے خرچ کو برداشت کرنے کا تو ذکر ہی کیا۔ مہاجر بچوں کے والدین بھی مہاجر۔ جو کچھ مال و متاع تھا سب لُٹا آئے تھے۔

خیال فرمایئے۔ ان بچوں کا ایک سال ضائع ہو جانا پاکستان کے لیے ۱۷ لاکھ سال کا نقصان تھا۔ ارکانِ حکومت اور عوام نے جو مردانہ کام ان بچوں کی تعلیم کو سنبھالنے کے سلسلہ میں کیا ہے وُہ قابلِ صد ستائش ہے۔ فور آ درس گاہوں کے دروازے کھول دیئے گئے۔ مہاجر بچوں کو وظائف اور نصاب کی کتب بامفت ہر سکول نے تقسیم کیں۔ اساتذہ نے جن میں بہت سے مہاجر بھی تھے رات دن کام کیا۔ تاکہ ملک کے ان نونہالوں کی زندگی اکارت نہ جائے

یونیورسٹی کا سُنئے۔ ۱۴ راگست کو اعلانِ آزادی ہُوا۔ فسادات شروع ہوئے۔ غریب مُسلم طلبا جو میٹرک کے امتحان میں شامل ہو رہے تھے۔ ایک مُصیبت میں پھنس گئے۔ سینکڑوں کو امتحان کے سینٹرز میں موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا۔ باقی جو بچے۔ وُہ کہیں کے بھی نہ رہے۔ پنجاب یونیورسٹی نے طلبا کی مشکلات کا صحیح احساس کیا۔ اور پُوری ہمدردی سے کام لیا۔ ان کی داخل کردہ فیس پر ہی امتحانات دوبارہ ہوئے۔ بہت سے طالب علم جنہوں نے امتحان کی فیس داخل کر دی تھی۔ اور یونیورسٹی سے رُول نمبر حاصل کر چکے تھے۔ مگر اپنی پریشانیوں اور مُصیبتوں میں امتحان میں شامل نہ ہو سکے۔ اور مہاجر کیمپوں میں خدمتِ ملک و قوم میں مصرُوف رہے۔ اُن کو اگلے درجوں میں رعایت کے تحت داخل کر لیا گیا۔

طلباء کی آبادکاری کے علاوہ درس گاہوں کی آبادکاری میں بھی کچھ کم مشکلات کا سامنا نہ تھا۔ مثال کے طور پر لاہور ہی کو لیجیے تقسیمِ ہند سے پہلے یہ تعلیم کا مرکز تھا۔ لاہور کالجوں اور لائبریریوں کا شہر مشہور تھا۔ لیکن مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے۔ کہ تقسیم کے وقت ان درسگاہوں کے نہ صرف سازوسامان کو ہی برباد کیا گیا۔ بلکہ لائبریری اور لیبارٹری (عمیتہ) کو بھی تباہ و برباد کر دیا۔ دو کوڑی کا نہ چھوڑا۔ اور کالج اور سکول مہاجر کیمپ بن گئے۔ حکومت اور عوام نے مل کر اس قومی نقصان کو پُورا کرنے کی وُہ شاندار سعی کی جس کی مثال کم ملتی ہے۔ اور ہمیں یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ لاہور اور مغربی پنجاب کے تقریباً تمام اسکول اور دوسری درس گاہیں باقاعدگی سے کام کر رہی ہیں۔ اور اب پھر لاہور شہر صرف مہاجرین کا ہی شہر نہیں رہا۔ بلکہ تعلیم اور درسگاہوں کا بھی شہر بن گیا ہے۔"

تقریباً پونے دو سال بعد آج لاہور کی حالت دیکھ کر یقین نہیں آتا کہ یہی وُہ شہر ہے جہاں سے ۲۰ لاکھ مہاجرین کے قافلے گزرے تھے۔ لاہور کے بازاروں کی رونق تجارت۔ کاروبار۔ تعلیم۔ لاہور کے باغ۔ لاہور کی شاہی عمارتیں اس بات پر گواہ ہیں

کہ یہاں انصار اور مہاجرین نے مِل کر ایک نئی دُنیا کی بُنیاد رکھی ہے جس میں یہ
سب برابر کے شریک ہیں ⁂

نئے مسئلے

پاکستان بننے کے بعد ہمیں بہت سی اُلجھنوں اور دُشواریوں سے مقابلہ کرنا پڑا تھا۔ اصل میں یہ مشکلیں ہمارے لئے ایک بہت بڑا امتحان ہیں جس طرح پاکستان کا حاصل کرنا ایک بہت بڑا مرحلہ تھا۔ اس سے کہیں زیادہ استحکام اور اس کی بقا کے لئے کوشش کرنا ایک اور مرحلہ ہے جسے حل کرنے کے لئے ہمیں اپنی تمام کوششوں سے کام لینا پڑے گا۔

ہم نے پاکستان اس لئے مانگا تھا کہ ہمیں اپنے کلچر اور تہذیب کو بچانے کے لئے ایک جگہ مل جائے۔ ہماری تہذیب اور ہمارے تمدّن کا ایک ضروری جُز، ہماری اُردو زبان ہے۔ جس کی تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ ہم نے کس محنت اور کوشش سے اس کی حفاظت کی ہے۔ خواجہ شفیع صاحب ہماری زبان کے تاریخی تجزیے سے یہ بات ثابت کریں گے کہ ہم نے اسے پاکستان میں کیسا پایا ہے۔

نہیں معلوم اب کے سال میخانہ پہ کیا گزری　　　ہمارے توبہ کر لینے سے پیمانہ پہ کیا گزری

حسینۂ اُردو بارہ اَبرن سولہ سنگار کئے شاہجہانی لال حویلی میں مصروفِ خرامِ ناز تھی۔ پائے نازک فرشِ مخمل پہ چھلے جاتے۔ گاہ دیوانِ عام میں بہ ادائے ترکانہ تمکن نظر آتی۔ گاہ تختِ طاؤس پر جلوہ کناں۔ گاہ بیگمات سے محلوں میں چہل ہوتی تو گاہ درباروں سے ٹھٹول اُردو بیگموں سے بولی ٹھولی اور اربابِ نشاط سے چوٹ۔ ابھی یہ شعلۂ جوالہ پائیں باغ میں نظر آئی۔ تو دیکھتے دیکھتے عقب حمّام میں جا نہائی۔ میر تقی سر بالوں میں شانہ کناں ہیں تو جان صاحب پور پور چھلے پہنا رہے ہیں۔ ماتھے پر ٹیکہ جما رہے ہیں۔ میر دردؔ چشمِ نیم باز میں بصیرت افروز نبالہ دار سُرمہ لگا رہے ہیں۔ سوداؔ گلہائے آتش رنگ سے رخساروں کو بھبوکا بنا رہے ہیں۔ میر حسن پوشاک میں عطر حنا جو سُہاگ بسا رہے ہیں۔ امانت ہونٹوں پہ دھڑی جما رہے ہیں۔ تو غالبؔ کمرِ نازک میں کٹار سجا رہے ہیں۔ اور داغؔ مٹھوں کا گہنا لئے حاضر۔ یہ عروس اللّسان اٹھلاتی بانکپن دکھاتی، دلوں میں گھر بناتی۔ قلعۂ معلّیٰ میں بھی نظر آتی۔ اور دہلی کے کوچہ بازار میں بھی نزاکت بلائیں لیتی۔ انداز و ادا صدقہ، عشوہ و غمزہ و ناز قدموں پر نثار کہ اتنے میں بوق و کرنا

کی آوازیں آئیں۔ توپیں دندنائیں۔ گولیاں سنسنائیں۔ کٹاریں اور کرپانیں نظر آئیں۔ یہ نازوں کی پالی۔ طرح وُلاری۔ پھولوں کی سیجوں پہ پلی۔ بڑھی ہر سمجر انگل کھڑی ہوئی اور راوی پار آکر دم لیا۔

یہاں اقبال نے اُنگلی پکڑ پانچوں دریا پار اتارے۔ یہ گھبراتی۔ خوف کھاتی دونوں ہاتھوں سے پائنچے اٹھائے کنارِ آب آئی۔ آنکھیں جھکا۔ لجیا شرماساجن سے بولی۔

ندیا گہری رات اندھیری کیسے لگیں گے پار سجنیا

شاعرِ مشرق مُسکرایا۔ اور بولا۔

تیغ ہلال کی طرح عیشِ نیام سے گذر

صنعتِ فلم سازی

بیسویں صدی کی سب سے بڑی ایجاد سینما ہے۔ پاکستان میں سینما کی حیثیت کو ترقی دینے کی کس حد تک گنجائش ہے۔ اِس پر آج ہر طرف غور کیا جارہا ہے۔ فلم صرف تفریح کا ذریعہ ہی نہیں۔ بلکہ تعلیم کا بھی ضروری جزو ہیں اس لئے ایک متمدن ملک میں صنعتِ فلم سازی کی ترقی دُوسری صنعتوں کی ترقی کے ساتھ ضروری ہے۔ پاکستان میں صنعتِ فلم سازی بھی ایک مہاجر صنعت ہے جس کی آبادکاری ہمارے مستقبل کے لئے بے حد ضروری ہے۔ مسٹر ڈبلو۔ زیڈ احمد اس فن کے پرانے مشّاق ہیں۔ ان سے پاکستان میں صنعتِ فلم سازی کی اہمیّت اور اس کے مستقبل کا حال سُنیئے۔

موجودہ دور میں صنعتِ فلم سازی کو معاملاتِ عالم میں جو دخل حاصل ہے اس سے کسی کو مجالِ انکار نہیں یہی وجہ ہے کہ ہر ملک اس صنعت کے ذریعہ اپنے ملک کے ہر شعبۂ زندگی کو ترقی دینے میں کوشاں ہے۔ قیامِ پاکستان سے قبل اگرچہ ہم غلامانہ زندگی بسر کر رہے تھے۔ تاہم ہم نے فروغ صنعتِ فلم سازی میں نمایاں حصہ لیا۔ چونکہ دورِ غلامی میں اس صنعت کا کوئی تعمیری مقصد نہ تھا۔ اس لئے اس سے ملک اور قوم کو بحیثیت مجموعی کوئی فائدہ نہ پہنچا۔

اب جب کہ پاکستان بن چکا ہے یہاں کے رہنے والے اپنے اندر آزادی کا ایک نیا ولولہ اور نئی تڑپ محسوس کر رہے ہیں جس سے توقع کی جاسکتی ہے کہ پاکستان میں صنعتِ فلم سازی کا مستقبل اور تابناک ہے۔

برِ عظیم ہندوستان میں بمبئی کے بعد لاہور کو اس صنعت میں ثانوی حیثیت حاصل ہے۔ لیکن تقسیم نے لاہور کی صنعتِ فلم سازی کے ڈھانچے کو یکسر بدل کر رکھ دیا۔ کیونکہ یہاں غیر مسلموں کی اجارہ داری تھی۔ جو لاہور سے جا چکے ہیں۔ ہندوستان سے جو صنعت کار بے یارو مددگار اپنی جانوں کو بچا کر پاکستان پہنچے تھے وُہ انقلابِ زمانہ

سے بے دم ہو رہے تھے اور پاکستان میں یوں معلوم ہوتا تھا کہ صنعتِ فلم سازی ہمیشہ کے لئے ختم ہو کر رہ جائے گی اور ان حالات میں کسی کو گمان بھی نہ ہو سکتا تھا کہ پاکستان میں اس صنعت کو حیاتِ نو نصیب ہو گی لیکن تباہ حال لیکن باہمت صنعت کاروں کے جذبہ عمل اور حکومت کی ہمدردانہ روش نے اس صنعت کے عروقِ مردہ میں زندگی کے آثار پیدا کر دیئے اور حکومت نے انتہائی پریشانیوں کے باوجود فوراً تقسیم کاروں کے دفاتر کھول دیئے جو فلم خُرد بُرد ہو چکے تھے۔ ان کو تلاش کر کے جائز وارثوں کے حوالہ کیا۔ کیونکہ تقریباً تمام سینما بند پڑے تھے۔ اس الاٹمنٹ میں نقائص بھی تھے لیکن ان خامیوں کے باوجود اسے غنیمت سمجھا گیا لیکن اب جب کہ حکومت ہنگامی پریشانیوں سے بہت حد تک عہدہ برآ ہو چکی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ حکومت بہت جلد ان سابقہ خامیوں اور نقائص کو دُور کر کے اپنی ہمدردانہ روش اور فرض شناسی کا ثبوت دے گی۔ فلم سازوں کے لئے لاہور میں صرف ایک نگار خانہ دیا گیا تھا حکومت نے اس کو واگذار کر دیا۔ اور کچھ خستہ حال مگر باہمت فلم سازوں نے وہاں فلموں کی تیاری بھی شروع کر دی۔ اور یہ کہہ دینا یقیناً باعثِ فخر ہو گا کہ ان حالات اور مختصر وقت میں بھی تقریباً نصف درجن کے قریب فلمیں نمائش کی منتظر ہیں۔ اس کے علاوہ یہ امر بھی حوصلہ افزا ہے کہ ان فلم سازوں نے دستاویزی فلموں کی تیاری میں بھی نمایاں حصہ لیا۔ اس سے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ پاکستان کے صنعت کار اس صنعت کو کامیابی سے چلانے کی پوری صلاحیت رکھتے ہیں۔

صنعت کاروں کے اس عزم و استقلال اور حکومت کی ہمدردانہ روش سے پاکستان میں صنعتِ فلم سازی کا مستقبل روشن نظر آ رہا ہے۔

لیکن ضرورت ہے کہ یہ آرزوئیں اور اقدامات ذہنی، تخیلی اور وقتی نہ ہوں۔ بلکہ ان کو جامۂ عمل پہنا کر ملک و قوم کی صحیح خدمت انجام دی جائے۔ اس کے لئے ہم اور ہماری جماعت پاکستان کے اربابِ حل و عقد اور حکومت کو اپنے کامل تعاون کا یقین دلاتے ہیں اور توقع کرتے ہیں کہ حکومتِ پاکستان بھی فلم سازوں کی امداد و اعانت میں زندہ قوموں کی حکومتوں کی طرح عالی حوصلگی سے کام لے گی اور صنعت کی ترقی اور بقا کے لئے صنعت کاروں کا ہاتھ بٹائے گی۔

دارالخواتین

صوبہ مغربی پنجاب کے دورے میں وزیرِ مہاجرین خواجہ شہاب الدین نے ایک یتیم خانے کا معائنہ کرنے کے بعد فرمایا تھا کہ پاکستان میں یتیم خانوں اور بیواؤں کی نگرانی کرنے والے اداروں کی سخت ضرورت ہے۔ چنانچہ حال ہی میں صوبہ سندھ اور مغربی پنجاب کی مہاجرین کونسل کے

اجلاس میں فیصلہ ہوا ہے کہ حیدرآباد سندھ اور لاہور اور کراچی میں اس قسم کے یتیم خانے لاوارث بچوں کی نگرانی کے واسطے کھولے جائیں۔ لاہور میں حکومت کی طرف سے گنگا رام رفیوجی ہوم تقریباً ڈیڑھ سال سے خدمات انجام دے رہا ہے، اس کا حال اشفاق حسین خاں سے سُنیئے:۔

اکتوبر ۱۹۴۷ء وہ زمانہ تھا جب کہ گنگا رام رفیوجی ہوم جیل روڈ لاہور میں روزانہ سینکڑوں کی تعداد میں لاوارث بچے اور بیوائیں بذریعہ ملٹری اس قدر خستہ اور پریشان حال میں مشرقی پنجاب سے لائی جا رہی تھیں کہ جن کو دیکھ کر ایک دردبھرا دل بے چین ہوتے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ پھر اس پر مزید طرّہ یہ تھا کہ مصیبت زدہ بیچارے پچاسوں بیماریوں میں مبتلا تھے۔ اپنی گم شدہ عورتوں اور بچوں کی تلاش میں روزانہ ہزاروں اشخاص اس ہوم میں آیا کرتے تھے۔ اور جس وقت کسی شخص کو اپنے گم شدگان میں سے کوئی مل جاتا تھا اور وہ اپنے وارث سے مل کر اپنی داستانِ مصیبت رو رو کر بیان کرتا تھا تو اس کو سن کر کونسا پتھر کا دل تھا جو پسیج نہ گیا ہو۔ اور جن لوگوں کو اپنے گم شدگان کا پتہ نہیں ملتا تھا تو ان کی مایوسی و غم واندوہ کا اندازہ بھی وُہی صاحبِ دل کر سکتا تھا جس پر یہ مصیبت خود گزری ہو۔ اس ہوم کے ملازمین ان مصیبت زدہ انسانوں کی بے حد تسلّی و تشفی کرتے تھے۔ مگر پھر بھی ان کے بے چین دلوں کو چین نہیں آتا تھا۔

یہ رفیوجی ہوم گورنمنٹ کے خرچہ سے چلتا ہے اور اس میں کام کرنے والوں کی تنخواہیں بھی سرکار سے ملتی ہیں۔ البتہ اس کی نگرانی مسز کرائسٹر اعزازی طور سے کرتی ہیں۔ تقریباً تین سو بچے اور پچاس بیوائیں اس ہوم میں رہتی ہیں۔ بچوں کی تعلیم و تربیت کا خاص طور سے انتظام ہے۔ انہیں مدرسہ میں تعلیم دی جاتی ہے کھیلنے کے لئے بڑا میدان ہے۔ اور ان کی خوراک کا خاص طور سے خیال رکھا جاتا ہے۔ صبح کے ناشتہ میں ایک پاؤ دودھ فی کس دیا جاتا ہے۔ اور گیارہ بجے دن کو پھر پانچ بجے شام کو کھانا دیا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں کبھی ہفتہ میں ایک مرتبہ اور کبھی ہفتہ میں دو مرتبہ پھل اور مٹھائی بھی ان بچوں کو تقسیم کی جاتی ہے۔ بچوں کی دنیاوی تعلیم کے ساتھ ساتھ ان کی مذہبی تعلیم کا بھی معقول انتظام ہے۔ تاکہ یہ قوم کے نونہال جذبۂ مذہبی سے سرشار ہو کر قوم اور ملک کی صحیح خدمت کر سکیں۔

جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا کہ مہاجر عورتیں اور بچے پچاسیوں مرضوں میں مبتلا آئے تھے۔ چنانچہ گورنمنٹ نے ہسپتال کا باقاعدہ انتظام کیا تھا جس نے تھوڑے ہی عرصہ میں ان مریضوں کی کایا پلٹ دی۔ اور اب اس ہوم میں آپ کو کوئی ایسا مریض نظر نہیں آئے گا جو بادی النظر میں بیمار معلوم ہو۔

صفائی کا یہ عالم ہے کہ کہیں تنکا بھی پڑا نہیں دکھائی دیتا۔ اور عام طور سے ہر معائنہ کرنے والے کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ شاید صفائی خاص طور سے کرائی گئی ہے۔ اِسی طرح خورد و نوش و لباس کا انتظام بھی اسی قدر اعلیٰ پیمانہ پر ہے

کہ جس کو دیکھ کر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس ہوم میں رفیوجی آباد ہیں۔ گورنمنٹ نے اس ہوم میں ایک تھریڈ بال فیکٹری یعنی دھاگہ کی گولی بنانے کا کارخانہ بھی جاری کر دیا ہے جس کی وجہ سے مہاجر عورتیں کم و بیش پچاس پچاس روپیہ ماہانہ کمانے کے قابل ہو گئیں۔

اغوا شدہ عورتیں اور بچّے

۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کے بعد مسلمانوں کے جان و مال پر جو حملے ہوئے ان میں سب سے خطرناک حملہ مسلمان عورتوں اور بچّوں کا اغوا کرنا تھا۔ اب تک مشرقی پنجاب اور مشرقی پنجاب کی ریاستوں سے دس ہزار کے قریب اغوا شدہ عورتوں اور بچّوں کو لایا جا چکا ہے پھر بھی یہ مہم جاری ہے۔ اغوا شدہ عورتوں کو رہا کرانے کے بعد انہیں لاہور کے ایک کیمپ میں لایا جاتا ہے۔ اور جب تک حکومت ان کے وارثوں کا پتہ نہیں لگا لیتی عورتیں یہیں رہتی ہیں۔ اس ادارے کا حال صوفی عبدالحمید سے سنیئے:۔

مشرقی پنجاب سے برآمد شدہ مستورات کو وومن ہوم زنانہ جیل کی عمارت میں جاری شدہ کیمپ میں رکھا جاتا ہے۔ جس کا انتظام میرے سپرد ہے جب برآمد شدہ لڑکیاں ہمارے کیمپ میں داخل کی جاتی ہیں۔ تو ان کی حالت بہت ناگفتہ بہ ہوتی ہے۔ دریدہ لباس منتشر خیالات اور گری ہوئی صحت اُن کے حالِ زار کی خود شاہد ہوتی ہے یہاں کچھ روز قیام کے بعد ان کی اخلاقی حالت اور جسمانی صحت بحال ہوتی ہے جن کا مشاہدہ اکثر ان حضرات نے کیا ہے جو وقتاً فوقتاً وومن ہوم کا ملاحظہ فرماتے رہے ہیں اور اپنے ان خیالات کا اظہار تحریری طور پر ہمارے معائنہ کی کتاب میں کرتے رہے ہیں۔

لڑکیوں کو ہوم میں لانے کے بعد خود ان سے دریافت کے بعد ان کا نام، عمر۔ ولدیت۔ زوجیت۔ قوم۔ جائے سکونت اور ضلع پر مشتمل مکمل فہرست تیار کی جاتی ہے۔ اور درج رجسٹر کے بعد ان کا نام ضلع وار رجسٹروں میں لکھا جاتا ہے۔ پبلک کی سہولیت کے لئے تمام اضلاع مشرقی پنجاب اور ریاست ہائے مشرقی پنجاب و صوبہ دہلی کو تین مختلف گروہوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اور جدا جدا ذمہ دار کلرک اپنے اضلاع کے نام اوقاتِ دفتر میں پکارتے ہیں۔ جن کو سُن کر رشتہ دار اپنی اپنی رشتہ دار لڑکیوں کو برآمد کرنے کے لئے مجوّزہ فارم پر درخواست دیتے ہیں۔

مجوّزہ فارم ہر درخواست پر سائل اور لڑکی سے جداگانہ رشتوں کی صحت کی تصدیق کی جاتی ہے۔ اور جب متعلقہ دفتر کو اس امر کا یقین ہو جائے کہ سائل واقعی لڑکی کا جائز وارث اور قریبی رشتہ دار ہے تو بعد ثبت نشان انگشت لڑکی وارث کے سپرد کر دی جاتی ہے۔

لڑکیوں کے نام بغرض پبلسٹی ہفتہ وار تمام اُردو اخبارات و رسائل محکمہ تعلقاتِ عامہ کو بھجوائے جاتے ہیں۔ اور

بعض اوقات ریڈیو پاکستان سے بھی نشر کیئے جاتے ہیں۔ بسا لقہ درخواستوں کی بنا پر اور خود لڑکیوں سے دریافت کے بعد ادارہ کی جانب سے ورثا کو بذریعہ ڈاک اطلاع دی جاتی ہے جس کی بنا پر لوگ آکر لڑکیوں کی برآمدگی کی درخواست دیتے ہیں۔ مشرقی پنجاب سے آنے پر لڑکیوں کو محکمہ صحت کی طرف سے ٹیکے لگائے جاتے ہیں اور باقاعدہ طبّی معائنہ ہوتا ہے۔ نئے پارچات دیئے جاتے ہیں۔ اور دورانِ قیام میں باقاعدہ ہفتہ وار تیل صابن برائے غسل و دھلائی پارچہ جات دیا جاتا ہے۔ علاوہ پارچہ جات موسم کے لحاظ سے بستر کا بھی انتظام کیا جاتا ہے۔ اور قیام کے ساتھ ساتھ طعام کا نہایت معقول انتظام کیا جاتا ہے۔ تازہ دودھ علی الصبح ناشتہ کے ساتھ دیا جاتا ہے۔ سرکاری ہسپتال اور معقول طبّی امداد موجود ہے۔ لڑکیوں کو مصروف رکھنے کے لیئے اور ہنر مند بنانے کے لئے انہیں دستکاری سکول کے ذریعہ دستکاری مثلاً کشیدہ کاری۔ ازار بند اور نواڑ سازی سکھائی جاتی ہے۔ اور جس قدر کام وہ کریں اس کی اجرت بھی دی جاتی ہے۔ چھوٹے بچوں کے لئے اسکول موجود ہے۔

دفتری عملہ کے علاوہ لڑکیوں کی دیکھ بھال کے لئے زنانہ عملہ بھی موجود ہے۔ لیڈی سپرنٹنڈنٹ مسز عبدالرحمٰن نے لڑکیوں کی دیکھ بھال کو بطریقِ احسن انجام دیا ہے اور بیگم اسحاق نے بذریعہ وعظ بچیوں میں دینی تعلیم اور نیک خیالات کی تبلیغ کے ذریعہ ان کی اخلاقی حالت کو درست کیا ہے۔ اکثر ہماری لیڈی سوشل ورکرز نے بھی تشریف لاکر ہمارا ہاتھ بٹایا ہے۔ حکومتِ پاکستان کے وزراء صاحبان۔ غیر ملکی سفیر اکثر ہمارے ادارہ کا معائنہ کرتے رہے ہیں۔ ۴۸ء کے شروع سے اب تک ۹۲۵۹ لڑکیاں ہمارے ہوم میں لائی گئیں اور ۹۰۶۸ لڑکیاں ورثا کے سپرد کی گئیں اور اس وقت ۱۹۱ لڑکیاں یہاں موجود ہیں جن کے ورثا کا ہمیں انتظار ہے۔ جہاں تک لڑکیوں کو ورثا کے سپرد کرنے کا تعلق ہے مجھے اس وقت تک کوئی شکایت نہیں پہنچی کہ لڑکی حقیقی ورثا کے سپرد نہیں ہوئی۔

یہ امر قوم پر خوب واضح ہے کہ مشرقی پنجاب سے مسلم لڑکیوں کو برآمد کرنے کے لئے ضروری ہے کہ پاکستان سے تمام غیر مسلم لڑکیوں کو برآمد کر کے ہندوستان بھیج دیا جائے اور ویسے بھی اسلامی روایات اور احکامِ خداوندی کے پیشِ نظر ہمیں لڑکیوں کی برآمدگی میں دل و جان سے حصّہ لینا چاہیئے ؎

استحکامِ پاکستان میں عورتوں کا حصّہ

آج مہاجرین کا پروگرام خصوصیت سے ہماری مہاجر بہنوں کے لئے نشر کیا جا رہا ہے۔ کیونکہ اس میں صرف مہاجر بہنیں حصّہ لے رہی ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ مہاجر بھائی اس پروگرام کا بائیکاٹ کر دیں۔ ہر ہفتے مہاجر بھائیوں کے خیالات جس صبر سے بہنیں سُنتی رہی ہیں، اُسی صبر کے ساتھ آج شام ہمارے مہاجر بھائیوں کو عورتوں کے خیالات سُننے چاہئیں۔ کیونکہ آج کی بحث سے مردوں کا تعلق زیادہ ہے۔ میں نے پاکستان ریڈیو کراچی کے اسٹوڈیو میں تین بہنوں یعنی بیگم فریدہ زاہد، مسز خورشید مرزا اور بیگم ثریّا عباسی کو دعوت دی ہے میں نے ان تینوں بہنوں سے ایک ہی سوال کیا ہے کہ پاکستان کے استحکام میں عورتیں کیسے حصّہ لے سکتی ہیں۔ کیا عورت کا دائرۂ عمل صرف گھر کے اندر ہے۔ یا گھر کے باہر بھی ہے۔ اس سوال کے متعلق سب سے پہلے بیگم فریدہ زاہد کی رائے معلوم کیجئے :-

گھر کی چار دیواری میں

اس موضوع پر دو خیال کے گروہ ہیں۔ ایک وُہ جو سمجھتے ہیں کہ عورتیں صرف باہر ہی رہ کر قوم اور ملک کی خدمت کر سکتی ہیں۔ اور دوسرا وُہ جو اس خیال سے اتفاق نہیں رکھتے۔ میرا ذاتی خیال بھی یہ ہے کہ عورتیں گھر میں رہ کر بھی قوم کی بہت خدمت کر سکتی ہیں۔

اس امر سے سب کو اتفاق ہے کہ ماں کی گود ہی سب سے بڑی تربیت گاہ ہے۔ یہاں ہی سے قوم و ملک کی تباہی اور خوشحالی کی بنیاد ڈالی جاتی ہے جس قوم کی مائیں اس فرض کو انہماک و تندہی سے انجام دیتی ہیں وہ قوم ہمیشہ خوشحال اور راہِ ترقی پر گامزن رہتی ہے لیکن جس قوم کی مائیں اس فرض کی ادائیگی سے کوتاہی برتتی ہیں۔ یا اس فرض سے بہرہ اندوز نہیں ہیں۔ وُہ قوم خواہ کتنے ہی عروج پر کیوں نہ ہو ضرور تباہ و برباد ہوگی۔ جو تعلیم و تربیت اوائل عمر میں بچے کو ملتی ہے وُہ ہی اس کی بقیہ زندگی اور کیریکٹر ڈھالنے کی بڑی حد تک حامی ہوتی ہے۔ یہاں تک کہا

جاتا ہے کہ بچہ جب ماں کے پیٹ میں ہوتا ہے تو اس وقت ماں کے خیالات اور ماحول اس بچے کی زندگی پر اثرانداز ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے بڑے بوڑھے یہ کہتے آئے ہیں کہ اس وقت ہونے والی ماؤں کے خیالات اور ماحول عمدہ اور بلند ہونے چاہئیں۔ تاکہ بچہ بھی ان ہی خیالات کا اثر لے کر پیدا ہو۔ میں عورتوں کے باہر کام کرنے کے اس وجہ سے حق میں نہیں ہوں کہ ان کو قوم کی بنیاد ڈالنے کے لئے زندگی کے ہر لمحہ کی ضرورت گھر پر ہے۔ ظاہر ہے کہ جب ہم باہر کے کاموں میں دلچسپی لیں گے تو گھریلو فرائض میں ہم سے کوتاہی ہو گی۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنا تمام تر وقت اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت پر صرف کر کے قوم و ملک کے لئے بہترین رکن مہیا کر سکیں۔ اس کے علاوہ اور بہت سی چیزیں ہیں جو ہماری توجہ کی مستحق ہیں مثلاً شوہر یا باپ بھائی کے آرام، آسائش کا خیال کھانے پکانے کشیدہ کاری گھر کی صفائی اور اسی قسم کی بہت سی باتیں ہیں جو ہماری تمام تر توجہ کی مستحق ہیں۔ اگر ہمارے گھر کا ماحول اچھا ہے تو یقینی ہمارے گھر کا ہر فرد اپنے فرائض کو خوش اسلوبی سے ادا کر سکے گا۔ برعکس اس کے اگر ہم گھر سے باہر کے کاموں میں حصہ لیں گے تو ہم سے گھر کے کاموں میں کوتاہی ہو گی اور نہ ہی بچوں کی تعلیم و تربیت اچھی ہو سکے گی۔ ظاہر ہے کہ ایسے بچے قوم و ملک کی کیا خدمت کر سکیں گے۔ اس لئے میں ان بھائی یا بہنوں کے خیال سے اتفاق نہیں رکھتی جو یہ کہتے ہیں کہ عورتیں صرف باہر نکل کر ہی کام کر سکتی ہیں۔ میرا تو خیال ہے کہ ہم اپنی تمام تر قوت اور صلاحیت گھر میں رہ کر انہی بنیادی چیزوں پر صرف کریں۔ اور باہر کا کام فی الحال مردوں پر چھوڑ دیں۔ اور خود گھر میں رہ کر ان کی مدد کریں تاکہ ہمارے مرد اپنے ملک اور قوم کی خدمت بہترین طریقے سے انجام دیں۔ اسی طرح ہم کشیدہ کاری میں ترقی حاصل کر کے اپنے ملک کی صنعت و حرفت کو فروغ دے سکتے ہیں۔ یہ چیزیں ایسی ہیں جن سے ہم اپنے ملک کو طاقت ور بنا سکتے ہیں۔ میں اس سلسلہ میں اپنی مہاجر بہنوں سے خاص طور پر اپیل کروں گی کہ ان میں بہت سی بہنیں کشیدہ کاری میں خاص مہارت رکھتی ہیں۔ اگر یہی بہنیں کوشش کریں تو اس صنعت کو کافی ترقی دے کر ملک کی خدمت کر سکتی ہیں۔ نیز نہ صرف اس طرح ملک کو فائدہ پہنچائیں گی بلکہ اپنے لئے بھی ایک آمدنی کی صورت پیدا کر لیں گی۔ ایسی بہنوں کو چاہیئے۔ کہ اپنی ہمسایہ مہاجر بہنوں کی بھی مدد کریں اور ان کو بھی کشیدہ کاری اور سینے پرونے کا کام سکھائیں۔ تاکہ ہماری بہت سی بہنیں جو اس وقت فکرِ معاش میں مبتلا ہیں کسی حد تک اس دستکاری سے اپنی ضروریات کو پورا کر سکیں۔

آپ نے بیگم فریدہ زاہد کے خیالات معلوم کر لئے اب اسی موضوع پر مسز خورشید کی رائے پڑھیئے:۔

گھر سے باہر

اس میں تو کسی سوال کی گنجائش باقی نہیں ہے کہ پاکستان قائم ہونے میں عورتوں نے تقریباً مردوں کے

برابر حصہ لیا ہے گو پاکستان بننے سے پہلے ان کی سرگرمیاں زیادہ تر گھروں کے اندر ہی محدود تھیں۔ پھر بھی ووٹنگ کے وقت وہ گھر گھر پھریں اور عورتوں کے زیادہ سے زیادہ ووٹ حاصل کرنے میں قابلِ تعریف کام کیا خصوصاً ان گھرانوں میں جن کے مرد نیشنلسٹ تھے اور عورتیں اپنی جہالت کی وجہ سے سیاست کو سمجھ نہ سکتی تھیں۔ ہماری باہر نکل کر کام کرنے والی خواتین نے ان کو صحیح طور پر مسلم لیگ کے معنی سمجھائے اور ہزاروں ووٹ نیشنلسٹ پارٹی کے توڑ کر مسلم لیگ میں شامل کئے۔

تقسیم کے بعد جس بھیانک دور سے مشرقی پنجاب، یو۔پی، بہار و دیگر صوبجات کے مسلمان مردوں و عورتوں کو گزرنا پڑا اس نے انہیں خوب سمجھا دیا ہے کہ ان کی آئندہ نسلوں کی حفاظت اور سلامتی کا دار و مدار ہے "مضبوط پاکستان" اس لئے ہر عقلمند مرد و عورت نے اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیا ہے کہ اب وہ زمانہ جا چکا ہے جب عورتیں اپنا فرصت کا وقت چارپائیاں توڑ کر گزارا کرتی تھیں۔ اس سے میری مراد یہ نہیں ہے کہ ہر عورت گھر کا کام کاج چھوڑ کر باہر نکل کر کام کرنا شروع کر دے بلکہ فرصت کا وقت بیکار برباد کرنے کے بجائے اسی وقت کو کسی ایسے ہنر کے سیکھنے میں صرف کریں جو بوقتِ ضرورت ان کو عزت سے اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کے قابل بنا سکے اور ان کے ملک کے بھی کام آسکے مثلاً نرسنگ۔ ٹائپنگ وغیرہ وغیرہ۔ اس کے ساتھ ساتھ جو بہنیں گھر کے باہر نکل کر اپنی قابلیت و ہمت سے اپنے ملک کی فلاح و بہبودی کے لئے کچھ کر سکتی ہیں۔ ان کی زیادہ سے زیادہ ہمت بڑھانی چاہیئے۔ اس زمرہ میں وُہ بہنیں شامل ہیں جو کالجوں یا اسکولوں کی استانیاں ہیں لیڈی ڈاکٹر ہیں۔ دفاتر میں ملازم ہیں یا سوشل کاموں میں حصہ لیتی ہیں۔

زمانے نے ایسی کروٹ لی ہے کہ زندگی میں مشکلات کھانے کی، کپڑے کی، رہائش کی پہلے سے زیادہ دس گنا بڑھ گئی ہیں۔ اس مشکل زمانے سے ٹکر لینے کے لئے ہمیں ابھی چند ایسی خواتین چاہئیں جو اپنے شوہر پر، اپنے بھائیوں پر، اپنے بیٹوں پر بار نہ ہوں بلکہ اپنی اولوالعزمی، اپنی محنت، اپنی ہمدردی سے ان کے کاندھوں کا بار ہلکا کر سکیں۔ اور یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ عورت کو زندگی کے ہر شعبہ میں مرد کے برابر موقعے دیئے جائیں۔

عورت کو صنفِ نازک کہنے کا زمانہ ختم ہو چکا ہے۔ امریکہ و دیگر ممالک کے سائنسدانوں نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ عورت کی صحت ۲۵ فی صدی مردوں سے اچھی ہوتی ہے۔ اسی حساب سے وُہ زندہ بھی زیادہ رہتی ہیں۔ اور اسی حساب سے ان کی قوتِ برداشت بھی مردوں سے زیادہ ہوتی ہے۔ لہٰذا اس طرح غلط دلیلیں دے کر کہ "عورتیں ہرگز ۸ گھنٹے آفس میں کام نہیں کر سکتیں"۔ یا "اتنی محنت کا کام عورتیں نہیں سنبھال سکتیں"۔ ان کے جائز مطالبوں سے انہیں روکنا اور ضرورت مند قابل عورتوں کا حق مارنا سراسر ظلم ہے۔

سیاسی سرگرمیوں میں بھی، باوجود چند فرقہ پرست و دقیانوسی خیالات کے مردوں کی مخالفت کے، عورتیں

نہایت کامیابی کے ساتھ حصہ لے رہی ہیں۔

ابھی تھوڑے دن کی بات ہے کہ میں چند بہنوں کے ساتھ بس میں لیاری کوارٹر جا رہی تھی جہاں مہاجر و انصار بہنوں کو دستکاری وحفظانِ صحت کے اصول سکھائے جاتے ہیں بس میں اتفاق سے ایک بزرگ بھی بیٹھے تھے جب تک بس چلتی رہی وُہ بس میں بیٹھی ہوئی خاتونوں کو گھورتے رہے۔ اور جب اترنے لگے تو باآوازِ بلند فرمایا "دیکھئے صاحب پاکستان میں عورتوں کو یہ آزادی ملی ہے"۔ اس پر مجھ سے نہ رہا گیا اور میں نے کہا "قبلہ اگر آپ میں اتنی غیرت ہے تو آپ نے ہی اپنی نظریں نیچی رکھی ہوتیں"۔

مغربی پنجاب کے مہاجروں کو آباد کرنے میں عورتوں نے جو کام کیا ہے وہ بیان کا محتاج نہیں خضر حیات ٹوانہ کی منسٹری کے توڑنے میں عورتوں نے ڈنڈے کھائے۔ ہر مشکل کا مقابلہ کیا لیکن اپنی مانگ پر اڑی رہیں اور اس منسٹری کو توڑ کر دم لیا۔ اور اس طرح دنیا پر یہ ثابت کر دیا کہ ہمارا عزم اونچا ہے۔ ہماری ہمتیں بلند ہیں۔ اور ہم جس کام کا بیڑا اٹھائیں اسے پُورا کر کے دم لیتی ہیں۔

پاکستان ہمارا ملک ہے۔ اتنا ہی جتنا ہمارے مردوں کا۔ ہمیں اس کے نظام میں، اس کی ترقی میں اس کی حفاظت میں حصّہ لینے کا اتنا ہی حق ہے جتنا مردوں کو۔ جب تک ہم اپنے ملک کے دُکھ سکھ میں مردوں کے برابر شریک نہ ہوں گے ہم کیسے پاکستان میں اور اپنے میں "اپنا پن" پیدا کر سکیں گے۔ کیسے اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کو اس میدانِ عمل میں حصہ لینے کے لئے تیار کر سکیں گے؟

ہمیں اپنے ملک کی محبت میں جینے اور کام کرنے کا حق ہے ہمیں اپنے ملک کی محبت میں بہادری سے جان دینے کا حق ہے۔ پاکستان پائندہ باد۔

مسز خورشید مرزا کی رائے کے بعد آپ بیگم ثریا عبّاسی کے خیالات کا مطالعہ کیجیے۔ ان کا عنوان ہے:۔

درمیانی راستہ

آپ نے ابھی دو بہت دلچسپ تقریریں سُنی ہیں۔ میری بہن بیگم فریدہ زاہد کی تقریر کا مفہوم یہ ہے کہ گھر میں رہ کر ہی ہم قوم کے لئے مفید ہو سکتے ہیں۔ مسز خورشید مرزا کی تقریر اس کے بالکل متضاد ہے اور اُن کا خیال ہے کہ قوم کی خدمت گھر سے قدم نکالے بغیر ہو ہی نہیں سکتی۔ یہ دونوں نظریے ایک حد تک درست ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ دونوں تقریریں یک طرفی کی مثال اور انتہا پسندی کا نمونہ ہیں۔

جہاں تک ملک و قوم کا تعلق ہے۔ اس کی خدمت ہم گھر پر رہ کر اور گھر کے باہر رہ کر دونوں طرح سے کر سکتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ عورت کا بہترین مقام اس کا گھر ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ وُہ باہر

کی دنیا سے بالکل ناواقف ہو اور اس میں کوئی حصہ نہ لے۔

ملک و قوم کی خدمات کے مختلف اقسام ہوتے ہیں۔ بچوں کی نگہداشت، ان کی تربیت اور گھر کی خوش انتظامی قوم کے لئے ضروری باتیں ہیں۔ اچھی تربیت ہی سے بچوں کا کیرکٹر بنتا ہے۔ اور اس کیرکٹر کے بنانے میں ماں کا بہت بڑا حصہ ہے۔ اسی طرح مذہب کے اصلی اصولوں کو ذہن نشین کرانا گھر کی تربیت پر منحصر ہے۔ گھر کے کام سے فراغت پاکر عورتوں کا دستکاری کا کام کرنا بھی ذات اور قوم کے لئے مفید ہے۔ اسی طرح سے اور بہت سے گھریلو کام ہیں جن میں مصروف ہو کر عورتیں قوم کی خدمت کر سکتی ہیں۔ لیکن ایک تو سب میں فطرتی طور پر ایک ہی کام کو بہت اچھی طرح کرنے کا سلیقہ نہیں ہوتا۔ اور دوسرے ایسے کام بھی ہیں۔ جو گھر میں رہنے کی سخت پابندی سے انجام نہیں ہو سکتے۔ مثلاً چھوٹے بچوں کی تربیت ہی لے لیجئے۔ ہر گھر میں الگ الگ ان کی تعلیم نہیں ہو سکتی۔ ان کے لئے مدرسہ اور اسکول ضروری ہیں۔ بچوں کی ابتدائی تعلیم کے لئے مردوں کے مقابلہ میں عورتیں زیادہ موزوں ہیں۔ وہ ان کی ذہنیت کو زیادہ سمجھتی ہیں۔

صرف یہی نہیں آپ مریضوں کی تیمارداری یا نرسنگ پر غور کیجئے۔ یہ ایسا شعبہ ہے جس کے لئے مقابلۃً مرد اپنی سخت دلی اور بے صبری کی وجہ سے بیکار ہیں۔ عورت میں تیمارداری کا سلیقہ زیادہ ہوتا ہے۔ اور اس کے کام میں صفائی ہوتی ہے۔ دوسرے مریض عورتوں کی دیکھ بھال عورت نرس ہی کر سکتی ہے۔ پاکستان میں نرسوں کی اشد ضرورت ہے اور یہ کام عورت ہی سنبھال سکتی ہے۔

ایسے ادارے جیسے لڑکیوں کے یتیم خانے اور مہاجرین عورتوں کے کیمپ بھی عورتوں ہی کے زیر اہتمام چل سکتے ہیں۔ اور جہاں ان کے ہاتھ میں ہیں۔ وہاں بڑی خوش اسلوبی سے چل رہے ہیں۔ ان اداروں کو سنبھالنا عورتوں ہی کا کام ہے۔ اور وہ کام بغیر کچھ عورتوں کے اپنے گھر سے نکلے نہیں ہو سکتا۔

اب کراچی کے لیاری کوارٹر کے کام پر نظر ڈالئے۔ عورتوں نے وہاں صفائی کرنے اور وہاں کے رہنے والوں کی زندگی کو بہتر بنانے کی کوشش شروع کی ہے۔ اس کام میں دونوں نظریوں کے لوگ شامل ہیں۔ ایک تو وہ جنہوں نے وہیں اپنے گھر پر بیٹھ کر بچوں کے پڑھانے اور لڑکیوں کو کشیدہ کاری وغیرہ سکھانے کا ذمہ لیا ہے اور دوسرے وہ جو شہر کے دوسرے حصّوں سے وہاں جاتی ہیں۔ اور محلہ کی صفائی وستھرائی و کھیتی اور بچوں کی دیکھ بھال کرتی ہیں۔

اب سیاسی کام پر غور کیجئے۔ دنیا بدل رہی ہے۔ کوئی قوم اپنی سیاسی جدوجہد میں بغیر عورتوں کی پوری مدد کے کچھ نہیں کر سکتی پاکستان کے حاصل کرنے میں عورتوں نے جو سعی و کوشش کی ہے وہ محتاجِ بیان نہیں ہے جب قوم پر وقت آتا ہے اور مشکلیں درپیش ہوتی ہیں تو آبادی کے ایک حصّے یعنی عورتوں کے بیکار رہنے

سے قوم کا کام نہیں چل سکتا۔

ہم کو عمل میں میانہ روی کی چال چلنا چاہیئے۔ یعنی نہ یہ چاہیئے کہ قومی کام کے سلسلہ میں ایسا گھر سے باہر رہیں کہ گھر ہی تباہ ہو جائے اور بچوں کی تربیت خراب ہو۔ اور نہ ایسی سختی سے گھر پر بیٹھنا چاہیئے کہ قوم کے کام سے کوئی سروکار نہ ہو۔ ضروری یہ ہے کہ ہر ایک جہاں ہو۔ خدمت کرنے کا جذبہ رکھتا ہو۔ اور پوری تندہی سے خدمت کرے۔

پاکستان ہمارا ملک ہے اور اس ملک کو ہم لوگوں کو اس معیار پر پہنچانا ہے جو ہمارے اور آئندہ نسلوں کے لئے باعثِ فخر ہو۔

نئی اور پرانی بستیاں

سندھ میں آنے والے مہاجرین نے اس صوبہ کو اب اپنا وطن بنا لیا ہے۔ اور آہستہ آہستہ یہاں کی زبان رسموں اور روایتوں سے واقفیت حاصل کر رہے ہیں۔ لاڑکانے کے ضلع میں ایک بہت پرانے تاریخی شہر موہنجوداڑو کے کھنڈر دیکھنے کے لئے دنیا کے ہر حصّے سے لوگ آتے ہیں۔ پاکستان کے تاریخی ذخیروں میں موہنجوداڑو اہمیت کے لحاظ سے سب سے اُونچا ہے۔ اس کا حال شوکت علی صاحب سے سُنیئے :۔

موہنجوداڑو

لاڑکانہ سے موہنجوداڑو بہت قریب ہے یعنی صرف ۲۵ میل، جہاں تاریخ کا ایک قدیم ترین باب مدتوں سے زیرِ خاک دفن ہے۔ اس شہر کو دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ زمانہ قدیم میں جو شہر اعلیٰ تہذیب و تمدن کا گہوارہ تھا نہ معلوم اس پر کیا کیا بلائیں نازل ہوئیں کہ برباد ہو گیا اور اس شہر کی عظمت پر ایک مستقل تاریکی کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ نہ یہاں کوئی آبادی ہے۔ اور نہ وُہ چہل پہل۔ آج آپ اگر موہنجوداڑو پر نظر ڈالیں تو آپ کو صرف چند قدیم یادگاریں بکھری ہوئی نظر آئیں گی اور بس۔ آج سے ۲۰۔ ۲۵ سال پہلے اس شہر کی تاریخی اہمیت کا کسی کو علم نہ تھا۔ محکمہ آثارِ قدیمہ کے چند ماہرین اتفاقاً اُدھر آنکلے اور نہ معلوم انھوں نے اس سرزمین میں کیا دیکھا کہ ۱۹۲۴ء میں کھدائیوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔

موہنجوداڑو کے بارے میں عجیب و غریب روایات مشہور ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ یہاں آریا قوم کے لوگ آباد تھے اور کسی کا خیال ہے کہ آریا نہیں بلکہ کوئی اور قوم آباد تھی۔ بہر حال محققین نے اتنا ضرور ثابت کر دیا ہے کہ یہاں کے باشندے آریا نسل کے نہ تھے کیونکہ اس شہر کی اور آریا قوم کی تہذیب میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ موہنجوداڑو کے لوگ بھی ہماری طرح مہاجر بن کر سندھ میں داخل ہوئے۔ مشرقِ وسطیٰ میں نہ معلوم ان پر ہماری طرح کیا کیا انقلاب آئے ہوں گے کہ یہ بیچارے اپنا ملک چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔ بہر حال

یہ لوگ دریائے سندھ کی وادی میں وارد ہوئے اور اس شہر کو انہوں نے اتنا فروغ بخشا کہ آج تمام دنیا میں اس شہر کے چرچے ہیں۔

یہاں آپ کو ایک سرکاری عجائب خانہ نظر آئے گا جہاں حکومتِ پاکستان کی طرف سے ایک افسر مقرر ہے اس کا کام یہ ہے کہ لوگوں کو شہر کی سیر کرائے اور ان کو اس کی تاریخی اہمیت سے آگاہ کرے۔ عجائب خانے میں داخل ہونے کے بعد یہ افسر آپ کو ایسی ایسی چیزیں دکھائے گا کہ آپ کی عقل دنگ رہ جائے گی اور جب وُہ آپ کو یہ بتائے گا کہ یہ تمام نوادرات حضرت عیسٰیؑ کی پیدائش سے بھی ۳ ہزار سال پہلے کے ہیں تو آپ کو اور زیادہ تعجب ہوگا۔ یہاں پتھر کے ہتھیار، زیورات، خوشنما برتن، جواہرات، بت، پتھر کی مہریں، سکّے اور کھلونے موجود ہیں۔ دیکھیے انہیں کتنا عرصہ گزر چکا ہے لیکن آج بھی وُہ اسی آب و تاب سے عجائب گھر میں محفوظ ہیں۔ عجائب گھر سے فراغت پانے کے بعد اب آپ شہر کی طرف آئیے۔ دور سے نظر ڈالنے پر تو آپ کو شاید اس کی اہمیت کا اندازہ نہ ہو سکے۔ جوں جوں آپ قریب آتے جائیں گے آپ کی دلچسپی بڑھتی جائے گی۔ شہر میں کشادہ گلیوں اور چوڑی چوڑی سڑکوں کے علاوہ دو منزلہ مکانات نظر آئیں گے۔ مکانات میں داخل ہونے کے بعد آپ دیکھیں گے کہ یہ مکانات پختہ اینٹوں سے تعمیر کئے گئے ہیں۔ ایسی پختہ اینٹیں کہ آج کئی ہزار سال بعد بھی اسی طرح موجود ہیں۔ سیڑھیاں بھی اینٹوں کی بنی ہوئی ہیں۔ ان مکانات کی بنیاد کچی اینٹوں پر ڈالی گئی ہے۔ ہر مکان میں کمرے ہیں۔ کمروں کے علاوہ ایک کنواں اور ایک غسل خانہ بھی موجود ہے۔ آج کل کا زمانہ کتنی ترقی کر چکا ہے لیکن کتنے ایسے شہر ہیں جہاں زمین دوز نالے اور نالیاں پائی جاتی ہیں۔ لیکن موہنجو دارو میں آپ کو زمین دوز نالیاں ملیں گی۔ انہیں دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ اس قدیم زمانے میں لوگ کتنے زیادہ متمدن ہوتے تھے اور حفظانِ صحت کے اصولوں سے کس درجہ باخبر۔

کہا جاتا ہے کہ حمام زمانہ جدید کی اختراع ہے لیکن اگر آپ موہنجو دارو کے حمام پر نظر ڈالیں تو یہ خیال بھی باطل ہو جائے گا۔ یہاں ایک بہت بڑا حمام موجود ہے۔ بیچ میں ایک حوض ہے جو ۳۹ فٹ لمبا ۲۳ فٹ چوڑا اور ۸ فٹ گہرا ہے۔ حوض کے چاروں طرف برآمدے ہیں اور ہر برآمدے کی پشت پر بے شمار کمرے بنے ہوئے ہیں۔ ذرا اور آگے چلیئے تو آپ کو ایک خاص قسم کی گول عمارت ملے گی ایسی عمارتیں اسٹوپا کہلاتی ہیں۔ جن میں مہاتما بدھ کے تبرکات دفن کئے جاتے تھے۔

اس شہر کی بیشمار مہریں اور مجسمے مشرقِ وسطیٰ اور مشرقِ بعید کے ملکوں میں ملے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کے لوگ ان ملکوں کے ساتھ تعلقات کر چکے تھے وُہ تعلقات خواہ تجارتی ہوں خواہ سماجی۔ اس شہر کی مہروں اور مجسموں سے یہاں کے لباس کا بھی پتہ چلتا ہے۔ عورتیں لمبے لمبے کرتے اور کڑھی ہوئی ساڑھیاں پہنتی

تھیں۔ زیورات کا عام رواج تھا۔ مرد پگڑیاں، کوٹ اور قمیص استعمال کرتے تھے۔ مردوں میں بھی زیورات کا استعمال بکثرت پایا جاتا ہے۔ اس شہر کو کھودنے کے بعد بہت سے انسانوں کے ڈھانچے بھی ملے جن سے پتہ چلتا ہے کہ ایکا ایکی اس شہر پر کوئی ناگہانی آفت آئی جس نے ساری عمارتوں۔ آبادی اور اس تہذیب کو راکھ کا ڈھیر کر دیا۔

المنصورہ

سندھ کے ایک اور قدیم تاریخی مقام کا ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔ یہ حال بھی شوکت علی صاحب نے لکھا ہے:۔

۹۴ھ میں محمد بن قاسم نے اس شہر کو فتح کر کے اس کا نام المنصورہ کر دیا تین سو سال تک عرب اس شہر پر قابض رہے اور علوم و فنون اور صنعت و حرفت میں جتنا فروغ اس شہر کو حاصل ہوا شاید ہی کسی اور شہر کو نصیب ہوا ہو۔ مگر آج آپ المنصورہ پر ایک نظر ڈالیں تو آپ کو سوائے ایک چٹیل میدان کے اور کچھ نہ ملے گا۔ ہاں ایک کونے میں چند کھنڈرات ضرور ملیں گے۔ اور لے دے کے یہی کھنڈرات اس شہر کی کل کائنات ہیں ورنہ تہذیبِ حجازی کے جملہ آثار لاکھوں من مٹی کے نیچے دفن ہیں۔

آیئے ذرا اس شہر کی تاریخ پر تھوڑی سی روشنی ڈالیں۔ دیبل اور نیرون کوٹ فتح کر کے ۹۴ھ میں محمد بن قاسم نے اس شہر کا رُخ کیا۔ اس وقت یہاں ایک ہندو راجہ حکومت کرتا تھا جس کا نام جے سنگھ تھا۔ لیکن حملے کے وقت راجہ کسی کام سے باہر گیا ہوا تھا۔ وزیر نے جب عربوں کی آمد آمد کی خبر سنی تو فوراً قلعے کے دروازے بند کرا دیئے محمد بن قاسم نے اپنے قاصد وزیر کی طرف دوڑائے تاکہ بغیر لڑے شہر مسلمانوں کے حوالے کر دے لیکن وزیر تو اپنی طاقت کے نشے میں چُور تھا۔ بھلا مٹھی بھر عربوں کو کیا گردانتا۔ قاصدوں کو سخت سُست کہہ کر واپس کر دیا۔ چنانچہ اب عربوں کے پاس سوائے جنگ کے اور کوئی چارہ نہ تھا۔ محمد بن قاسم کا اشارہ پاتے ہی عرب فوجوں نے بڑھ کر تمام قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ لیکن قلعہ نہایت مستحکم تھا اور چاروں طرف گہری گہری کھائیاں تھیں۔ اس لئے قلعہ میں داخل ہونا کوئی آسان کام نہ تھا۔ محاصرے نے اتنا طول کھینچا کہ چھ مہینے گزر گئے۔ اور کوئی خاص نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ اسی اثنا میں راجہ جے سنگھ بھی واپس آ گیا لیکن محاصرے کی وجہ سے نہ تو وہ قلعے میں داخل ہو سکتا تھا اور نہ اپنی فوج کو کسی قسم کی مدد بہم پہنچا سکتا۔ اس نے بالا ہی بالا عربوں کی رسد کا سلسلہ منقطع کر دیا جس کی وجہ سے عرب فوج میں کھلبلی مچ گئی۔ لیکن محمد بن قاسم ہمت کا پہاڑ تھا۔ بھلا ایسی چیزیں اسے کیا متزلزل کر سکتی تھیں۔ فوراً اس نے صارم اور عبدالملک کو فوج دے کر راجہ کے مقابلے میں روانہ کیا۔ عرب فوج کو دیکھتے ہی راجہ کے اوسان خطا ہو گئے۔ وہ اپنے اہل و عیال سمیت میدان چھوڑ کر بھاگ نکلا۔ اس آفت سے نجات پانے

کے بعد محمد بن قاسم نے اپنے سپاہیوں کو کمندوں کے ذریعہ قلعہ میں اتار دیا جنہوں نے اندر داخل ہو کر قلعے کے دروازے کھول دیئے اور تمام عرب فوج بہ آسانی قلعے میں داخل ہو گئی۔ شکست خوردہ فوج جو بچی دروازے کے قریب جمع ہوئی اور مشورہ کر کے اپنے قاصد محمد بن قاسم کی خدمت میں بھیج کر صلح کی التجائیں شروع کیں۔ مسلمان کی تلوار کبھی کمزور پر نہیں اٹھتی محمد بن قاسم بھی مسلمان تھا فوراً دشمنوں کو امان دی۔

اُس کے بعد المنصورہ پر عرب تین سو سال تک حکومت کرتے رہے اور عربوں نے اس شہر کو اتنا فروغ دیا کہ دور دور سے عرب قبیلے ہجرت کر کے اس شہر میں آ بسے۔ یہ لوگ اپنی روایات کے علاوہ بہت سے علوم بھی ساتھ لے کر آتے۔ اور چند ہی سال میں المنصورہ علوم و فنون کا مرکز بن گیا۔ دور و دراز ممالک سے لوگ یہاں آتے تھے اور فقہ، طب اور فلسفے کے درس لیا کرتے تھے۔

اِتنا تو آپ کو معلوم ہو گیا کہ اس شہر کی شہرت ہر چہار طرف پھیل چکی تھی۔ اب آپ خود ہی سوچیئے کہ یہاں کیا کچھ موجود نہ ہو گا۔ عالیشان مسجدیں اور عمارتیں ہوں گی بڑی بڑی درس گاہیں اور خانقاہیں موجود ہوں گی، جن کا نام و نشان تک نہیں ملتا کسے معلوم کہ عربوں کے زمانہ میں یہی المنصورہ تحتانی سندھ کا دارالخلافہ تھا۔

جوں جوں زمانہ گزرتا گیا عربوں میں تن آسانی بڑھتی گئی۔ مقامی راجپوتوں اور جاٹوں نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور خم ٹھوک سامنے آ گئے۔ عرب اپنا قدیم شہر چھوڑ کر بھاگے۔ اور کچھ میل کے فاصلے پر ایک نہر کے کنارے پناہ لی اور وہیں آباد ہو گئے۔ یہ شہر المنصورہ کے بالکل مقابل واقع تھا۔ عربوں نے اس کا نام المحفوظہ رکھا۔

عربوں کے بعد المنصورہ کی تاریخ پر تاریکی کا پردہ پڑ جاتا ہے۔ جو اب تک بدستور ہماری نظروں کے سامنے حائل ہے۔ عربوں کے بعد المنصورہ پر سومرہ، سمہ، غزنیہ، ترخاں اور کلہوڑہ خاندان کے بادشاہوں کا تسلط رہا لیکن کسی نے اس شہر کی تاریخی اہمیت کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ اور یہ شہر برباد ہوتا چلا گیا۔ افسوس کہ حجازی تہذیب کا عالی شان ایوان بیخ و بُن سے اکھڑ گیا اور اسلاف کا نام قصّۂ پارینہ بن کر رہ گیا۔ آج اس شہر کو دیکھنے کے بعد بے ساختہ زبان سے نکلتا ہے ؂

رو لے اب دل کھول کر اے دیدۂ خوننابہ بار
وُہ نظر آتا ہے تہذیبِ حجازی کا مزار

تلاشِ روزگار

نئی بستیاں بسانے سے پہلے مہاجرین کو روزگار تلاش کرنا پڑتا ہے۔ کراچی کی ایک مشنری کمپنی

نے روزگار کے متلاشی مہاجرین کی سہولت کے لئے افسر مقرر کیا ہے۔ جو امیدواروں سے ملاقات کر کے ان کی کیفیت لکھ لیتا ہے۔ اس دلچسپ کام کا حال سمیع اللہ خاں سے سنیئے:۔

ہر وہ شخص جو میرے پاس آتا ہے۔ چاہے اس کے لئے میرے پاس نوکری کی جگہ ہو یا نہ ہو اپنی دردبھری کہانی و واقعات سنانے لگتا ہے مثلاً صاحب میں حیدر آباد کا رہنے والا ہوں۔ پولیس ایکشن کے بعد مجھے وہاں سے بھاگنا پڑا۔ میرا سب سامان لٹ گیا۔ بہت سے عزیز و اقربا مارے گئے میں بڑی مشکل سے اپنی جان بچا کر بھاگ آیا ہوں۔ میرے پاس آج کل بالکل رقم نہیں ہے کہ میں کراچی جیسے شہر میں بیکار رہوں۔ دوسرے میں آج کل اپنے ایک دوست کے ہاں ٹھہرا ہوا ہوں۔ میں آپ کا بیحد ممنون و مشکور ہوں گا۔ اگر آپ مجھے اپنے یہاں کسی بھی قسم کی ملازمت میں رکھ لیں۔ میں اس وقت کلرکی بھی کر سکتا ہوں حالانکہ میں حیدر آباد میں تحصیلدار کے عہدہ پر لگا ہوا تھا۔ یہ بڑا مصیبت کا زمانہ ہے وہاں مجھے ۳۰۰ روپے ملتے تھے۔ مگر آپ مجھے ۷۰ یا ۸۰ کی نوکری دے دینگے تو مجھے منظور ہے۔ میرے رشتہ دار خاص کر والدہ صاحبہ اور بہن و بھائی سب حیدر آباد میں ہیں بڑی مصیبت سے دن گزار رہے ہیں۔ اگر میں آپ کے یہاں ملازم ہو گیا تو میں ان کو یہاں بلا لوں گا اور مدد کر سکوں گا۔

عام طریقہ یہ مہاجرین جو ملازمت کے لئے آتے ہیں ان میں ایک بات دیکھی گئی ہے کہ وہ اس قدر گھبرائے ہوئے پریشان حال اور ڈرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ کہ جس کا کوئی ٹھکانہ نہیں۔ حالانکہ اس کا اثر انٹرویو کرنے والے پر بہت ہوتا ہے۔ اس کو یہ خیال پیدا ہوتا ہے (جیسا کہ مجھے بھی ہوتا ہے) کہ شاید یہ ہمارے یہاں زیادہ عرصہ تک نہ ٹھہر سکے گا کیونکہ اس وقت تو صرف ملازمت کی تلاش میں ہیں جب ملازمت مل گئی اور کچھ پیسے جمع ہو گئے چلتے نظر آئیں۔ یہ رویہ ایک کمپنی کو پسند نہیں آتا کہ اس کا ملازم آج تو نوکری پر آئے اور دو چار ماہ کے بعد چلا جائے۔ کمپنی مستقل مزاج لوگوں کو ترجیح دیتی ہے۔

بعض لوگ تو یہ کہتے ہیں کہ صاحب میرے ذمہ میری والدہ ہیں۔ دو چھوٹے بھائی ہیں اور بہنیں۔ بتائیے مجھے تو ان کے لئے نوکری کرنا ہے تا کہ ان کی گزر کا ذریعہ بنوں۔ بعض صاحب بہت بلند طریقے پر کہتے ہیں کہ صاحب ہماری کوششوں سے پاکستان بنا ہے اور اب آپ ہمیں اس کی خدمت کرنے کا ضرور موقع دیجئے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ صاحب ہماری درخواست ہی رکھ لیجئے تا کہ آئندہ کوئی جگہ خالی ہو تو ہمیں موقع دیا جائے۔ اور درخواستوں کا یہ حال ہے کہ میری ۲-۳ درازیں بھری ہوئی ہیں اور سوچتا ہوں کہ یہ تو دن بدن ڈھیر

سا لگتا جاتا ہے۔ اور رکھنے کی جگہ نہیں ہے۔ میں اپنی عادت کے موافق کسی سے یہ نہیں کہتا کہ وہ درخواست میرے پاس نہ دے۔

امیدواروں میں زیادہ تعداد نوجوانوں کی ہوتی ہے۔ مگر اکثر ۴۰ اور ۵۰ سال تک کے اشخاص بھی نوکری کی تلاش میں میرے پاس آتے ہیں۔ ان کی حالت ضرور قابلِ توجہ ہوتی ہے جب کہ وہ کہتے ہیں کہ صاحب ہمارے اتنے بچے ہیں۔ اور دوسرے کے گھر میں پڑے ہوتے ہیں سب کچھ لٹا کر آئے ہیں۔ یہ عمر ایسی نہیں کہ مصیبت اٹھائیں۔ ہم نے بڑے عمدہ طریقے سے اپنی زندگی بسر کی ہے۔

گھر کے متعلق ہر شخص تکلیف ظاہر کرتا ہے۔ دورانِ گفتگو میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی تو اپنے عزیز کے یہاں قیام پذیر ہے۔ اور کوئی اپنے دوست احباب کے ساتھ کمرہ میں شرکت کئے ہوتے ہے۔ ملازمت میں ان لوگوں کو زیادہ ترجیح دی جاتی ہے جو شادی شدہ ہوتے ہیں اور جن کے پاس یا تو گھر کا مکان ہوتا ہے یا اپنے کسی خاص عزیز کے یہاں مہمان ہوتے ہیں۔ کیونکہ اس قسم کے لوگ زیادہ ذمہ دار خیال کئے جاتے ہیں۔

بازاروں کے نام

قدیم تاریخی شہروں کی عظمت یاد رکھنے کے ساتھ ساتھ ہمیں پاکستان میں نئے شہروں اور نئی بستیوں سے بھی سابقہ پڑ رہا ہے۔ نئے شہروں میں خاص طور سے بازاروں کے نام رکھنا ایک فن سے کم نہیں۔ اس سلسلہ میں میکسیکو سے پروفیسر احمد شاہ بخاری نے ایک دلچسپ خط وزیر مہاجرین خواجہ شہاب الدین کے نام لکھا ہے جس میں نئے بازاروں کے ناموں سے بحث کی ہے۔ ہم اس خط کے چند حصے ہدیۂ قارئین کرتے ہیں:۔

جہاں تک مجھے نظر آیا یہاں کسی بازار یا سڑک کا نام کسی زندہ شخص سے منسوب نہیں۔ ہمارے لاہور کی طرح نہیں کہ جو شخص دو تین سال کے لئے میونسپل کمشنر ہوا۔ وہ کسی سڑک کو اپنے نام سے مزین کر گیا۔ چنانچہ لاہور میں کئی سڑکوں اور محلوں کے نام اب ایسے ہیں کہ کسی کو یاد بھی نہیں کہ کن کے نام سے منسوب ہوئے تھے۔ اور اگر وہ اب تک زندہ ہیں تو کب کے گمنام یا بدنام ہو چکے ہیں۔ میکسیکو کی تاریخ خونیں تاریخ ہے تین سو سال تک یہاں ہسپانوی حکمران رہے اور لوگوں کا خون چوستے رہے۔ ۱۸۲۰ء کے لگ بھگ اس ملک نے

بزورِ شمشیر آزادی حاصل کی۔ اس کے بعد سوا سو سال تک نحانہ جنگی رہی جس میں بڑے بڑے لٹیرے اور بڑے بڑے اولوالعزم محبِّ وطن دونوں قسم کے لوگ پیدا ہوئے۔ سنہ ۱۹۱۰ء میں ایک انقلابِ عظیم ڈکٹیٹری کے خلاف برپا ہوا۔ جو کئی سال تک رہا اور جس میں میکسیکو کے بیشتر مرد مارے گئے۔ اس سوا سو سال کی تاریخ میں کئی محبانِ وطن اور مشاہیرِ قوم بروئے کار آئے۔ اور اکثر قوم کی راہ میں شہید ہوئے یعنی قوم کے دشمنوں یا غداروں یا کوتاہ نظر لوگوں اور اہلِ ہوس کی گولی یا تلواروں کا نشانہ بنے۔ ان سب کے نام آج بازاروں کی زینت ہیں محض ان ناموں ہی سے میکسیکو کی قومی عروج کی تاریخ مرتب ہو سکتی ہے۔

اس کے علاوہ ایک ادا ان کی مجھے بہت پسند آئی۔ وُہ یہ کہ کئی بازاروں کے نام داستانِ قوم کی اہم تاریخوں سے منسوب ہیں۔ آپ کو یاد ہو گا کہ پیرس میں بھی ایک مشہور بازار کا نام "۴ ستمبر" ہے۔ یہاں یہ اسم بہت عام ہے۔ ہر بڑے شہر میں ایک نہ ایک بازار کا نام "۵ مئی" ضرور ہو گا۔ اس تاریخ کو سواریز کی حکومت نے فرانسیسیوں کو شکست دی تھی۔

میکسیکو کا شہر اچھا خاصا وسیع ہے۔ آبادی ۱۵ لاکھ کے قریب ہے۔ چنانچہ سینکڑوں بڑے اور چھوٹے بازار ہیں۔ ناموں کی تلاش میں یہاں کے اربابِ اقتدار نے بڑی بڑی جدتیں دکھائی ہیں۔ اپنے مشاہیر کے ناموں اور اپنی تاریخ کے اہم واقعات سے پورا فائدہ اٹھا چکے تو دنیا کی تاریخ اور دنیا کے جغرافیہ کی طرف رجوع کیا۔ یورپ کا کوئی مشہور شہر یا دارالخلافہ ایسا نہیں جس کے نام پر کسی نہ کسی بازار کا نام نہ ہو۔ ایک بازار کا نام پیرس بازار ہے۔ ایک کا نام مارسیلز۔ ایک کا نام لندن وغیرہ وغیرہ۔

ایک اور علاقہ ایسا ہے کہ اس میں سب بازاروں کے نام دنیا کے مشہور دریاؤں پر رکھے گئے ہیں مثلاً نیل۔ ڈینیوب۔ دجلہ۔ فرات۔ رائن وغیرہ۔ شہر کے ایک اور علاقہ میں سب بازاروں کے نام دنیا کے مشہور اہلِ فن اور اہلِ علم کے ناموں پر رکھے گئے ہیں۔ مثلاً شیکسپیئر۔ ڈارون۔

لیکن جہاں کسی بازار کا نام پہلے ہی کوئی خاص تاریخی یا اسی قسم کی کوئی اور اہمیت رکھتا ہو اسے بالکل نہیں بدلتے خواہ یہ تاریخی اہمیت قومی ہو یا محض مقامی اور خواہ کوئی ادبی یا کوئی اور اہمیت ہو۔ اس کی مثال لاہور میں یہ ہے کہ انار کلی بازار۔ چوک وزیر خاں۔ تیر اندازکی گلی۔ ایسے نام نہ بدلے جائیں۔ کیونکہ ان میں مقامی تاریخ کے کئی دلچسپ پہلو پائے جاتے ہیں۔ یہاں ہر شہر کا اپنا ایک عجائب خانہ ہے جس میں مقامی تاریخی تصاویر یا نقشے یا دیگر یادگاریں اور علاوہ بر آں مقامی صنعت و حرفت کے نمونے خاص طور پر رکھے جاتے ہیں تاکہ سیّاح فوراً اس شہر کی تمام خصوصیات سے آگاہ ہو جاتے اور اہلِ شہر خود بھی جان لیں کہ ان کے شہر کی تاریخ میکسیکو کی قومی زندگی میں باعتبار صنعت و حرفت اور فنِ کارگیری کے کیا اہمیت رکھتی ہے۔

تاریخِ اسلام کئی مشاہیر کے ناموں سے پُر ہے اور عالمِ اسلام میں کئی شہر مثلاً مکہ۔ مدینہ۔ بغداد۔ قرطبہ۔ غرناطہ

ایسے ہیں جو قوم کے ذہن میں محکم ہو جائیں تو احساسِ قومی کو تقویت پہنچے گی۔ تہذیب اسلامی علاوہ ہذا کئی مشہور حکما اور ادیبوں کی ممنونِ احسان ہے۔ مثلاً جلال الدین رومیؒ۔ خواجہ معین الدین چشتیؒ یا شعرا میں حافظ عمر خیام اور ہمارے اپنے شعرا میں غالب۔ ذوق۔ محمد حسین آزاد وغیرہ وغیرہ۔ مزید غور کیا جائے تو ہماری تاریخ اور تہذیب کے کئی اور پہلو ایسے اور نکلیں گے جن سے ہماری قوم کو آگاہ ہونا چاہیئے۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ اس نقطہ نظر سے تجویز اور مشورے کے طور پر ناموں کی ایک فہرست مرتب کی جائے۔ اور اس فہرست کو پاکستان کے تمام صوبوں اور صوبوں کی معرفت میونسپل کمیٹیوں کے پاس بھیجا جائے۔ اور ان کی توجہ بالوضاحت اس مقصد کی طرف مبذول کرائی جائے۔ جو اس کی تہ میں ہے اور اس غرض کے لیئے ہر جگہ ہوشیار لوگوں کی کمیٹیاں بنائی جائیں۔ جو شہر کے تمام بازاروں کے ناموں پر غور کریں

لیاری کوارٹر

نئی بستیاں بعض دفعہ اِس بے ترتیبی سے بنائی جاتی ہیں کہ ان کی حالت پرانے کھنڈروں سے زیادہ ابتر ہو جاتی ہے۔ یہی حال کراچی کے قریب ایک بستی کا ہے۔ مسز خورشید مرزا اس بستی کی حالت سدھارنے کے لئے کراچی کی خواتین کی کوششوں کا حال سنائیں گی۔

لیاری کوارٹر کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ کراچی کے اس بدنصیب محلے کے بارے میں اخباروں میں اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ میں اس پر صرف ایک سرسری تنقیدی نظر ڈالوں گی تاکہ سننے والوں کو اس کا اندازہ اچھی طرح ہو جائے کہ اِس محلے کی حالت کیا تھی۔ کیا ہے۔ اور سُدھار کر کیا بنانے کا ارادہ ہے۔

لیاری کوارٹر میں گھستے ہی ایسا معلوم ہوتا ہے گویا خانہ بدوشوں کے کیمپ میں آ گئے۔ کیونکہ پچھتر فی صدی گھر یا جھونپڑیاں محض چٹائیوں سے چار دیواری گھیر کر چھت ڈالی ہوئی ہے۔ کسی لائن یا قاعدے کے مطابق یہ گھر نہیں بنے ہیں۔ جگہ جگہ لوگوں نے نالیاں کھودی ہیں جس میں ہر طرح کی غلاظت بارہ مہینے سڑتی رہتی ہے۔ اچانک کوئی پکا گھر نظر آ جاتا ہے تو اس قدر تعجب ہوتا ہے کہ گویا سمندر میں جزیرہ نظر آ گیا۔ اور ان گھروں کے اندر گھس کر تو انسان صورت سوالی بن کر رہ جاتا ہے۔ کیونکہ اکثر میں بجلی بھی لگی ہوئی ہے۔

سب سے زیادہ تکلیف جو وہاں کے لوگوں کو ہے وہ پانی کی کمی اور پکی نالیاں نہ ہونے کی ہے طبیعتاً وہاں کی عورتیں اپنی ذات کے لئے خاصی صفائی پسند ہیں۔ ان کے ٹوٹے پھوٹے جھونپڑے بھی اندر سے جھاڑو دے نسبتاً صاف ستھرے ہوتے ہیں۔ لیکن شہریت کے اصول کی چونکہ ہم لوگوں میں بے حد کمی ہے۔ لہٰذا اطمینان سے اپنے گھر کا کوڑا کرکٹ اپنے پڑوسی یا اپنے ہی دروازے کے باہر پھینک دیا جاتا ہے۔ اور اس کا نتیجہ ہے کہ باہر سے ہر گھر کے آس پاس چھلکوں کے ڈھیر، بچوں [illegible] غلاظت گندگی و دیگر دفینہ پڑا دکھائی دیتا ہے۔

ان تمام باتوں کو دیکھتے ہوئے اپوا یعنی آل پاکستان ویمنز ایسوسی ایشن نے اس جگہ کو سدھارنے کا کام اپنے ذمہ لیا ہے اور اس سلسلہ میں جو کام شروع ہو گیا ہے۔ اس کو میں مختصر طور پر یہاں بیان کروں گی۔

۱۔ سب سے اہم کام ہے حفظانِ صحت کے اصول سکھانا۔

۲۔ بچوں کی تعلیم و تربیت کی ہدایت دینا۔

۳۔ دستکاری سکھانا و اجرت پر کام بنوانا۔

اب سنیئے کہ جن بہنوں کی ڈیوٹی ہوتی ہے وہ کس طرح اپنی ڈیوٹی کو بجالاتی ہیں۔

سب سے پہلے وُہ گھر گھر پھرتی ہیں۔ تاکہ ہر گھر کا معائنہ کریں کہ آیا عورتیں سکھاتے ہوئے اصولوں پر کاربند ہیں یا نہیں۔ گندے گھروں کا نمبر نوٹ کر لیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ جو سب سے صاف ستھرا گھر ہوتا ہے اس کا بھی نمبر نوٹ کر لیا جاتا ہے۔

اسی سلسلہ میں عورتوں کو کپڑا دھونے کے صابن بھی دیئے جاتے ہیں۔ اور چھوٹی موٹی بیماری کا بھی یہ بہنیں علاج کرتی ہیں۔ مثلاً بچوں کے پھوڑے۔ پھنسیاں۔ آنکھیں دکھنے آنا۔ پیٹ کی خرابی وغیرہ وغیرہ۔

نمبر ۲ یعنی بچوں کی تعلیم و تربیت کے سلسلہ میں ایک چھوٹا سا مدرسہ کھولا گیا ہے۔ جس میں تمام محلے کے بچے قاعدے سے بیٹھ کر تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ وہیں کی دو پڑھی لکھی عورتوں کو استانیاں مقرر کر دیا گیا ہے۔

یہی مقرر کی ہوئی استانیاں عام طور پر دستکاری بھی سکھاتی ہیں۔ سچ پوچھیئے تو پھول پتی کاڑھنے میں وہاں کی ہر خاص و عام عورت اس قدر ماہر ہے کہ سکھانا تو درکنار ہم الٹا ان سے سیکھ سکتے ہیں لیکن اب تک ان کی تمام تر توجہ اپنے ڈھیلے ڈھالے کرتوں پر حاشیئے کاڑھنے ہی پر تھی۔ اب اپوا کے زیر اہتمام عورتیں اُجرت پر میز پوش۔ تکیہ کے غلاف۔ ٹی کوزی۔ لنچ سٹ وغیرہ کاڑھنے لگی ہیں۔ اس کے علاوہ جو نمونہ بھی آپ دیں اور جس چیز پر بنوانا چاہیں وُہ جھٹ پٹ اتار لیتی ہیں۔ اور بے حد صفائی سے کاڑھ کر دیتی ہیں۔

اس کے علاوہ ایک بہت ہی اہم چیز کی وہاں کمی تھی وہ ہے صحیح مذہبی تعلیم۔ اس کمی کو بھی آسان لفظوں میں مذہبی مسائل سمجھا کر پورا کیا جاتا ہے۔ تعلیمی فلمز بھی دکھائی جاتی ہیں۔ ان کی تکلیفات کو رفع کرنے اور ان کے معیارِ زندگی کو اونچا کرنے کی کوشش جاری ہے۔ ایک لاری بھر کر پانی بھی ان کو روز ہی پہنچایا جا رہا ہے اور کوشش اور زیادہ پانی سپلائی کرنے کی ہو رہی ہے اس تمام کوشش میں جو کچھ صرفہ ہوتا ہے۔ وہ اپوا برداشت کرتی ہے۔ اس سلسلہ میں ۲۶ جون کو وہاں بڑا بھاری جلسہ ہوا جس کی صدارت بیگم لیاقت علی خان صاحبہ نے کی۔ اس تمام عرصہ میں جس عورت کا گھر سب سے صاف رہا ہے اور جس نے باقاعدہ سب سکھاتے ہوئے اصولوں پر عمل کیا ہے۔ اس کو معقول انعام دیا گیا جس سے تمام محلے کی عورتوں پر بڑا اچھا اثر پڑا۔

ہماری پریشانیوں کا حل

جہاں میں رہتا ہوں اس کے قریب ہی سڑک پر ہر روز صبح شام میں ایک بڑی سی موٹر دیکھتا ہوں۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے تو اس موٹر میں ۲۵ - ۳۰ عورتوں اور مردوں سے کم نہیں ہوتے موٹر کے ہر حصے پر سواریاں بیٹھی نظر آتی ہیں۔ اور ایک کے اوپر ایک معمولی حالات میں اگر مسافر اس قدر ٹھس کر بیٹھیں تو ان میں آپس میں جھگڑا ہو جائے۔ مگر اس موٹر کے مسافر نہایت عافیت اور قناعت سے سفر کرتے ہیں۔ اور یہ اُن کا روز کا معمول ہے۔ میں انہیں آپس میں اکثر ہنستے بولتے بھی دیکھتا ہوں۔ مگر آج تک انہیں کبھی ایک دوسرے سے جھگڑتے نہیں دیکھا۔

میرا خیال ہے کہ یہی حال ہماری پریشانیوں اور مصیبتوں کا بھی ہے۔ اگر ہم پریشانیوں پر غور کرنا شروع کر دیں تو معمولی معمولی باتیں بھی پہاڑ بن کر نظر آنے لگتی ہیں۔ اور اگر انسان صبر اور برداشت پر اتر آئے تو پہاڑ جیسی مصیبتیں بھی کٹ جاتی ہیں۔ اس معاملے پر غور اور بحث کرنے کے لئے آج میں نے چار دوستوں کو دعوت دی ہے۔ ایک ملّا واحدی صاحب ہیں۔ جو دلّی سے مہاجر بن کر کراچی آئے ہیں۔ دوسرے ابوالحسن شادانی صاحب حیدر آباد دکن کے مہاجر۔ تیسرے مجید لاہوری کراچی کے اخبار نویس اور چوتھے عزیز ہند جھانسی کے ایڈیٹر محمد رفیق چشتی صاحب۔

ان چاروں حضرات سے فرداً فرداً میں نے یہ سوال پوچھا تھا کہ ہمیں پریشانیاں کیوں ہوتی ہیں۔ اور ان کا علاج کیا ہے؟ اب ان حضرات کے جوابات سُنیئے۔ سب سے پہلے ملّا واحدی صاحب اس سوال کا جواب دے رہے ہیں:۔

دو قسم کی پریشانیاں

مہاجرین دو قسم کی پریشانیوں میں مبتلا ہیں۔ ایک قسم کی پریشانی کا علاج تدبیر اور کوشش سے ہو سکتا ہے لیکن دوسری قسم کی پریشانی کو دُور کرنا انسانی بس کی بات نہیں ہے۔

پہاڑ گنج دلّی میں ایک حیثیت دار بزرگ رہتے تھے۔ ستم ظریف سفاکوں نے ان کے خاندان کے ایک ایک فرد کو قتل کر ڈالا! لیکن خود انہیں تڑپنے کے لئے جیتا چھوڑ دیا۔ سُنتا ہے لاہور میں بڑی بھاری فیکٹری مل گئی ہے

لیکن اب فیکٹری کی آمدنی وہ نہیں کھاتے۔ آمدنی اُن کو کھائے جاتی ہے۔

یا ایک صاحب ہیں کہ دلّی کی یاد اُن کا پیچھا نہیں چھوڑتی۔ دلّی کا تصوّر ہمہ وقت اُن کے دل و دماغ پر چھایا رہتا ہے۔ کراچی میں چلتے پھرتے دلّی کے عیب بھی نظر آجاتے ہیں تو وجد کرنے لگتے ہیں۔ دلّی کا کوئی گھوسی گائیں ہنکاتا جاتا تھا اور گالیاں بکتا جاتا تھا۔ وُہ صاحب دلّی کی گالیاں سُن کر چشم پُر آب ہو گئے۔

صاف ستھرے آدمی ہیں۔ مگر کسی دلّی والے نے دھوبی سقّوں کی طرح پان کا چُونا اُن کے گھر کی دیوار سے پونچھ دیا۔ اس حرکت نے ان کو رُلا دیا۔

جامع مسجد کے سامنے اُردو بازار سے مٹیا محل کی طرف راستہ جہاں مڑتا ہے وہاں ایک پھُول والا بیٹھا کرتا تھا۔ اس پھُول والے کا نہیں، اس موڑ کا اس طرح ذکر کرتے ہیں گویا مجنوں ہیں اور لیلیٰ کی کمر کا ذکر کر رہے ہیں۔

اس قسم کا گھاؤ نہ حکومت بھر سکتی ہے۔ نہ انصار بھر سکتے ہیں۔ نہ مہاجرین آپ بھر سکتے ہیں۔ یہ گھاؤ اللہ ہی بھرے گا تو بھریں گے۔

دوسری قسم کی مصیبت جو مہاجرین پر پڑی ہے۔ وُہ بے گھری اور بے روزگاری کی مصیبت ہے۔ یہ مصیبت مہاجرین باہمی امداد سے اور ہمت سے ضرور ختم کر سکتے ہیں۔ اور اسی مصیبت سے نجات دلانے کی تگ و دو حکومت کر رہی ہے۔ اور اسی کے دفعیہ میں مہاجرین کا اور حکومت کا انصار ہاتھ بٹا سکتے ہیں۔

آپ نے دیکھا ہوگا۔ جو مسافر ریل میں بیٹھ جاتا ہے وُہ نئے مسافر کو اپنے پاس جگہ دیتے کنیاتا ہے۔ بعض مسافر دروازے روک کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور باہر کے مسافروں کا درجہ میں گھُسنا دشوار کر دیتے ہیں۔ یہ ذہنیت مہاجرین میں بھی کار فرما ہے۔ اور مہاجرین نے اس ذہنیت سے نقصان اٹھایا ہے۔ اگر ہر مہاجر دوسرے مہاجر سے اخلاص اور محبت کا اور حقیقی مسلمانوں کا سا برتاؤ اور معاملہ کرے تو حکومت کو مہاجرین کی مدد کرنے میں آسانیاں ہو جائیں اور حکومت کے غلط کار عمال غلط کاریاں نہ کر سکیں۔

مہاجرین ایک تو یہ ذہنیت چھوڑ دیں اور یہ ضد بھی چھوڑ دیں کہ ہم کراچی ہی میں رہیں گے یا لاہور ہی میں رہیں گے اور پھر اوسانوں کو قائم رکھ کر ہمت اور مردانگی سے قدم بڑھائیں۔ انشاء اللہ مصیبت راحت سے بدل جائے گی۔

انصار سے میری فقط اتنی درخواست ہے کہ وہ انصار رہیں۔ مہاجر نہ بنیں۔ بعض انصار نے مہاجرین کی خدمت گزار انصار کا سر نیچا کر دیا ہے اور انصار کی بے شمار خدمات پر پانی پھیر دیا ہے۔

حکومت مہاجرین کی بپتا میں قیامِ حکومت کے پہلے مہینے سے شریک ہے۔ حکومت نے مہاجرین کی بپتا کو اپنی بپتا قرار دے لیا ہے۔ حکومت سے ابتدا ابتدا میں ایک غفلت یا غلطی ضرور ہوئی تھی کہ دستکار مہاجرین کو حکومت نے خفا کر دیا اور نہ جانے کتنے دستکار ہندوستان واپس چلے گئے۔ شاید اس زمانے میں حکومت یہ غلطی

کرنے پر مجبور ہو لیکن اسے اب ایسی صورتیں پیدا کرنی چاہئیں کہ دستکاروں کا پاکستان آنے کو دوبارہ جی چاہ جائے۔ دستکار پاکستان کی عزت اور دولت میں اضافہ کر سکتے ہیں۔

دوسری کمی جو مہاجرین کی امداد کے سلسلہ میں مجھے محسوس ہوتی ہے یہ ہے کہ حکومت نے مہاجرین کو بسانے اور روزگار سے لگانے کا کام مہاجرین سے بہت کم لیا ہے۔

جس نے ہجرت کی پریشانی جھیلی ہے وہی مہاجرین کی پریشانی کو خوب سمجھ سکتا ہے۔ اور مہاجرین سے صحیح ہمدردی کر سکتا ہے۔ چھانٹے جاتے تو مہاجرین ان کی خدمت کے لائق آدمی نکل سکتے تھے۔

ملّا واحدی صاحب سے آپ نے مہاجرین کی پریشانیوں کا حال اور ان کا علاج سن لیا۔ اب میں آپ کا تعارف ابوالحسن صاحب شادانی سے کراتا ہوں۔ ان کی رائے بھی سن لیجئے :-

غریب کا دل

میں اکثر فرصت کے اوقات میں اپنے سچے اور مخلص غریب بھائیوں کے پاس جا بیٹھتا ہوں تاکہ پاکستانی عوام کے رجحانات سے واقف ہو سکوں اور جو غلط فہمیاں ان میں ہوں وہ بھی بات چیت سے دور ہو جائیں۔ ایک دن اتفاق سے میرے بھانجے جو حیدرآباد میں معزز عہدے پر فائز تھے۔ اپنی بیکاری سے انتہائی پریشان نظر آئے۔ کوشش کی کہ طبیعت کو ان کی کسی طرح بہلاؤں۔ سیر کے لئے اپنے بھانجے کو ساتھ لے کر چلا۔ سولجر بازار میں ایک بڑے میاں کی دودھ کی دکان پر ہم دونوں بیٹھ گئے۔ صورت سے معلوم ہوا کہ بڑے میاں بھی انقلاب گردی کا تنکا ہیں میں نے کہا کہ وطن کہاں تھا آپ کا۔ کہنے لگے پٹیالہ۔ پٹیالے میں کیا کرتے تھے آپ۔ بڑے میاں نے جواب دیا کہ بس اس کو نہ پوچھئے جس بات کو بھلا رہا ہوں اسے آپ کیوں یاد دلاتے ہیں میں نے کچھ اس انداز سے اصرار کیا کہ بزرگ سیرت کو اپنی ساری آپ بیتی سنانی پڑی۔ غربت و افلاس کی گود میں پرورش پھر اپنی محنت سے شاندار کامیابی اور اس شاندار کامیابی کے بعد آل اولاد دھن دولت کی حسرت ناک تباہی، پاکستان میں آمد از سر نو جد و جہد سخت دشواریوں کے بعد کامیابی۔ دوسروں کی بے غرضانہ امداد سب باتیں کہہ ڈالیں بوڑھے مسلمان مہاجر نے کہا کہ یہ لڑکے جو دوکان پر کام کر رہے ہیں بابوجی اب میرے ہیں۔ مدرسہ میں نام لکھوا دیا ہے۔ دو لڑکیاں بھی گھر پر ہیں۔ ایک دوکان بہادل پور میں ہے۔ اس پر ایک بابوجی کام کر رہے ہیں۔ ان کی مدد کو بھی دو لڑکے رکھ دیئے ہیں۔ ہر مہینے کی پہلی کو جا کر حساب کرتا ہوں۔ پوری دوکان بابوجی کی اور ان لڑکوں کی ہے۔ مگر یہ بات ابھی میں نے ان لوگوں کو نہیں بتائی ہے۔ اب بابوجی میرا ہے کون ہر پاکستانی اپنا ہے۔ تمہاری دعا سے دس بارہ

سیر دُودھ چھوٹے بچوں کو بغیر پیسے کے پہنچ جاتا ہے۔ اب دل میں اگر کوئی ارمان ہے تو یہی ہے کہ خدا پاکستان کو باقی رکھے پھلے پھُولے اور دن دوگنی رات چوگنی ترقی کرے۔ بڑی مصیبتیں آپڑی تھیں پاکستان پر مگر اللہ نے بچا لیا۔ سب نے مل جل کر مصیبتوں کا مقابلہ کیا۔ البتہ چھوٹی چھوٹی باتوں میں کسر رہ گئی جس سے کئے کرائے پر پانی پھر رہا ہے۔ وہ کیا باباجی۔ بابوجی پانی کی تکلیف کیا بیان کروں ہر جگہ چند باولیاں کھدوا دی جاتیں پینے کا پانی باوَلی سے نہ لیتے نل سے لیتے گھڑا دو گھڑا کافی ہوتا۔ باقی ضرورتوں کے لئے باوَلیوں سے پانی لیتے۔ نلوں پر جو روز جھگڑے ہوتے ہیں۔ کاہے کو ہوتے۔ باباجی اور کیا ہونا چاہیئے تھا جو نہیں ہوا۔ ارے بابوجی ایسے تو بہت کچھ ابھی ہونا ہے۔ دو سال میں جو کیا بہت کیا پھر بھی چند باتوں کی فوری ضرورت ہے کہ کی جائیں۔ یہ بھیک مانگنے والے جلد سے جلد کسی کام پر لگا دیئے جائیں۔ اور جو مجبور و معذور ہوں ان کے لئے امدادی گھر بنائے جائیں۔ ان کے پیچھے جو قابلِ امداد ہوں ان کی مدد کی جائے۔ سڑکوں پر جو رُوح فرسا مناظر دکھیا اور بیمار نظر آتے ہیں ان کو دیکھ کر دل لرز اٹھتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے بچے جو قوم کی بے بہا دولت ہیں پیسہ پیسہ مانگ کر اپنی زندگیاں برباد کر رہے ہیں۔ ان بچوں کو تربیت گاہوں میں داخل کر لیا جائے۔ انہی لاوارث بچوں میں نہ معلوم کتنے کام کے انسان نکل آئیں گے۔

میں نے اپنے بھانجے سے کہا کہ جن ہولناک مصائب سے یہ بڈھا دوچار ہوا اس کا آدھا حصہ بھی تم کو مصائب پیش نہیں آئے۔ اعلیٰ تعلیم پانے کے باوجود تم مایوسی کا شکار ہو رہے ہو۔ اور بڑے میاں باوجود کہ بڈھے ہونے کے بلا کے ہمت کے مالک ہیں۔ ان معیاری کرداروں سے سبق لو۔ مایوسی چھوڑو ایک دن کامیابی حاصل ہوگی یقین کیجیئے کہ میرے بھانجے کو وہ قوتِ عزم و ارادہ حاصل ہوا کہ اس نے مایوسی کو بالائے طاق رکھا اور جدوجہد شروع کی

شادانی صاحب کی رائے آپ نے سُن لی۔ اب مجید لاہوری صاحب سے اس معاملے پر ان کی رائے بھی سُن لیجیئے۔ مجید لاہوری صاحب ایک اخبار نویس ہیں اور اس مضمون پر ایک اخبار نویس کی حیثیت سے ہی رائے دیں گے۔

کھُلی چِٹھیاں

بعض پریشانیاں تو وہ ہوتی ہیں جنہیں واقعی پریشانیوں کا نام دیا جا سکے لیکن بیشتر وہ ہوتی ہیں جو ہم خود پیدا کر لیتے ہیں سمجھتے تو یہ ہیں کہ معاملہ یوں سلجھ جائے گا لیکن سلجھاؤ کی ہر کوشش الجھاؤ ہی پیدا کرتی ہے۔ مثلاً یہ دیکھئے میرے سامنے ایک کھلی چھٹی برائے اشاعت" پڑی ہے۔ عنوان ہے" وزیرِ مہاجرین کے نام کھلی چھٹی"۔
صورت احوال یہ ہے کہ ٹنڈو آدم خان میں ایک صاحب کو مکان کی ضرورت تھی انہوں نے درخواست دی

مکان نہ مل سکا تو وُہ شکایت لے کر سیدھے کراچی آئے۔ پہلے تو وہ رینٹ کنٹرولر کے دفتر کے چکّر کاٹتے رہے۔ آپ ہی کہیئے کہ کراچی کے رینٹ کنٹرولر کا ٹنڈو آدم خان کے مکانوں سے کیا تعلق؟ لیکن صاحب کوشش تو کرنی چاہیئے۔ بہرحال رینٹ کنٹرولر کے دفتر سے سیدھے چلے تو وزیرِ مہاجرین کی کوٹھی پر پہنچ گئے اور اس کوشش میں رہے کہ ملاقات ہو جائے۔ ملاقات نہ ہو سکی تو انہوں نے ایک "کھلی چٹھی برائے اشاعت" لکھی ان کا اصرار ہے کہ یہ ضرور اخبار میں شائع کر دیجیئے۔ اب آپ ہی کہیئے کہ اخبار میں اس چٹھی کے چھپ جانے سے کیا ہوگا۔ صحیح صورت تو یہ تھی کہ وہ پہلے مقامی پٹہ دار سے ملتے وہاں شنوائی نہ ہوتی تو مختار کار سے "کارروائی" کرنے کے لئے کہتے وہاں سے وُہ ڈپٹی کلکٹر تک پہنچ سکتے تھے۔ اگر اس کے باوجود کچھ نہ ہوتا تو پھر کلکٹر موجود تھے۔ مرکزی وزارت کی طرف سے ویلفیئر آفیسر تھے۔ اسسٹنٹ ڈائرکٹر تھے۔ ڈائرکٹر تھے۔ لیکن ان سب کو پھاند کر وہ صاحب وزیرِ مہاجرین سے ملنے کے لئے سیدھے مرکز میں آئے۔ گویا ان کے نزدیک یہی "شارٹ کٹ" تھا۔ اب آپ ہی فرمائیے کہ یہ پریشانی اپنی پیدا کی ہوئی ہے یا نہیں۔ آزادی کے اس دور میں کھلی چٹھی لکھنے کی آپ کو کھلی چھٹی ہے لیکن اس قسم کی کھلی چٹھیوں سے تو معاملہ نہیں سلجھ سکتا۔ سلجھاؤ کی صورت تو وہی ہے جو میں عرض کر چکا ہوں۔

خیر یہ تو ذاتی کوشش کی ایک مثال تھی۔ جمہوریت کے اس دور کی ایک نئی پیداوار "سلسلۂ وفود" ہے چند آدمی ایک وفد کی شکل میں سندھ کے ایک دُور افتادہ مقام سے آتے ہیں۔ اور چاہتے ہیں کہ اپنی شکایات براہِ راست وزیرِ مہاجرین کی خدمت میں پیش کریں۔ گھر سے چلتے وقت پہلے ان کا فرض تھا کہ یہ پہلے ملاقات کا مقصد لکھتے اور اس کے لئے وقت لیتے اور پھر مرکز میں پہنچتے۔ اب یہ حضرات ایک مراسلہ لے کر آتے ہیں۔ جس میں لکھا ہے کہ ہم چار دن سے کراچی میں ہیں لیکن وزیرِ مہاجرین سے ملاقات اب تک نہ ہو سکی۔ ظاہر ہے کہ اس مراسلہ کی اشاعت بے سود ہے۔ بجائے "مراسلہ نگاری" کے انہیں صحیح طریقہ اختیار کرنا چاہیئے تھا۔ اب جو شکایات انہوں نے مجھے سُنائیں تو میں نے اُن سے کہا کہ آپ کو اس سلسلہ میں ڈپٹی کلکٹر ہی سے مل لینا چاہیئے تھا۔ یہ درست ہے کہ آپ پریشان ہیں۔ لیکن اس طرح تو آپ نے اپنی پریشانی میں اور اضافہ کر لیا۔

اب اور سُنیئے۔ ایک مراسلہ میں شکایت کی گئی ہے کہ ایک کنوئیں کا پانی جہاں مہاجر آباد تھے انصار نے خراب کر دیا ہے۔ جب تحقیق کی گئی تو معلوم ہوا کہ کنواں گرمی کی وجہ سے سوکھ گیا تھا اور اس کا پانی گدلا ہو گیا تھا۔ ایک نہیں بیسیوں مراسلات آئے دن موصول ہوتے رہتے ہیں۔ اور بعض اوقات تو انہیں پڑھ کر ہماری پریشانیوں میں اضافہ ہوتا ہے لیکن صاحب کیا کیجیئے ایک اخبار نویس کی حیثیت سے ہمارا فرض ہے کہ ہم ہر مراسلہ کو چاہے وہ چھ سطروں کا ہو یا پورے پانچ کالم کا پڑھیں لیکن وُہ مراسلات جو قابلِ اشاعت نہیں ہوتے جب نہیں چھپتے تو اس سے "مراسلہ نگاروں" کی پریشانیوں میں اضافہ ہوتا ہے لیکن آپ ہی اس کا کوئی علاج بتائیے کہ ہم کیا کریں؟

آخر میں اخبار "عزیز ہند" جھانسی کے ایڈیٹر مہاجر محمد رفیق صاحب سے ان کے خیالات سُنیئے۔

سرکاری ملازم

سرکاری ملازمت پیشہ طبقے کو زبان کھولنے کی اجازت نہیں ہے۔ دفتری کارروائی یہ جو چاہیں کریں لیکن ان کی زبان بندی کا حکم انہیں پبلک کے سامنے بولنے کی اجازت نہیں دیتا۔ اس لئے آج ان بے زبانوں کی طرف سے کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔

آزادی ملنے سے پہلے ہم پر ایک غیر قوم کی حکومت تھی، اور حکام خواہ وہ دیسی ہوں یا بدیشی خواہ مخواہ ان کی حرکتوں سے ہمیں شبہ ہوتا تھا۔ گویا یہ حکم ہمارے فائدے کے لئے نہیں بلکہ ہمیں تکلیف پہنچانے کے لئے لگائے گئے ہیں اسی لئے ان احکام کو توڑنے سے لطف آتا تھا۔

اب حکومت ہماری اپنی حکومت ہے۔ اس لئے حکومت اور حکومت کے افسران کے متعلق ہمارے دل میں اس قسم کے خیال نہیں آنے چاہئیں۔ ابھی چند روز ہوئے کہ میں ایک سرکاری محکمہ کے دفتر استقبالیہ میں بیٹھا تھا۔ چند لوگ آئے اور انہوں نے کہا کہ ہمیں کراچی میں مکان نہیں ملتا اس لئے ہم وزیر مہاجرین سے ملنا چاہتے ہیں۔ دفتر استقبالیہ کے نمائندے نے کہا کہ اس قسم کی باتوں کا تعلق وزیر صاحب سے نہیں ہے۔ آپ رینٹ کنٹرولر یا ایڈمنسٹریٹر سے ملئے۔ یہ سُن کر سائل صاحب ناراض ہو گئے اور فرمایا کہ یہ کیا اندھیر ہے آپ مجھے وزیر صاحب سے ملنے کا موقعہ نہیں دیتے۔ جب انہیں سمجھایا تو اور برہم ہوئے اور کہا کہ اچھا ہم اس کی شکایت وزیر اعظم اور گورنر جنرل سے کریں گے۔ اس قسم کی عام شکائتیں ہم روز سنتے ہیں۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ افسر ہم سے خندہ پیشانی سے نہیں ملتے۔ میرے خیال میں دن بھر خندہ پیشانی سے ملتے رہنا کوئی ہنسی کھیل نہیں ہے اور خاص طور سے ایسی حالت میں جب کہ ملنے والے بے چارے افسر سے ایسی باتیں کرانی چاہتے ہوں جو یہ نہیں کر سکتا۔ ہر شخص اپنے کام کو اتنا ضروری اور اہم سمجھتا ہے کہ دوسرے کے نقطہ نظر کو سننے کے لئے تیار ہی نہیں ہوتا۔ اس قسم کی خودغرضی انسان کو اندھا بنا دیتی ہے۔ اس سے آدمی کو خود بھی تکلیف ہوتی ہے اور دوسرے کو بھی اس سے نقصان پہنچتا ہے۔

ایک عام عادت میں نے اور دیکھی کہ اگر کسی افسر نے ہمارا کام ہماری مرضی اور خواہش کے مطابق نہیں کیا۔ تو فوراً کمرہ سے نکلتے ہی سب سے پہلے اس پر تعصب، کنبہ پروری، اقربا نوازی اور رشوت کا الزام لگا دیتے ہیں۔ اپنی حکومت کے خادموں کو اس طرح ہدف ملامت بنانا حب الوطنی کے بالکل خلاف ہے ہمیں محکمے اور افسروں کے نقطہ نظر کو بھی سمجھنے کی کوشش کرنی چاہئے میں یہ نہیں کہتا ان میں کوئی بُرا نہیں اچھے اور بُرے دونوں ہیں لیکن جب تک پبلک اپنا اخلاقی معیار بلند نہیں کرے گی پبلک کو حکومت سے برابر اسی طرح شکایت رہے گی۔

رشوت دینے والا اور رشوت لینے والا دونوں قابلِ سزا ہیں۔ مگر ہم یہ تو چاہتے ہیں کہ رشوت لینے والوں کو سزا ملے اور جب رشوت دینے والوں کو سزا دینے کا سوال پیدا ہوتا ہے تو سب خاموش ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح یہ خیال کرنا کہ ہمارے اخلاق کو پولیس درست کرے گی سخت غلطی ہے۔ پولیس کی مدد کرنا ہمارا فرض ہے۔ لیکن یہ تصوّر کر لینا کہ سب برائیاں پولیس کے رُعب سے خود بخود دُور ہو جائیں گی درست نہیں۔

قائدِ اعظم کے متعلق ایک واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ طالب علمی کے زمانے میں یہ ریل کا سفر کر رہے تھے۔ اسٹیشن پر اترے تو ان کا ٹکٹ ان کے ملازم کے پاس تھا۔ اور ملازم پچھلے اسٹیشن پر رہ گیا تھا۔ ٹکٹ کلکٹر نے کہا کچھ مضائقہ نہیں دو چار روپے میں یہ کام ہو جائے گا۔ اس پر قائدِ اعظم بہت ناراض ہوئے کہ ٹکٹ کلکٹر نے میری توہین کی ہے۔ انہوں نے ٹکٹ کی قیمت ادا کر کے رسید لی اور ٹکٹ کلکٹر کی شکایت کر کے اسے سزا دلائی۔ اگر ہمیں بھی اپنی عزتِ نفس کا ایسا ہی پاس ہو تو سب برائیاں دُور ہو سکتی ہیں ؎

آباد کاری کا بین الاقوامی ادارہ

مئی ۱۹۴۵ء میں جب چھ سال کی عالمگیر خونریزیوں کے بعد جنگ ختم ہوئی ہے۔ تو یورپ میں عجب افراتفری مچی ہوئی تھی۔ فتح مند اتحادیوں کے سامنے اس وقت صرف شکست خوردہ جرمن فوجوں سے ہتھیار رکھوانے کا ہی سوال نہیں تھا بلکہ ایک ضروری مسئلہ اُن بے گھر اور خانماں برباد لوگوں کا بھی تھا کہ جنہیں ہٹلر نے غلام بنا کر جرمنی میں بیگار کے لئے قید کر رکھا تھا۔ جنگ کے چھ سالوں میں لاکھوں انسان جنگ کی تباہ کاریوں کا شکار بن کر اپنا وطن چھوڑنے پر مجبور ہوئے تھے۔ چنانچہ ۱۹۴۵ء میں جنگ کے خاتمے پر ان کی تعداد ۸۰ لاکھ سے اوپر تھی۔ ان میں سے ۷۰ لاکھ تو فوراً اپنے وطن کو واپس چلے گئے لیکن باقی کئے دس لاکھ ایسے تھے جن کا اب کوئی وطن نہیں رہا تھا۔ اور مجبوراً انہیں جرمنی کے کھنڈروں میں زندگی بسر کرنی پڑی۔ یہ دس لاکھ وہ بدقسمت لوگ تھے جو کسی سیاسی وجہ سے اپنے وطن جانا پسند نہیں کرتے تھے۔ ان میں زیادہ تر پولینڈ، یوکرین، بحیرہ بالٹک کی ریاستوں اور رومانیہ کے رہنے والے ہیں۔ اور ایک چوتھائی تعداد ان میں سے یہودی نسل لوگوں کی ہے۔ کچھ ان میں سے بیگار اٹھانے کے لئے جرمنی میں ہٹلر کے حکم سے آئے تھے۔ اور کچھ وُہ بدنصیب تھے جنہیں ہٹلر نے بندی خانوں میں قید کر رکھا تھا۔

جنگ ختم ہونے کے چار سال بعد آج ایسے بے وطن پناہ گیروں کی بہت بڑی تعداد اقوامِ متحدہ کی نگرانی میں زندگی بسر کر رہی ہے۔ اقوامِ متحدہ کے اس ادارے کا نام انٹرنیشنل ریفیوجی آرگنائزیشن ہے۔ جسے مخفف کر کے آئی۔آر۔او بھی کہتے ہیں۔ آئی۔آر۔او نے یورپ میں جگہ جگہ بے وطن پناہ گیروں کے لئے کیمپ بنائے ہیں۔ جن میں ۵ لاکھ ۹۸ ہزار انسان رہتے ہیں۔ اور تقریباً ساڑھے تین لاکھ اب تک جرمن شہروں کے کھنڈروں میں مارے مارے پھرتے ہیں۔ ان کی گذر اوقات کا کیا بندوبست ہے۔ یہ بتانا مشکل ہے۔ محنت مزدوری کر کے یا کوئی اور کام کر کے یہ اپنی روزی کماتے ہیں۔ گویا دس لاکھ تباہ حال پناہ گیروں کی نگہداشت آئی۔آر۔او کا فرض ہے۔ ان کے علاوہ ۵ لاکھ کے قریب اور بے وطن تمام یورپ

میں بکھرے ہوئے ہیں۔ یہ وُہ لوگ ہیں جو گذشتہ جنگ سے بھی پہلے سیاسی وجوہ کی بناء پر اپنا وطن چھوڑنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ ان میں آپ کو آرمینیا، سفید رُوس اور جرمنی کے یہودی النسل باشندے اور اسپین کے سیاسی پناہ گیر ملیں گے۔ اگرچہ ایسے بے وطن لوگوں کو آوارہ وطن بنے ایک عرصہ گزر گیا مگر ابھی تک انہیں کہیں سر چھپانے کا ٹھکانہ نہیں مل سکا۔ اقوامِ متحدہ کی ذمے داری ایسے لوگوں کی مدد ہے۔

پاکستان میں ہمیں مہاجرین کے مسئلے کا تجربہ ہے۔ اور ہم جانتے ہیں کہ وطن چھوڑنے کے بعد انسان کو کس قدر مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مگر ہمارا مسئلہ یورپ کے مسئلے سے کہیں بڑا تھا۔ ہمیں تنہا ۷۰ لاکھ مہاجرین کو آباد کرنا تھا۔ یورپ میں سب ملا کر مشکل سے دس لاکھ بے وطن پناہ گیر ملیں گے۔ اور وُہ بھی ایک قوم کے نہیں بلکہ چالیس مختلف قوموں کے۔ پھر یورپ کے بے وطن پناہ گیروں کو بسانے کے لئے اقوامِ متحدہ کا ادارہ کام کر رہا ہے۔ گویا دنیا کی سب طاقتیں مل کر ان کی امداد پر آمادہ ہیں۔ ہمارے مہاجروں کی مدد تنہا پاکستان کو کرنی پڑی۔ اور وُہ بھی اس وقت جب کہ پاکستان کو وجود میں آئے مشکل سے چند ہفتے بھی نہیں ہوئے تھے۔ اس لئے ہمیں یورپ کے اس مسئلے کا حل تلاش کرنے والوں کے کام سے قدرتی طور پر دلچسپی ہے۔

بے وطن کیسے رہتے ہیں

بے وطن لوگوں کی زیادہ تعداد جرمنی، آسٹریا اور اٹلی کے ملکوں میں کیمپوں میں رہتی ہے۔ ان کا انتظام آئی آر او کے ہاتھ میں ہے۔ کیمپوں میں کھانے پینے کا بندوبست صفائی ستھرائی کے لحاظ سے اچھا خاصہ ہے چنانچہ جو لوگ ان کیمپوں میں رہتے ہیں۔ انہیں اگرچہ یہ شکایت ضرور ہے کہ وہاں ہجوم بہت ہے لیکن ان کی صحت پر اس سے برا اثر نہیں پڑتا۔ مگر کیمپ میں تمام عمر رہنا کون پسند کرے گا۔ چنانچہ جونہی کسی کو کہیں اور سر چھپانے کا موقعہ ملتا ہے فوراً کیمپ چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔

کیمپوں میں کام کرنے والے خود بھی بے وطن ہیں۔ اس لئے انہیں کیمپ میں رہنے والوں سے قدرتی طور پر ہمدردی ہوتی ہے۔ کیمپوں میں ہر جگہ انتظامی کمیٹیاں بنائی گئی ہیں جن کے ممبروں کا انتخاب ہوتا ہے۔ یہ کمیٹیاں خوراک تقسیم کرتی ہیں۔ کیمپوں میں پولیس مقرر کرتی ہیں۔ اسکول چلاتی ہیں۔ اور کیمپ میں رہنے والوں کو دستکاریاں سکھاتی ہیں۔ پاکستان کے کیمپوں کی طرح یورپ کے کیمپ بھی رہنے کے معمولی مکان سے لے کر بڑے بڑے فوجی کیمپوں جتنے وسیع ہیں۔ بڑے کیمپوں میں سے چند کیمپ اتنے بڑے ہیں کہ ان میں دس دس ہزار آدمی رہتے ہیں۔ انہیں گویا ہمارے والٹن کیمپ کے مقابلے پر سمجھئے۔ بعض دفعہ ہمارے مہاجرین کی طرح یورپ کے بے وطن خاندانوں کو بھی ایک ایک کمرے میں چھ یا سات آدمیوں کے ساتھ مل کر رہنا

پڑتا ہے۔ یا بعض دفعہ بڑی بارک کو پردے ڈال کر چھوٹے چھوٹے حصّوں میں بانٹ دیتے ہیں۔

خوش قسمتی سے یورپ میں ڈاکٹروں اور نرسوں کی کمی نہیں۔ چنانچہ ۲½ ہزار بے وطن ڈاکٹر اور ۲ ہزار بے وطن نرسیں کیمپوں میں خدمت کے لئے حاضر ہیں۔ اور ان کے سر پر اقوامِ متحدہ کی طرف سے بڑے بڑے ڈاکٹر مقرر ہیں کیمپوں میں چیچک میعادی بخار اور دوسری بیماریوں سے بچنے کے لئے سب کو ٹیکے لگائے جاتے ہیں۔ شیر خوار اور کمزور بچوں کے لئے علیحدہ مرکز ہیں۔ حاملہ عورتوں کی نگرانی کا انتظام بھی ہے اور تپ دق اور سِل کے مریضوں کے لئے خصوصیت سے بہت عمدہ انتظام ہے۔ اس کے علاوہ کیمپوں میں بیماروں کمزور بچوں اور حاملہ عورتوں کو کھانا بھی اچھی قسم کا ملتا ہے۔

روزی کمانے کے ذریعے

اندازہ لگایا گیا ہے کہ اس قسم کے بے وطن لوگوں کو ڈیڑھ لاکھ کے قریب روزی کمانے کے موقعے ملے ہیں۔ ان میں زیادہ تر کیمپوں میں کام کرنے والے لوگ ہیں۔ بہت سے بے وطن پناہ گیر شکست خوردہ ملکوں میں فاتح فوجوں کے ہمراہ کام کرتے ہیں۔ ایک دلچسپ بات یہ دیکھنے میں آئی ہے کہ چونکہ بہت سے لوگوں نے جنگ کے دوران میں جرمنوں کے ہاتھوں تکلیفیں اٹھائی تھیں اس لئے یہ لوگ اب خوشی سے کسی جرمن کے ساتھ کام کرنے کو تیار نہیں ہوتے۔ اس وقت یورپ کے اکثر ملکوں میں خود بے روزگاری پھیلی ہوئی ہے۔ اس لئے یہ ملک بے وطن لوگوں کے لئے روزی کمانے کے ذریعے آسانی سے مہیا نہیں کر سکتے۔

بے وطنوں کی آبادکاری تین طریقے سے ہو سکتی ہے:۔

۱۔ یہ اپنے پرانے وطن واپس چلے جائیں۔

۲۔ جس ملک میں یہ موجود ہیں وہیں انہیں آباد کر دیا جائے لیکن اس وقت جرمنی۔ آسٹریا اور اٹلی کے حالات اس قدر خراب ہیں کہ وہاں رہنا آسان نہیں۔

۳۔ یہ دوسرے ملکوں میں آباد ہونے کے لئے چلے جائیں۔

آئی۔ آر۔ او کی رپورٹ سے معلوم ہوا ہے کہ ۴۸-۱۹۴۷ء میں ۲ لاکھ ۴ ہزار بے وطنوں کو آباد کیا گیا تھا۔ ان میں سے ۶۹ ہزار کے قریب انگلستان آ گئے تھے۔ ۲۵ ہزار کینیڈا گئے تھے۔ ۱۹ ہزار کو بلجیم نے قبول کیا تھا۔ ۱۶ ہزار امریکہ، ۱۶ ہزار فرانس اور ۱۲ ہزار کے قریب ارجنٹینا بھیجے گئے تھے۔ اس سال امید ہے کہ ۴ لاکھ کے قریب اور بے وطنوں کو پناہ مل جائے گی۔ ۲۴ ہزار انسانوں کو مختلف انجمنوں اور ہمدردوں نے پناہ دلوائی تھی۔

لیکن ابھی اقوامِ متحدہ کے سامنے کئی ہزار بے وطن پناہ گیروں کو آباد کرنے کا سوال باقی ہے کچھ ملک صرف محنت کرنے والے نوجوانوں کو قبول کرنے کے لئے تیار ہیں۔ ان کے بڈھے ماں باپ یا بیوی بچوں کو لینے کے لئے رضامند نہیں۔ آئی۔ آر۔ او بار بار ایسے ملکوں سے اپیل کر رہا ہے کہ انہیں اس معاملے پر اور ہمدردی سے غور کرنا چاہیئے۔ کیونکہ ایسی مصیبت کے وقت خاندانوں کا شیرازہ بکھیرنا انسانیت کے اصول کے خلاف ہے۔

جو پناہ گیر اپنے وطن واپس جانا چاہتے ہیں۔ انہیں وہاں جا کر آباد ہونے کا سب سے پہلے موقعہ دیا جاتا ہے۔ اقوامِ متحدہ کے دفتر سے ایسے لوگوں کو ان کے قدیم وطن کے متعلق معلومات فراہم کی جاتی ہیں۔ اور ان کے اصلی وطن سے لوگ آ آ کر انہیں وہاں کا حال سناتے ہیں تاکہ یہ اپنے وطن کی محبت سے مجبور ہو کر واپس چلے جائیں۔ وطن جانے والوں کو ۶۰ روز کی خوراک، سفر خرچ اور سہولتیں دی جاتی ہیں۔ چنانچہ پچھلے سال ۵۷ ہزار پناہ گیر واپس اپنے وطن چلے گئے۔

جو لوگ وطن جانا نہیں چاہتے ان کو آباد کرنے کے لئے آئی۔ آر۔ او کو دوسرے ملکوں کے دروازے کھٹکھٹانے پڑتے ہیں۔ اور ایسے لوگوں کو ایک ملک سے دوسرے ملک لے جانے کے لئے اسپیشل ٹرینیں۔ جہاز۔ ہوائی جہاز اور قافلے روانہ کئے جاتے ہیں جب کوئی ملک ایسے بے وطنوں کو اپنے ہاں جگہ دینے کی حامی بھرتا ہے۔ تو سب سے پہلے اس ملک کے کچھ نمائندے جا کر اپنے مطلب کے لوگ چنتے ہیں۔ مثلاً اگر اس ملک کو زراعت کرنے والوں کی ضرورت ہے تو زراعت پیشہ لوگ چنے جاتے ہیں۔ اگر انجینیروں اور ڈاکٹروں کی ضرورت ہے تو انجینیروں اور ڈاکٹروں کو تلاش کیا جاتا ہے۔ پھر ان کو قافلوں کی شکل میں نئے وطن بھیج دیا جاتا ہے۔

ان پناہ گیروں میں ایک تہائی مرد کاریگر ہیں۔ اور ایک چوتھائی زراعت پیشہ ہیں۔ کاریگروں میں ایسے مشّاق کاریگر بھی ہیں جو ہوائی جہاز تک بنا سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ درزی جفت ساز۔ لوہار۔ بڑھئی اور موٹروں کے مستری سبھی قسم کے کاریگر ملیں گے۔ اور کاریگر بھی ایسے جو اپنے کام میں بہت ہوشیار ہیں۔ بے وطن عورتوں میں سے ایسی عورتیں جو محنت کر سکتی ہیں ان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ان میں سے ۹۱ فی صدی عورتیں کاریگر اور دستکار ہیں۔ بہت سی عورتیں ایسی ہیں جو اپنے مردوں کا ہاتھ زراعت میں بٹا سکتی ہیں۔ بہت سی نرسیں اور استانیاں ہیں۔ اور ساڑھے بارہ ہزار کے قریب درزی کا کام جانتی ہیں۔ تمام کیمپوں میں جا بجا ایسے مرکز کھولے گئے ہیں جہاں پناہ گیروں کو دستکاریاں سکھائی جاتی ہیں۔ ایسی دستکاریاں یہ چھ مہینے سے لے کر ۹ مہینے تک کے عرصے میں سیکھ جاتے ہیں۔ ایک مشکل یہ بھی ہے کہ بے وطنوں کو نئے وطن جانے سے پہلے وہاں کی نئی زبان

بھی سیکھنی پڑتی ہے۔ بعض پیشے ایسے ہیں کہ ان میں بغیر زبان سیکھے کام نہیں چل سکتا مثلاً وکیل اور ڈاکٹر کہ ان کا کام زبان سے ہی نکلتا ہے۔ آئی۔آر۔او اس قسم کے لوگوں کی مدد کا خاص طور سے کام کرتی ہے۔ اور جب تک یہ نئے وطن میں نہیں جاتے انہیں اپنے کام میں مہارت حاصل کرنے کا موقعہ بھی دیا جاتا ہے۔

بے وطنوں کو ایک ملک سے دوسرے ملک تک لے جانے کے لئے آئی۔آر۔او نے ۳۰ جہاز حاصل کئے ہیں۔ یہ جہاز ساڑھے پانسو سے لے کر ۱۴سو مسافر تک لے جا سکتے ہیں۔ دنیا میں غالباً یہ جہازی قافلے اپنی قسم کے نرالے قافلے ہیں۔

اقوامِ متحدہ کے بنائے ہوئے قانون کے مطابق آئی۔آر۔او سے پاکستان کے مہاجر فائدہ نہیں اُٹھا سکتے کیونکہ یہ انجمن صرف ان لوگوں کے لئے ہے کہ جنہیں گذشتہ جنگ کی وجہ سے اپنا وطن ترک کرنا پڑا تھا۔ اقوامِ متحدہ نے اس ادارے کی بُنیاد ۱۵ ستمبر ۱۹۴۶ء کو رکھی تھی۔ اس کا صدر مقام جنیوا میں ہے اس کے دفتر میں ایک ہزار ۸۹۷ افسر کام کرتے ہیں۔ جن کا تعلق دنیا کی ۳۸ مختلف قوموں سے ہے۔ اس کے علاوہ ۲ ہزار ۳۹۲ اور ملازم اس انجمن کی خدمت کرتے ہیں۔ اور دنیا کی ۱۶ قوموں کی حکومتیں اس کی مدد کرتی ہیں۔

آئی۔آر۔او کے کاموں میں ایک ضروری کام ایسے لوگوں کا پتہ لگانا بھی ہے جو گذشتہ جنگ میں لاپتہ ہو گئے تھے اور یہ ایک دو ہزار نہیں بلکہ لاکھوں انسان ہیں۔ ۹ مہینے کے اندر اس ادارے کے پاس ۵۰ ہزار لاپتہ لوگوں کے متعلق خط آئے تھے۔ جن میں سے ساڑھے ۳۲ ہزار کا اس نے پتہ دریافت کر لیا۔ اور انہیں اپنے رشتے داروں سے ملا دیا۔ یہ وُہ لوگ تھے جو گذشتہ جنگ کے دوران میں اپنے عزیزوں سے بچھڑ گئے تھے۔ اور اب تک ان کا پتہ نہیں ملا تھا۔

غرض اقوامِ متحدہ جہاں دنیا کی سیاسی گتھیاں سلجھانے کی کوشش میں مصروف ہے۔ اس کا یہ ادارہ انسانی زندگی کے ایک ضروری حصے کی مشکلیں دُور کر رہا ہے۔ جنگ ختم ہو گئی مگر اس کی پیدا کی ہوئی مصیبتیں ابھی تک دنیا پر چھائی ہوئی ہیں۔ اس کا حل تلاش کرنے میں پاکستان کو خاص طور سے دلچسپی ہے۔ کیونکہ ہم بھی اپنی جگہ اس مسئلے کو حل کر رہے ہیں۔ اور ہمیں یہ دیکھ کر اطمینان ہوتا ہے کہ دنیا کی بڑی بڑی قومیں مل کر جس گتھی کو سلجھا رہی ہیں اُس سے کہیں بڑی گتھی کو پاکستان تنہا سلجھا رہا ہے۔ اور اس میں ہمیں کامیابی ہوتی ہے ؎

دین محمدی پریس کراچی